میخائل شولوخوف

دل کے کہنے پر



”میں اس حقیقت‌پسندی کا ذکر کر رہا ہوں جس میں زندگی کو نیا کرنے اور اس کو انسان کے فائدے کے لئے از سر نو منظم کرنا مضمر ہوا کرتا ہے۔ میں یقیناً اس چیز کا تذکرہ کر رہا ہوں جسے ہم سوشلسٹ حقیقت‌پسندی کہتے ہیں۔ اس میں انوکھاپن یہ ہے کہ یہ ایک ایسے عالمی نقطۂنظر کا اظہار کرتی ہے جو نہ تو گیان دھیان پر ایمان رکھتا ہے، نہ حقیقت سے فرار پر بلکہ جو لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نوع انسانی کی ترقی کے لئے جدوجہد کریں، انہیں ان مقاصد کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جن کی کروڑوں لوگ حمایت کرتے ہیں اور جو ان کےلئے اس جدوجہد کی راہیں روشن کرتا ہے۔“

میخائل شولوخوف

”آرٹ میں لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ فنکار کہلانے کا حق ان مصنفوں کو پہنچتا ہے جو اس تاثر کو نوع انسانی کی بھلائی کے لئے، اور لوگوں کی روح میں حسن کی ایک دنیا تخلیق کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔“

میخائل شولوخوف

میخائل شولوخوف

دل کے کہنے پر

انشائیے، خاکے اور تقریریں

دارالاشاعت ترقی
ماسکو

فہرست

ترجمہ : امیر اللہخاں
ڈیزائن : س۔ دانیلوف

М. Шолохов
ПО ВЕЛЕНИЮ ДУШИ
На языке урду
Составление и предисловие Ю. Лукина

سوویت یونین میں شائع شدہ

Ш $\frac{70202-868}{014(01)-76}$ 624—76

تیسرا حصہ - نوجوان

زندگی — ادیب — نوجوان

زیر نظر کتاب میں شامل کی جانےوالی تصویروں میں سے ایک میں میخائل شولوخوف اپنی میز کے آگے بیٹھے خطوط دیکھ رہے ھیں۔ دراصل دن کا ایک بڑا حصہ اسی میں صرف ھوتا ھے۔ سوویت یونین کے گوشے گوشے سے دریائے ڈان کے ساحل پر واقع گاؤں ویشنسکایا میں، جہاں موصوف رہتے ھیں، ڈاک کے تھیلے بھر بھر آتے ھیں۔ لوگ ان سے مشورہ طلب کرتے ھیں یا خاص ذاتی معاملات سے لیکر ریاستی اھمیت کے مسئلوں تک پر صلاح لیتے ھیں۔ بہت سے اپنے دلی جذبات ان کے گوشگزار کرنا چاھتے ھیں اور اپنے متعلق انہیں اس طرح بتاتے ھیں جیسے کوئی اپنے دانشمند، بزرگ دوست کو بتاتا ھے۔ نوجوان انہیں خط لکھتے ھیں اور نئے نئے ادیب بھی۔

شولوخوف کے بیشتر خطوط خالص کاروباری وضع کے ھوتے ھیں۔ ڈاک سے ان کے ابتدائی افسانوں کے مجموعے کے پروف آتے ھیں، کوئی فلم اسٹوڈیو ان سے کسی نئی فلم کی، جو ان کے کسی افسانے پر مبنی ھوئی ھے، ویشنسکایا میں نمائش کی تاریخ مقرر کرانا چاھتا ھے، کوئی تھیٹر ان کے ناول کو ڈرامے کا روپ دیکر اسٹیج پر پیش کرنے کے سلسلے میں مشورہ طلب کرتا ھے۔

غیر ممالک کے ناشرین اور تنظیموں کے خطوط اور تار آتے ھیں جن میں ان سے دریافت کیا جاتا ھے کہ وہ غیرممالک کے سفر پر تو روانہ نہیں ھونےوالے جو تہذیبی تبادلے میں اور قوموں کے درمیان باھمی مفاھمت کو بہتر کرنے میں نہایت ھی نتیجہ خیز ثابت ھوتے ھیں۔

بین الاقوامی منظر

ٹوکیو ھم بہت دور پیچھے چھوڑ آئے تھے، اور تڑختی ھوئی دھوپ میں بذریعہ کار ھم نکو کے کوھستانی علاقے کی طرف چلے جا رہے تھے۔ ابھی کئی میل اور جانا تھا اور پیاس بری طرح لگی تھی۔

کہ شولوخوف کے آٹوگراف حاصل کرنے کے لئے مندر کے دروازے پر انتظار کیا جائے۔ پانچ گھنٹے انتظار کرنے کے بعد آخر وہ ناامید سی ہونے لگی۔ پھر بھی وہ وھیں جمی رھی۔ صبر کا پھل ملا۔ اور پھر اسے کچھ گھبراھٹ سی ہوئی کہ اخباروں کے رپورٹر اس سے بھی انٹرویو لے رھے تھے اور شولوخوف کے ساتھ اس کی تصویریں کھینچی جا رھی تھیں۔ یہ تصویریں بہت سے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوئیں اور ان میں سے ایک میں وہ شولوخوف کے آٹوگراف حاصل کر رھی ھے جس کے لئے اس نے اتنا انتظار کیا تھا۔

اس موقع پر دوسرے اور بہت سے موقعوں کی طرح ان ترجمانوں کے بغیر جو ھمارے ساتھ تھے، کام نہیں چل سکتا تھا۔ نوجوان لیکن شولوخوف کی تصانیف کے ترجموں کے باعث مشہورومعروف یہ لوگ سیاحوں کے معمولی گائڈ نہیں تھے۔ ان میں سے توکویا ھارا اور تاکو ایگاوا اپنے والد کے نقش قدم پر چل رھے ھیں جنھوں نے جاپان میں ''اور ڈان بہتا رھا...،، کا پہلا ترجمہ کیا تھا۔ برسبیل تذکرہ یہ بھی بتاتا چلوں کہ ایگاوا کے والد تیتسویا بابا نے ''اور ڈان بہتا رھا...،، کا غیرملکی زبان میں سب سے پہلا ترجمہ کیا تھا۔ کتابی شکل میں ناول شائع ہونے سے پہلے رسالے میں اس کے جو باب شائع ہوئے ان کا وہ ترجمہ کرتے گئے۔

* * *

۱۹۶۵ء کا موسم سرما۔ سردی سخت نہیں ھے۔ اس خلیج سے جس کے ساحل پر شاھی محل بنا ھوا ھے راج ھنس جنوب کی طرف ھجرت نہیں کرتے، ان کی غذا کا انتظام یہیں ھو جاتا ھے اور یہ ھر جہاز کا خیرمقدم کرنے اور خیر باد کہنے موجود ھوتے ھیں۔

اس بار انہوں نے جس جہاز کا خیرمقدم کیا وہ ''سویا یارل،، تھا جو فنستانی شہر تورکو سے ادب کا نوبل انعام پانےوالے میخائل شولوخوف کو اسٹاک ھام لیکر آیا تھا۔

دسمبر کا وہ ھفتہ اب تاثر اور یادوں کی ایک سیربین ھے — کنسرٹ ھال اور ٹاؤن ھال میں منعقد ھونےوالی روائتی تقریبوں کی، رسمی استقبالیوں اور اس سے بےتکلف اجتماعات کی، پرشور پریس کانفرنسوں اور دوستانہ، پرتپاک بات چیت کی۔

ایک چھوٹے سے قصبے کے بڑے بازار کے چوک سے گذرے تو دیکھا تحفے تحائف کے سامان کی چھوٹی چھوٹی دکانوں کی ایک قطار چلی گئی ہے۔ وھیں سگریٹ بھی مل رھے تھے اور ٹھنڈا شربت بھی۔ ھم نے فیصلہ کیا کہ چند منٹ یہاں قیام کیا جائے۔

ان چھوٹی چھوٹی دکانوں میں مقامی جاپانی دستکاروں کی بنائی ھوئی چیزیں فروخت ھو رھی تھیں۔ ابھی ھم ایک دکان پر کھڑے سوچ ھی رھے تھے کہ اس گمنام شہر کی یادگار کےلئے جہاں ھمیں محض اتفاقاً رکنا پڑا تھا، کونسی چیز خریدی جائے نوجوان دکان کرمچاری لڑکی نے ترجمان سے پوچھا کہ ھم لوگ کس ملک سے آئے ھیں۔ جب پتہ چلا کہ ھم سوویت یونین سے آئے ھیں تو اس نے پھر پوچھا کہ کیا مصنف شولوخوف بھی ھمارے ساتھ ھیں۔ اخباروں میں خبر آئی تھی کہ وہ جاپان کے سیر و سفر پر گئے ھوئے ھیں۔ شولوخوف کہاں ھیں، ان سے ملاقات کیسے ھو سکتی ھے؟ جب ترجمان نے بتایا کہ یہ رھے شولوخوف تو ساری دکانوں میں جیسے ایک بھونچال آ گیا۔ تھوڑی دیر کےلئے لڑکیاں کہیں غائب ھو گئیں لیکن ذرا کی ذرا میں پھر آ گئیں، ھاتھوں میں شولوخوف کی تخلیقات کی خوبصورت جلدیں اور آٹوگراف کی نوٹ بکیں تھیں۔ شولوخوف لینے تو آئے تھے سگریٹ لیکن اب دوست مگر پرعزم مداحوں کے نرغے میں تھے جن سے فرصت اس وقت ھی حاصل ھوئی جب آٹوگراف دینے کی ایک مختصر نشست ختم ھو گئی۔

یہاں زور دیکر یہ بات واضح کر دینی ضروری ھے کہ اس چھوٹے سے قصبے میں ھمارے قیام کا پہلے سے کوئی بندوبست نہیں تھا، ھمیں سخت گرمی کی وجہ سے پیاس لگی اور اس لئے وھاں رک گئے۔ اس کا پہلے سے کسی کو بھی اندازہ نہیں ھو سکتا تھا، نہ ھی ھمارے لئے کسی کے لئے کوئی تیاری کرنا ممکن تھا۔ نوجوان جاپانی قارئین سے یہ ملاقات بغیر کسی تیاری کے قطعی اتفاقی ھوئی تھی۔

خود نکو میں ھمیں صبرواستقلال کے ایک چھوٹے سے کارنامے سے سابقہ پڑا۔ شولوخوف کی ایک مداح طالبہ نے اخبارات میں پڑھا کہ وہ جاپانی ادیبوں کی انجمن کی دعوت پر جاپان آ رھے ھیں۔ جس راستے سے وہ گزرنےوالے تھے وہ اندازاً واضح کر دیا گیا تھا اور نکو اس میں شامل تھا۔ اسے معلوم تھا کہ نکو کا قدیم مندر ایک ایسی جگہ ھے جسے غیرملکی سیاح ضرور دیکھنے جاتے ھیں، اس لئے اس نے فیصلہ کیا

گیروف نے اپنے زور بیان میں اس غلطی سے بڑی چابکدستی سے استفادہ کیا تھا۔

ڈاکٹر گیرف نے اس طرح آغاز کیا: ''جناب شولوخوف، جس روز آپ کو نوبل انعام ملا تو اس روز آپ یورال میں شکار کھیل رہے تھے اور، ماسکو کے ایک اخبار کی اطلاع کے مطابق، اسی روز آپ نے ایک (!) گولی سے دو مرغابیاں شکار کی تھیں... لیکن اگر آج ہم سال گذشتہ کے نوبل انعام‌یافتگان میں اچھے نشانہ باز کی حیثیت سے آپ کے سامنے سرتسلیم خم کرتے ھیں تو اس کی وجہ یہ ھے کہ نشانے‌بازی کے ایسے کارناموں کا پرتو آپ کی تخلیق میں نظر آتا ھے۔

''جیسی رزمیہ تخلیق آپ کی ھے وہ ھمہ‌گیری اور وسعت نظری، واقعات اور لچھے دار اندازبیان کے طوفان‌خیز مگر پرشکوہ سیل رواں، سوضوع کے مسائل حل کرلینے پر پراعتماد قابو کے ساتھ ھی ضبط تحریر میں آ سکتی تھی — اور یہ تمام خوبیاں ھی اس کو ایک ناقابل فراموش شہ پارہ بنا دینے کو کافی تھیں۔ ڈرامائی کیفیت کے زندہ و تابندہ احساس، فنی اھمیت کی ھر تفصیل کے گہرے مشاھدے اور انسان کے مقدر سے پرجوش ھمدردی کی روح اس میں پھونک دینا ممکن ھوتا — اور اس طرح یہ تخلیق ھمیشہ ھمیشہ کے لئے محبوب بن گئی ھوتی۔ ان دونوں امکانات کو یکجا کرنا فہم و ذکا کی، آپ کے علم و دانش کی علامت ھے۔ یہ اتفاق اسی قدر شاذ و نادر ھوتا ھے جس قدر ایک تیر کےلئے دو پرندوں کو ایک قطار میں لانا۔ آپ نے دونوں چڑیاں ایک ھی تیر سے شکار کر لیں۔

''اپنے مسمار ھوتے ھوئے محل کی جان توڑ حفاظت کرتے ھوئے پرانے نظام حکومت اور خون میں ڈوبی ھوئی زمین کے ایک ایک چپے کے لئے اسی طرح جان‌بازی سے جدوجہد کرتے ھوئے نئے نظام کے متعلق آپ کی داستان کے تصور میں انتہائی وسعت و گہرائی ھے۔ ذھن میں بار بار سوال اٹھتا ھے: دنیا پر کس کی حکمرانی ھے؟ اور جواب دیتا ھے: دل کی۔ اپنی محبت اور بےرحمی، افسردگی، امیدوں، ذلت اور فخر کے ساتھ انسان کے دل کی۔ انسان کا دل، وہ حقیقی میدان کارزار جہاں وہ تمام فتوحات، ساری شکستیں ھوتی ھیں جو ھماری دنیا کو مقسوم ھوتی ھیں۔ اس طرح آپ کا فن تمام سرحدوں کو پار کر لیتا ھے اور ھم ممنونیت کے ساتھ تہ‌دل سے اس کو قبول کرتے ھیں...''

ایک پریس کانفرنس شولوخوف کی آمدوالے روز منعقد ہوئی تھی اور اس کے بارے میں اخبار ''اسٹاک‌ھام ٹیڈنینگین،، نے لکھا تھا:
''اسٹاک‌ھام میں اپنے قیام کے پہلے ہی دن شولوخوف نے سابقہ تمام ریکارڈ توڑ دئے — گرانڈ ہوٹل کے ہال میں پہلے اتنے صحافی کبھی جمع نہیں ہوئے تھے۔،،

ٹیڈین اشاعت گھر کے استقبالئے میں، جس نے شولوخوف کی تحریریں سویڈن کے قارئین تک پہنچانے میں بہت کام کیا ہے، اشاعت گھر کے عمومی ڈائریکٹر بینگت کریسٹیل نے مصنف کا مندرجۂذیل الفاظ میں خیرمقدم کیا:

''آپ کے ناشرین کی حیثیت سے ہم آپ کی خوشیوں میں شریک ہیں، مگر محض اس لئے نہیں کہ ہم آپ کی کتابیں فروخت کرتے ہیں... ہم اس لئے خوش ہیں کہ آج ایک عظیم، حق گو حقیقت پسند فن کی قدرشناسی ہوئی ہے۔،،

شولوخوف کو نوبل انعام ''اس فنکارانہ زوربیان اور حق گوئی کے صلے میں دیا گیا ہے، جس سے انہوں نے اپنے ڈان کے رزمیئے میں روسی عوام کی زندگی کے ایک تواریخی دور کو بیان کیا ہے۔،،

انعام پیش کرنے کی تقریب میں سویڈن کی اکادمی کی نوبل کمیٹی کے صدر ڈاکٹر اینڈرس ایسٹرلنگ نے اپنی تقریر میں ''اور ڈان بہتا رہا...،، میں کاسکوں کی زندگی کے متعلق پراثر حقیقت‌نگاری کا ذکر کیا۔ ہر اعتبار سے یہ ایک پرزور تخلیق ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ انعام ملنے میں ''تاخیر ہوئی، مگر خوش‌قسمتی سے ادب کےلئے نوبل انعام یافتگان کی فہرست عصرجدید کے ممتازترین ادیبوں میں سے ایک کے نام سے مالامال کرنے میں حد سے زیادہ تاخیر نہیں ہوئی۔،، شولوخوف کو مخاطب کرتے ہوئے انہوں نے کہا:
''یہ انعام منصفانہ اور ممنون احسان خراج‌عقیدت ہے اس حصہ کا جو آپ نے سوویت ادب کو ادا کیا ہے، وہ حصہ جسکا ہمارے ملک میں اور اس طرح ساری دنیا میں سب کو بخوبی علم ہے۔،،

ٹاؤن ہال کی ایک ضیافت کی زیادہ بے تکلف فضا میں سویڈن کی اکادمی میں مستقل سیکریٹری برائے ادب ڈاکٹر ک۔ ر۔ گیروف نے فصیح و بلیغ تقریر کی۔ ان کی تقریر کا وہ حصہ جس میں انہوں نے شولوخوف کو مخاطب کیا تھا اتفاقاً ایک ایسے استعارے پر مبنی تھا جس کا خیال ایک اخبار کی اطلاع کے غلط ترجمے پر مبنی تھا۔ لیکن ڈاکٹر

ایک بار تو ایسا ہوا کہ دو مقررین بیک‌وقت اسٹیج پر آئے۔ یہ دونوں لڑکیاں جس گروپ میں شامل تھیں اس میں اختلاف رائے تھا۔ اس لئے دو مختلف رایوں کی مدافعت کرنے کےلئے دو مختلف نمائندے چنے گئے تھے۔

بعض طلباء کو ابھی فنی اور جمالیاتی مسائل پر پورا عبور نہیں تھا، نہ ھی ان کو شولوخوف کی حقیقت نگاری کی اصلیت سے پوری واقفیت حاصل تھی۔ اس لئے ان کے فنکارانہ کمال کا تجزیہ ابھی ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے بعض مسئلے، مثلاً وہ ٹھوس تاریخی حالات جن میں شولوخوف کے کردار سرگرم عمل ہوئے، ثانوی حیثیت اختیار کر گئے اور عصرحاضرہ کے اخلاقی اور جمالیاتی مطالبات کے نقطۂ‌نظر سے ان کے اعمال و افکار کے انداز پر تبادلۂ خیالات نے اولیت حاصل کرلی۔

لیکن بحث کی خاص قدروقیمت عین اس حقیقت ھی میں مضمر تھی۔ شولوخوف کے تخلیق کردہ پیکروں اور جرمنی کے جدید مقبول‌ترین ادیبوں کے تخلیق کردہ کرداروں کے درمیان مماثلت تلاش کی گئی۔ بحث اس بات پر چھڑ گئی کہ اپنے پڑوسی کی جانب ایک کمیونسٹ کی کیا ذمہ‌داری ھوتی ھے (اس کا آغاز ناول ''اور ڈان بہتا رہا...'' میں گریگوری میلیخوف اور میخائل کوشیووئی کے باھمی تعلقات سے ھوا تھا)۔ اس پر کہ اگر مقصد انسان دوستی ھو تو کیا تمام ذرائع انسان دوستانہ تصور کئے جا سکتے ھیں، اس پر کہ کیا سوشلزم کے تحت المئے کا مسئلہ موجود رھتا ھے، اس پر کہ کسی کردار کو مثبت کیا چیز بناتی ھے — اس کے ارادے اور اعمال یا صرف اس کے اعمال (یہاں بحث ناگولنوف کی شخصیت پر ھو رھی تھی)۔ اور متعدد دوسرے مسئلوں پر بھی بحث ھوئی۔

ظاھر ھے کہ یہ نوجوان وہ دوبارہ دریافت کر رھے تھے جو پہلے ھی دریافت کیا جا چکا ھے، وہ تلاش کر رھے تھے جو تلاش کیا جا چکا ھے۔ لیکن اس میں کیا مضائقہ ھے۔ اھم بات یہ تھی کہ ان میں سے ھر ایک اپنے طور پر حقیقت دریافت کرنا چاھتا تھا، زندگی کے مسئلے حل کرنا چاھتا تھا، اپنے لئے اور اپنے ھمعصروں کے لئے انہیں حل کرنا چاھتا تھا۔

شولوخوف کی تخلیقات کے مطالعے سے ان میں آفاقی نقطۂ نظر مرتب کرنے سے متعلق جاندار مسئلوں پر بحث کرنے کی خواھش پیدا

...ان تمام ہنگاموں میں گھرے ہوئے ہونے کے باوجود مصنف نے نوجوانوں سے ۔ اسٹاک‌ہام کے اور قدیم شہر اپسالا کے دارالعلوم کے نوجوانوں سے ملاقات کرنے کا وقت نکال لیا ۔ سلافی علمی ادارے اور اپسالا یونی‌ورسٹی میں ۸۰۰ سے زیادہ طلباء شولوخوف سے ملنے آئے ۔ ممتاز سوویت ادیب کی تخلیقات سے طلباء اور اساتذہ دونوں نے یکساں، بےپناہ دلچسپی کا اظہار کیا اور ان سے بہت سارے سوالات پوچھے اور انہیں زندہ‌دل، بے تکاف جوابات ملے ۔ دوستی، اعتماد اور باہمی احترام کی فضا فوراً ہی قائم ہو گئی جس میں شولوخوف کی اپنی مخصوص شگفتگی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا، وہ شگفتگی جو گفتگو میں ایک حرارت پیدا کر دیتی ہے اور جن سے وہ ہم‌کلام ہوتے ہیں ان کی ہمدردیاں فوراً ہی حاصل کر لیتے ہیں ۔

اس وقت مجھے یورپ کی ایک اور قدیم یونی‌ورسٹی کی جلسہ گاہ یاد آ رہی ہے ۔ وہاں طلباء شولوخوف کی تصانیف میں فلسفے کے مسائل کا حل تلاش کرنے جمع ہوئے تھے ۔ یہ مشورہ حاصل کرنے کہ انسان کو اپنی زندگی کیسے بسر کرنی چاہئے ۔ مصنف وہاں صرف روحانی اعتبار سے ہی موجود تھے، لیکن نوجوان گویا ان سے ہمکلام تھے، ان پرجوش بحثوں میں ان سے تائید حاصل کر رہے تھے جو زندگی کے مختلف اور اہم مسئلوں پر تبادلۂ خیالات کے دوران چھڑ جاتی تھیں ۔

...جینا کے سلافی علمی ادارے میں نوجوانوں کا اجتماع تھا ۔ جرمن جمہوری ری‌پبلک کی" سب سے بڑی یونی‌ورسٹیوں سے یہ لوگ ایک کانفرنس میں شرکت کرنے آئے تھے جس میں اس تحقیق کی تعمیم کرنی تھی جو پوری ری‌پبلک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں انجام دی گئی تھی ۔ اس کانفرنس کا موضوع تھا : میخائل شولوخوف کی تخلیقات میں سوشلسٹ انسان دوستی ۔

جلسہ‌گاہ کھچاکھچ بھری ہوئی تھی ۔ صدارت کے فرائض ایک طالبہ انجام دے رہی تھی ۔ تین طلباء نے بحث کے لئے دعوے اجتماعی طور پر مرتب کئے تھے، جو کانفرنس کے تمام شرکاء میں تقسیم کر دئے گئے تھے ۔ ان پر اور تینوں مصنفوں کے سوالات پر بحث ہو رہی تھی ۔ مراتب کے اعتبار سے تمام درجوں کے اور جرمن جمہوری ری‌پبلک کے تمام علاقوں سے آئے ہوئے طلباء نے تقریریں کیں، بعض نے کئی کئی بار ۔ جیسے جیسے بحث بڑھی، ویسے ہی ویسے موضوعاتی مسئلے مباحثے میں داخل ہوتے گئے ۔

کے روبرو ادیب کی ذمہ‌داری پر غور کرنے میں ان کے ساتھ شامل ہونے کی سبیل ھاتھ آتی ھے۔ نظریاتی تصادموں کی دنیا میں سماجی زندگی میں فنکار جو حصہ ادا کرتا ھے اور فنکار کا جو نصب العین اور فرض ہوتا ھے، انہوں نے ان کا ذکر کیا۔ انہوں نے کہا کہ دنیائے ادب میں رونما ہونےوالے بعض واقعات کی وجہ سے مجھے تشویش ھے جبکہ کچھ اور ایسے ھیں جو ایک ایسے ادب کے مستقبل پر اعتماد پیدا کرتے ھیں جو عوام کی خدمت انجام دےگا، محبان وطن اور بین الاقوامیت پسندوں کی پرورش کریگا اور کمیونزم کی تعمیر میں مدد دیگا۔ ھر ایسی چیز کی جانب ادب میں اعتدال پسندانہ رویے کی انہوں نے مذمت کی جس سے نوجوانوں پر مخرب‌الاخلاق اثر پڑنے کا احتمال ھو اور انہوں نے ان تازہ، صحت مند اور جوان سال آوازوں کا ذکر کیا جو نثرنگاری اور شعرگوئی میں سنائی دینے لگی ھیں۔ انہوں نے حاضرین کو گورکی کا وہ سوال یاد دلایا جس کا اب بھی فوری اطلاق ھوتا ھے: ”تہذیب کے معمارو، تم کس کی طرف ھو؟“ نوعیت کے اعتبار سے غیرمصالحانہ ھونے کے باوجود ھمدردانہ مشورہ اور اجتماعی تبادلۂ خیالات فن کار کے لئے کارآمد ھوتے ھیں۔ ادیب کے لئے ضروری ھوتا ھے کہ وہ اپنے اور اپنے فن کے معاملے میں انتہائی سخت گیر ھو۔ شولوخوف نے یہ کہا اور اس کی وضاحت اپنی کئی مثالوں سے کی جو ”اور ڈان بہتا رھا...“، ”جب زمین جاگی“، اور ”وطن کے مجاھد“، کی تصنیف کے دوران ان کے خود اپنے تجربے میں آئی تھیں۔ انہوں نے زور دیکر باربار کہا کہ نوجوانوں کو خطاب کرتے ہوئے ان کا مقصد وعظ دینا نہیں بلکہ وہ مسائل دریافت کرنا ھے جو ان کے دماغ پر بوجھ بنے ھوئے ھیں، اور وہ خود جو نتائج اخذ کر چکے ھیں ان میں ان کو شریک کرنا ھے۔

اسی جلسے میں مشہور و معروف بلغاریائی شاعر لیوبومیر لیوچیف کی تقریر بھی یادگار ھے:

”اس اجتماع کا اھم‌ترین پہلو بہ‌نفس نفیس آپ سے ملاقات ھے۔ یہ گویا اس کا تاج ھے۔ آپ کی تصانیف نے کمیونسٹوں کی پیڑھیوں کو، کومسومولیوں کی پیڑھیوں کو، مجاھدوں کی پیڑھیوں کو تربیت دی۔ مشہور بلغاریائی ادیبوں نے اپنا فن آپ سے سیکھا۔ ان میں سے کچھ ھماری آزادی کی جدو جہد میں شہید ھوئے، اوروں نے اپنی ساری زندگی ملک میں سوشلزم کی تعمیر پر وقف کر دی، اور بھی ھیں جو اپنے

ہوئی ۔ ان کی تخلیقات نے انہیں اس بات پر غور کرنے کے لئے اکسایا کہ زندگی میں وہ کونسا مقام حاصل کریں اور ایک شہری کی حیثیت سے ان کے کیا فرائض ہیں اور یہ کہ کمیونسٹ مستقبل اور نئی دنیا کے لئے جد و جہد کرنے والے عوام کے اخلاقی اور اخلاقیاتی معیاروں کا اعادہ کرنے کی ضرورت ہے ۔

لائپزیگ کی کارل مارکس یونیورسٹی نے شولوخوف کو فلسفے کی اعزازی ڈاکٹریٹ عطا کی تھی ۔ انہیں اسکی سند پیش کرنے جرمن عالموں کا ایک وفد ویشنسکایا آیا تھا ۔ اس نے اس موقع پر جو سپاسنامہ پیش کیا تھا اس کا اختتام مندرجۂ ذیل اہم الفاظ پر کیا گیا تھا :

''شولوخوف کی تخلیقات ہمارے عوام اور ہمارے نوجوانوں کے لئے، جن میں طلباء بھی شامل ہیں، ایک لازوال سرچشمہ بن گئی ہیں جس سے وہ ایک معتبر انقلابی جذبے، پارٹی کی پرعزم تائید، بےداغ دیانت، دلی ہمدردی اور اپنی زندگی کے نصب العین کے لئے اپنے آپ کو کامل طریقے سے وقف کر دینے کا سبق حاصل کرتے ہیں ۔''

دل کے کہنے پر

''آج شام میں آپ کے پاس نوجوان ادیبوں کے کام کے نگراں کی حیثیت سے فرض کی پکار پر ہی نہیں بلکہ دل کے کہنے پر بھی آیا ہوں ۔''

ان الفاظ کے ساتھ ۲ جولائی ۱۹۶۹ء کو روستوف برساحل ڈان میں پارٹی تعلیم کے ایوان میں شولوخوف نے اپنی تقریر شروع کی تھی ۔ وہ نوجوان فنکاروں کے بلغاریائی سوویت کلب کے میمبروں کو ان کے ایک باقائدہ جلسے کو خطاب کر رہے تھے ۔ اس اجتماع کا عام موضوع تھا : ''تاریخ اور عوام کے روبرو فنکاروں کی ذمہ‌داری'' ۔ ان کے سامعین میں نوجوان بلغاریائی اور سوویت ادیب، صحافی، اداکار، ہدایت کار، مصور، بت‌تراش، مورخ، ماہرین فن عمارت، موسیقار اور کلب کے وہ مہمان بھی شامل تھے جو ہنگری، پولینڈ، رومانیہ اور چیکوسلوواکیہ سے آئے تھے ۔

شولوخوف نے کہا تھا کہ اپنے نوجوان ساتھیوں سے ملکر انہیں اس لئے مسرت ہوتی ہے کہ اس سے ان کو نوجوانوں سے تعلق میں آنے کا موقع ملتا ہے، یہ معلوم کرنے کی کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں اور سماج

ہے۔ ہمارے پیشے میں اس بات کا خطرہ ہوتا ہے۔ روحانی آزادی اور تخلیقی آزادی سب خوب ہیں، بجا ہیں مگر خدا کے لئے غلطیوں کے بارے میں زیادہ محتاط رہیئے۔ ہم میں سے ہر ایک کو پڑھا جاتا ہے، ہم میں سے ہر ایک کے اگر، جیسا کہ یہاں کسی نے کہا تھا، 'عالمی قارئین، سب کے نہیں تو ہزاروں نہایت محتاط اور سخت تقاضے کرنےوالے قارئین ضرور ہیں۔ بےچین، بےقرار روحیں صرف ادیبوں تک ہی محدود نہیں ہوتیں اور غلطی — اس صورت میں اور بھی جبکہ وہ اہم ہو، کربناک غوروفکر سے سرزد ہونےوالی غلطی اور اس طرح کسی خاص فرد کے لئے ایک حد تک حق بجانب غلطی بھی — ہزاروں مقدروں میں ہزاروں غلطیوں کا، دوسرے ہزارہا لوگوں کے زاویۂ نگاہ میں غلطیوں کا باعث ہوتی ہے۔ اگر ہم غلطیاں کرنے کے اخلاقی حق کی ہی بات کر رہے ہیں تو شاید سرجن کو بھی، کوئی آپریشن کرتے وقت غلطی کا حق حاصل ہو سکتا ہے: صرف ایک شخص کو تکلیف اٹھانی پڑےگی۔ لیکن جب ہم کسی خاص چیز سے آپریشن کرتے ہیں اور غلطی کر جاتے ہیں، اور اس کا چلن عام ہو جاتا ہے تو ایسی غلطی، میں پھر کہتا ہوں، ہزار گنی زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے۔ ہمیں دوچند احتیاط برتنی چاہیئے اور بعض اوقات ہمیں اپنی بےقرار روح کو کچل دینا چاہیئے تاکہ اوروں کو ضرر نہ پہنچے۔"

مارچ ۱۹۶۹ء کے آخر میں نوجوان ادیبوں کی پانچویں کل یونینی کانفرنس نے جو ماسکو میں منعقد ہوئی تھی، اپنا کام ختم کر لیا۔ شولوخوف نے جو غیرممالک کے ایک دورے سے واپسی پر راجدھانی سے گذر رہے تھے، کانفرنس کے کچھ شرکاٴ کو ملاقات کے لئے بلایا۔ انہوں نے کانفرنس کے کام کے بارے میں، اس کے مختلف اجلاسوں اور سیمیناروں کے بارے میں تبادلۂ خیالات کیا اور اس کے بارے میں اپنے تاثرات انہیں بتائے۔ شولوخوف نے اس کانفرنس کی یادگار کتاب میں لکھا: "اس کانفرنس کی کامیابی پر مجھے مسرت ہے! ہمیشہ کی طرح میں نوجوانوں کی کامرانی، پامردی اور کامیابی کا متمنی ہوں۔"

اس ملاقات کے دوران گفتگو کا رخ زندگی کے بہت سے مسئلوں کی جانب اور ان تخلیقی راہوں کی جانب ہو گیا جن کی طرف نوجوان ادیب اور شاعر بڑھ رہے ہیں۔ شولوخوف نے انہیں خبردار کیا کہ

کام میں مصروف ہیں اور آپ سے سیکھ رہے ہیں۔ ''ہزار کرشماتی چشمے'' کی ایک بلغاریائی لوک کتھا ہے جو نابیناؤں کو بینائی، اور فوجیوں کو توانائی بخشتا ہے تاکہ جیت جائے۔ آپ سے ملاقات، گویا انہیں میں سے ایک چشمے پر پہنچنا تھا جن سے اپنے آئندہ کے کام کے لئے توانائی حاصل کر سکیں۔ ظاہر ہے بڑے بڑے کام ہیں جو ہمیں ابھی کرنے باقی ہیں جن کے لئے شولوخوف کی وجدانی سچائی، شولوخوف کا جوہر درکار ہوگا، خواہ وہ نہایت خفیف مقدار ہی میں ہم میں ہو۔ ''

جون ۱۹٦۷ء میں سوویت یونین اور دوسرے سوشلسٹ ملکوں سے آئے ہوئے نوجوان ادیبوں سے ویشنسکایا میں شولوخوف کی بات‌چیت ایسے ہی ماحول میں ہوئی۔ اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ جدید ادب اور سماج کی زندگی سے اس کے اٹوٹ رشتوں کے متعلق، عہد حاضرہ میں ادبی نشو ونما سے متعلق خاص مسائل اور فنکار کی اخلاقیاتی تشکیل و ترکیب اور عوام کی جانب اس کے فرض کے بارے میں غور و فکر کرتے ہوئے شولوخوف نے کہا کہ نوجوان ادیب ہمارے ادب کا مستقبل ہیں، نوجوان اور بزرگ ادیبوں کے درمیان تخلیقی رشتوں کو تقویت دینا بہت ہی اہم ہے۔ انہوں نے سوویت ادیبوں کی ابھرتی ہوئی نسل کو دعوت دی کہ وہ سوویت ادب کی بہترین روایات کی بلا انحراف تقلید کریں اور بورژوا نظریے کے مظاہر کی جانب غیرمصالحانہ رویہ اختیار کریں۔ انہوں نے سماج کے روبرو فنکار کی دن‌بدن بڑھتی ہوئی ذمہ‌داری کا اور پارٹی اور عوام کے مفادات سے سوویت ادیب کی پرجوش عقیدت کا ذکر کیا۔

مختلف تخلیقی مسائل پر غیررسمی تبادلۂ خیالات کے دوران گفتگو کا رخ غلطیاں کرنے کے ادیب کے حق کی جانب ہو گیا۔ اس مسئلے پر شولوخوف نے خاص توجہ دی:

''میرا خیال ہے کہ کسی بھی ادیب کو بلالحاظ اس بات کے کہ وہ کتنا ممتاز اور بزرگ ہے، خصوصی رتبے کا دعویدار نہیں ہونا چاہیئے۔ رہی بات ''غلطیاں کرنے کی آزادی''، تو اگر اجتماعی فارم کے جتھے کا کوئی لیڈر غلطی کرتا ہے تو فارم کا صدر اس غلطی کو ہمیشہ درست کر دیگا۔ یہ غلطی مقامی نوعیت کی ہوتی ہے اور دوسروں کو اس سے نقصان نہیں پہنچیگا۔ ادیب مطبوعہ تصنیف میں غلطی کر کے ہزاروں قارئین کو غلطی کی جانب لے جاتا

نوجوانوں کی مطبوعات اور ناشروں سے شولوخوف کے جو قریبی تعلقات تھے ان کو انہوں نے ہمیشہ وفاداری کے ساتھ نبھایا۔ ۱۹۶۲ء میں ''مولودایا گواردیا،، اشاعت گھر نے اپنی چالیسویں سالگرہ منائی اور مبارکباد کے پیغامات میں شولوخوف کا بھی تار آیا تھا: ''مجھے نہایت افسوس ہے کہ کام کی زیادتی کے باعث اس شاندار جشن میں شرکت نہیں کر سکتا۔ نوجوانوں کی پرداخت کا بے انتہا اہم فرض آپ پر عائد ہوتا ہے اور اس کام کے لئے ہم، پرانی پیڑھی کے قارئین اور ادیب آپ کو دل سے عزیز رکھتے ہیں، آپ کی بڑی قدر کرتے ہیں اور تہ‌دل سے آپ کا احترام کرتے ہیں۔ برائے مہربانی، میری جانب سے بھی ذاتی طور پر فرداً فرداً ہر ایک کی زندگی میں مسرت اور کامیابی کی بہترین خواهشات قبول فرمائیں۔ آپ کا بادل نا خواستہ مائل بہ پیری نوجوان سنتری، میخائل شولوخوف۔،، اشاعت گھر کے مہمانوں کی رایوں کی کتاب میں اگلے سال کے اندراج میں ''مولودایا گواردیا،، کی روایات کے تسلسل اور پرانی اور نئی پودوں کے درمیان اٹوٹ رشتوں پر شفقت کے ساتھ زور دیا گیا ہے: ''مولودایا گواردیا،، کے نوجوان مصنفین کی صحبت میں مجھے ہمیشہ مسرت حاصل ہوتی ہے! میں خود کو جوان محسوس کرنے لگتا ہوں...،،

ان متنوع اور متعدد ملاقاتوں کی اصل خصوصیت قارئین کو نہ صرف اپنی کتابوں اور ان کرداروں کے ذریعے جن میں وہ زندگی کی روح پھونک دیتے ہیں، مخاطب کرنا بلکہ براہ‌راست بھی، تبادلۂ خیالات اور بالمشافہ ملاقات کے لئے شولوخوف کی مستعدی ہے۔

شولوخوف سے ملاقات کے ان جلسوں میں ہر وضع کے لوگ: نوجوان ادیب، مزدور، کاشتکار، فوجی اور ہمارے شہرۂ آفاق سوویت خلاباز بھی شامل ہوتے ہیں۔ آنجہانی یوری گگارین اور بورس وولی‌نوف ویشنسکایا میں شولوخوف کے ہاں مہمان آچکے ہیں۔

''لئے دئے رہنے،، سے، عالمانہ یا ناصحانہ لہجہ اختیار کرنے سے شولوخوف کو سخت چڑ ہے اور ذاتی طور پر ان سے جو سوالات کئے جائیں ان کے جواب دینا عموماً پسند کرتے ہیں۔ اپنے اور حاضرین کے درمیان گرما گرم بحث چھیڑ دینا انہیں پسند ہے۔ رسمی طور پر مسلسل اظہارخیال کا طریقہ وہ انشائیوں، اخبارات کے مضامین یا بڑے بڑے جلسوں میں تقریروں کے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔

زندگی میں بہت پہلے وہ مکمل طور پر ادبی کام کے لئے اپنے آپ کو وقف نہ کریں اور انہیں ایک بار پھر یاد دلایا کہ کوئی بھی سچا فنکار زندگی سے اپنے آپ کو الگ تھلگ نہیں کر سکتا۔ ادیب کے فن کے ہر جزو پر عبور حاصل کرنے اور نظم و نشر کے ہر لفظ کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لئے مستقل مزاجی سے جدوجہد کرنے کی اھمیت پر زور دیا۔

شولوخوف اور نوجوان ادیبوں کے درمیان باتیں ادب کے فوری مسئلے حل کرنے کے بارے میں ہوا کرتی ھیں۔ عوام کی زندگی میں فنکار کے مقام اور حال اور مستقبل کے روبرو اس کے فرض پر ھمیشه ھی تبادلۂ خیالات ھوا کرتا ھے۔ لیکن جب، مثلاً، ملاقات کارخانوں کے نوجوان مزدوروں یا نوجوان کاشتکاروں سے، خلابازوں، فوجیوں، ملاحوں، طالب علموں سے ھوتی ھے یا جب اسکول کے بچوں سے خط و کتابت ھوتی ھے تو جو سوالات اٹھائے جاتے ھیں اور انسانی سرگرمیوں کے جو حلقے زیر بحث آتے ھیں وہ قطعی مختلف ھوتے ھیں۔

مگر یه ساری ملاقاتیں جو چاھے بالمشافه ھوں یا تحریروں کے ذریعے، اس عظیم ادیب اور شہری کے ''دل کے کہنے پر'' ھوتی ھیں جس کے خیالوں میں نئی پود کا مقدر، مستقبل اور حال جس میں اس کی قوم کا مستقبل ڈھالا جا رہا ھے، ھمیشه بسا رھتا ھے۔

اب مناسب معلوم ھوتا ھے که ''اور ڈان بہتا رہا...'' اور ''جب زمین جاگی'' کے مصنف کی تخلیقی زندگی کے نمایاں خدوخال پیش کر دئیے جائیں۔ شولوخوف نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مختصر خاکوں سے کیا۔ پھر افسانوں کا سلسله شروع ھوا جنھیں ان کے عظیم ناولوں کا حرفِاول تصور کیا جا سکتا ھے اور جو سب سے پہلے سوویت نوجوانوں کے جریدوں میں شائع ھوئے۔ درحقیقت شولوخوف نے اپنی تحریر و تصنیف کی زندگی ماسکو کے اخبار ''یونوشسکایا پراودا'' (جس کا نام بعد میں ''مولودئی لینینیتس'' ھو گیا)، ''ژورنال کرستیانسکوئی مولودیوژی'' اور رساله ''کومسومولیا'' کے لئے کام کرنے سے شروع کی تھی۔ وہ ایک ادبی اور فنی مجموعے کے لئے بھی اپنی تخلیقات بھیجا کرتے تھے جو کچھ ادیب جو ''مولودایا گواردیا'' (نوجوان سنتری) کہلاتے تھے، وقتاً فوقتاً شائع کرتے تھے۔ ان کی تخلیقات ''کومسومولسکایا پراودا'' اور رساله ''سمینا'' میں بھی شائع ھوتی تھیں۔

اظہار خیال کیا تھا اس سے ان کے رویے کی خاص طور سے وضاحت ہو جاتی ہے: ”سیرافیمووچ ادیبوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جس سے ہم نوجوانوں نے سیکھا تھا۔ میں ذاتی طور پر ان کا احسانمند ہوں کیونکہ سب سے پہلے انہوں نے ہی مجھے سہارا دیا تھا، میری ہمت‌افزائی کی تھی اور میری ادبی زندگی کے آغاز میں ادیب کی حیثیت سے مجھے تسلیم کیا تھا۔“

نوجوان کمیونسٹ لیگ کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر شولوخوف نے لکھا تھا کہ کومسومول کے میمبر پارٹی کی رہنمائی کے تحت خانہ جنگی میں دشمن کا صفایا کر رہے تھے، اجتماعی فارم قائم کرنے میں مدد کر رہے تھے اور ان لوگوں کی صف‌اول میں تھے جو سوویت صنعت کی تعمیر کر رہے تھے، سوشلسٹ مقابلے بازی کا پرچم بلند کئے ہوئے تھے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ بالشویزم کے بیج زرخیز زمین میں بوئے گئے تھے۔

حال ہی کا جو جشن منایا گیا وہ ویشنسکایا میں نوجوان کاسک اجتماعی کاشتکاروں کے تھیٹر کی دوسری سالگرہ کا تھا۔ اس موقع پر شولوخوف نے اس تھیٹر کو ”فن کی چھوٹی سی روشن مشعل“ سے تشبیہہ دی تھی جو ڈان کے ایک گاؤں میں روشن کی گئی تھی اور جسکی جگمگاہٹ پورے علاقے میں پھیل جانی چاہیئے تاکہ آرٹ عوام‌الناس کی رگ و پے میں پیوست ہو جائے۔

انشاپرداز کی حیثیت سے شولوخوف کی سرگرمیوں کے پہلے دور کے منطقی نتیجے کی تشکیل سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی اٹھارویں کانگرس میں ان کی مشہور تقریر سے ہوتی ہے۔ انہوں نے سوویت یونین کی برادرانہ قومی جمہوریاؤں کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات کے بارے میں ڈیلی گیٹوں کو بتایا۔ قومی مصنفوں کی تازہ دم آوازیں روسی ادب کے سیل‌رواں میں آن ملی تھیں، اس کو مالامال کر دیا تھا اور اس کو حقیقی معنوں میں تمام سوویت قوموں کی تخلیق بنا دیا تھا۔ شولوخوف نے ان میں قزاخ شاعر جمبول کے ”سادگی میں پرکار“ گیتوں، ”جارجیائی نظموں کی مسحورکن شیرینی“ اور داغستانی شاعر سلیمان استالسکی کی ”انوکھی، نغمہ‌ریز بیتوں“ کی مثالیں پیش کی تھیں۔ پھر انہوں نے سوویت ادیبوں اور پڑھنے‌والوں کے درمیان تعلقات کا ذکر کیا:

”اپنے فن سے جن لوگوں کی ہم خدمت کرتے ہیں وہ ہمارے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے۔ ہماری تنقید کی

انسان دوست وہ ہے جو جہاد کرتا ہے

شولوخوف کی تمام تخلیقات انسان کی بھلائی کی جدوجہد کے تصور اور کمیونزم کے خیالات میں رچی ہوئی ہیں: یہ ان افسانوی ادب کی تخلیقات اور انشائیہ تحریروں کے متن دونوں پر صادق آتا ہے۔ زیرنظر کتاب موخرالذکر صنف کی انکی بنیادی تحریروں کو جن میں تقریریں اور نشری تقریریں بھی شامل ہیں، یکجا کرتی ہے۔

''اور ڈان بہتا رہا...،، کے انگریزی ایڈیشن کا پیش‌لفظ نوعیت کے اعتبار سے مناظراتی ہے۔ اس میں مصنف نے اپنی تصنیف کے جو پہلے ہی عالمگیر شہرت حاصل کر چکی تھی، اور اپنی نئی تصنیف ''جب زمین جاگی،، کے بنیادی خیال کی وضاحت کی ہے، اور ان غلط تاویلات کی جو اهل غرض غیرملکی قارئین اور نقادوں میں ان دنوں عام تھیں، تصحیح کی ہے۔ ''اور ڈان بہتا رہا...،، کے سلسلے میں انہوں نے ''ان زبردست تبدیلیوں،، کا ذکر کیا تھا ''جو پہلی عالمگیر جنگ اور انقلاب کے نتیجے میں زندگی میں، روزمرہ کی سرگرمیوں میں اور انسانی نفسیات میں رونما ہو گئی ہیں،،۔ انہوں نے لکھا تھا کہ میرا فرض یہ ہے کہ ''دونوں جنگوں (پہلی عالمگیر جنگ اور خانہ جنگی) اور انقلاب کے دوران میں وادی ڈان کے مختلف سماجی پرتوں کو دکھاؤں،، اور ''۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان واقعات کا جو زبردست بھنور پیدا ہوا اس* کے اندر کھنچ کر چلے آنےوالے افراد کا المناک مقدر ایک تسلسل میں پیش کروں...،،

۱۹۳۴ء میں، ادیبوں کی کل یونینی کانگرس کے ایک ماہ بعد شولوخوف نے روستوف برساحل ڈان کے فیکٹری مزدوروں اور ریلوے مزدوروں کے ایک جلسے میں ایک اہم تقریر کی جس میں واضح کیا کہ پرولتاری نصب‌العین میں ادب ایک جزو کی حیثیت رکھتا ہے۔

اعلی سوویت کے میمبر کی حیثیت سے اپنی تقریروں میں شولوخوف نے وضاحت کی ہے کہ وطن کی سچی محبت کیا ہے اور جھوٹی محبت کیسی ہوتی ہے، بتایا ہے کہ تاریخ لوگوں کے قول کے مطابق نہیں بلکہ اعمال کے مطابق پرکھتی ہے، ڈان کے کاسکوں کو مقدر نے کیا دیا اور یہ کہ سوویت حب‌الوطنی کیا ہوتی ہے۔

۱۔ س۔ سیرافی‌مووچ کی پیدائش کے پچھترویں سال کی تقریب کے موقع پر اپنے مضمون میں شولوخوف نے جس پیار اور احترام کے ساتھ

نے مادر وطن کی پکار پر ہتھیار اٹھائے تھے مخاطب کرتے ہوئے ادیب اور محب وطن نے بہادری اور ظفرمندی کی وہ روایات یاد دلائیں جو تاریخ نے ان کو ورثے میں دی تھیں - انہوں نے انہیں اپنے اس تار کے متعلق بھی بتایا جو دفاع کی عوامی کمیساریت کے نام بھیجا تھا جس میں انہوں نے مطلع کیا تھا کہ اپنا ریاستی انعام دفاعی فنڈ میں دے دیا ہے اور یہ کہ وہ مزدوروں اور کسانوں کی لال فوج کی صفوں میں شامل ہونے کے لئے اور اپنے خون کے آخری قطرے تک سوشلسٹ مادروطن کی حفاظت کرنے کے لئے ہر دم تیار ہیں -

۴ جولائی ۱۹۴۱ء کے ''پراودا،، میں ان کا مضمون ''ساحل ڈان پر،، شائع ہوا - اس کی آخری سطریں اس خیال کا لب لباب تھیں جو عرصہ دراز تک شولوخوف کی انشائیہ تحریروں پر حاوی رہا : ''ڈان کے کاسکوں کے دل پر دو احساسات غالب ہیں : اپنی مادروطن سے محبت اور نازی حملہآوروں سے نفرت - محبت رہتی دنیا تک جاگزیں رہیگی لیکن نفرت دشمن کا مکمل صفایا ہونے تک ہی قائم رہے - ،،

جنگ ابھی شروع ہی ہوئی تھی لیکن اس ابتدائی دور میں بھی شولوخوف کے الفاظ میں کامل یقین اور اپنی قوم پر مکمل اعتماد کی گونج تھی : ''اس نفرت اور عوام کے جوشِانتقام کو ابھارنےوالوں پر لعنت!،،

جنگ شروع ہونے کی پہلی سالگرہ پر ''پراودا،، نے ''نفرت کی سائنس،، کے عنوان سے ایک افسانہ شائع کیا - اس کا رنگ اگرچہ افسانوی ہے مگر لہجہ نمایاں طور پر انشائیہ ہے اور شولوخوف کے لئے ایک نیا موڑ ہے - اس افسانے کا مرکزی کردار، لفٹنٹ گیراسیموف اپنے انداز میں ان خیالات کی عکاسی کرتا ہے جن کا اظہار شولوخوف نے زمانہجنگ کے اپنے پہلے خاکے میں کیا تھا - لفٹنٹ کہتا ہے بظاہر ایسا لگے گا کہ جیسے محبت اور نفرت کبھی ساتھ ساتھ نہ ہو سکتی ہوں اور وہ ایک روسی قصے کی مثال دیتا ہے جو مضبوط گھوڑے اور نازک اندام ہرنی کے متعلق ہے جنہیں کبھی ایک ساتھ گاڑی میں نہ جوتا جا سکتا تھا - پھر وہ کہتا ہے ''مگر ہم نے جوت لیا ہے - اور دونوں ساتھ ساتھ مزے میں چل رہے ہیں!.. وطن کی محبت ہمارے دلوں میں جاگزیں ہے اور جب تک ہمارے دلوں میں دھڑکن باقی ہے وہیں رہیگی - اپنی نفرت کو ہم سنگینوں کی نوک پر لئے پھرتے ہیں - ،، (شروع میں ہمیں تامل تھا کہ انشائیہ تحریروں کے مجموعے میں اس افسانے کو شامل کرنا آیا مناسب بھی ہوگا یا نہیں لیکن پھر فیصلہ کیا کہ مندرجۂ ذیل اسباب کی بنا پر ہم حق

جاتی ہے، جب ضرورت ہو تو سرزنش کی جاتی ہے، جب ہمیں ناکامی ہوتی ہے تو سہارا دیا جاتا ہے، جب کام قابل تعریف ہو تو تعریف کی جاتی ہے، اور ہم میں سے ہر ایک کو عوام کے رہبرانہ دست شفقت کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔،،

شولوخوف نے اپنے اور بہت سے دوسرے ڈیلی گیٹوں کے بارے میں جو پارٹی کانگرس میں پہلی بار حصہ لے رہے تھے، فخر کے ساتھ ذکر کیا کہ وہ پارٹی کے پروردہ دانشوروں کی پہلی کونپلیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے بعد لاکھوں کروڑوں آئیں گے جن کے لئے کلچر فطرت ثانیہ بن چکا ہوگا۔

تیزرفتار پیش‌قدمی کے پرمسرت احساس اور کمیونسٹ تعمیر میں روزافزوں کامیابیوں پر جو ان دنوں سوویت سماج کی کرداری خصوصیت تھی، آنےوالی جنگ کے سائے پڑنے لگے تھے۔ ۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا اور اس کانگرس میں شولوخوف کی تقریر لوگوں کی یادوں میں ایک پیمان بن کر گونجی: ''یہ بات صاف صاف بتا دینی چاہیئے کہ سوویت ادیب مغربی یورپی صلح پسندوں کی رقت‌انگیز نسل سے تعلق نہیں رکھتے ... اگر دشمن ہمارے ملک پر حملہ‌آور ہوتا ہے تو ہم سوویت ادیب اپنے قلم رکھدیں گے اور پارٹی اور حکومت کی دعوت پر دوسرا ہتھیار اٹھا لیں گے... لال فوج کی صفوں میں، شاندار سرخ پرچم کے زیر سایہ ہم دشمن کو یوں مار گرائیں‌گے کہ پہلے کبھی کسی نے نہ کیا ہوگا... دشمن کا قلع قمع کرنے کے بعد ہم کتابیں لکھیں گے کہ کیسے کیا۔ یہ کتابیں ہمارے عوام کے کام آئینگی اور اگر کوئی حملہ آور بچے تو ان کے لئے باعث‌تنبیہہ ہوں گی۔،،

یہ سب کچھ صحیح ثابت ہوا۔

شولوخوف کا قلم دوسرے ہتھیار سے بدل گیا لیکن وہ بیکار نہیں پڑا رہا۔ جنگ کے زمانے میں شولوخوف نے اخباروں کے لئے جو خاکے اور انشائیے لکھے اور کتابیں لکھیں انہوں نے عوام کی بحسن و خوبی خدمت انجام دی۔ اور جو دوسری عالمی جنگ شروع کرنےوالوں کے ذلت‌آمیز انجام کو فراموش کرکے نئی جنگ شروع کرے اس کے لئے تنبیہہ کی حیثیت بھی رکھتی ہیں اور یاد دہانی کی بھی۔

۲۶ جون ۱۹۴۱ء کو اخبار ''بالشیوستسکی ڈان،، نے شولوخوف کی اس تقریر کا اقتباس شائع کیا جو انہوں نے محاذ جنگ پر جانےوالے کاسکوں کے دستوں کے سامنے کی تھی۔ ۲۴ جون کو اپنے ہموطنوں کو جنہوں

ہے، ہوائی حملے کے دوران جرمن ہوائی جہاز سے گرائے ہوئے ایک بم سے ہلاک ہوئیں ۔ اس کارروائی کے پیش نظر مقصد وہ تھا جو ڈاکوؤں کا ہوتا ہے — آبادی کو تتربتر کردیاجائے تاکہ بڑھتی ہوئی جرمن فوج کے روبرو لوگ اپنے مویشیوں کو مشرق کی طرف ہانک کر نہ لیجا سکیں ۔ جرمن توپوں کے گولوں نے میرے گھر، میری لائبریری کو تباہ و برباد کر ڈالا ۔ میرے بہت سے دوست — ادیب اور میرے گاؤں کے ساتھی — مجھ سے بچھڑچکے ہیں، وہ محاذجنگ پر کام آئے ۔ ایک عرصۂدراز تک مجھے اپنے بال بچوں کی کوئی خبر نہ مل سکی ۔ اس دوران میں میرا بیٹا بیمار رہا اور میں کسی طرح کی کوئی مدد نہ کرسکا ۔ لیکن، بہرحال یہ نجی مصائب ہیں، وہ ذاتی رنج و غم جن سے ہم میں سے بیشتر کو سابقہ پڑتا رہتا ہے ۔ جب جنگ لوگوں کی زندگی کا جزو بن جاتی ہے تو یہ غم جمع ہوکر ایک عام، قومی المیہ بن جاتے ہیں ۔ ہمارے اپنے ذاتی المئے عوام کی مصیبتوں پر جن کے بارے میں کوئی ادیب، کوئی فنکار ابھی دنیا کو باخبر نہیں کر سکا ہے، غالب نہیں آ سکتے ۔ ،،

شولوخوف نے لکھا تھا کہ اپنے ہاتھ خون آلود کئے بغیر اس جنگ سے نکل کر آنا غیر ممکن تھا ۔ جنگ کا مطالبہ پسینہ تھا، خون تھا ۔ اگر انکار کیا جاتا تو وہ دگنی قیمت وصول کر لیتی ۔ پس وپیش کا انجام ناقابل تلافی نقصان ہوتا ۔ اور ان الفاظ میں جو صفحہ قرطاس پر رہتی دنیا تک کے لئے ثبت ہو چکے ہیں : ”آپ نے اپنے جگر گوشوں کا خون اپنے گھر کی دہلیز پر بہتے نہیں دیکھا ہے ۔ میں نے دیکھا ہے اور اس لئے مجھے آپ سے اس طرح دو ٹوک بات کرنے کا حق پہنچتا ہے ۔ ،،

قلمکار اولگا برگھولتس نے تاریخ کے لئے — ہماری قوم کی تاریخ، ادب کی تاریخ اور انجام کار نوع انسانی کی تاریخ کے لئے — اس مختصر تقریر کو محفوظ کر لیا ہے جو شولوخوف نے محاصرے کے دوران میں سورما شہر لینن گراد کے بیٹیوں اور بیٹوں کے لئے نشر کی تھی : ”ہمارے لینن گراد کے ساتھیو ! ہمیں معلوم ہے کہ دشمن کے محاصرے میں رہتے ہوئے آپ کے لئے زندگی بسر کرنا، کام کرنا اور لڑنا کتنا دشوار ہے ۔ لوگ آپ کو ہر جگہ — ہر محاذ پر اور عقب میں یاد کرتے ہیں ۔ دورافتادہ یورال میں فولادساز مزدور کو پگھلی ہوئی دھات بہتی دیکھ کر آپ کی یاد آتی ہے اور وہ بلامہلت کام کئے چلا جاتا ہے تاکہ آپ کی نجات کی گھڑی قریب آ جائے ۔ لڑائی کے مورچے پر، ڈانباس میں جرمن حملہ آوروں پر وار کرنےوالا فوجی ان کو صرف اپنے تباہ و برباد یوکرین کی خاطر ہی نہیں

بجانب ہوں گے : افسانہ ''نفرت کی سائنس،، جب پہلی بار شائع ہوا تو مصنف نے اس کو کسی خاص صنف تحریر سے مخصوص نہیں کیا تھا — بجائے خود اس بات نے اجازت دیدی تھی کہ اسے ہمعصر انشائیہ تحریروں میں شامل کر لیا جائے ۔ بہرحال افسانہ خود خاصیتی اعتبار سے اس قدر پرزور انشائیہ‌انداز کا ہے کہ اس کے بغیر شولوخوف کی دوران‌جنگ کی انشائیہ تحریروں کا مجموعہ ناسکمل معلوم ہوگا ۔ حقیقت یہ ہے کہ ''نفرت کی سائنس،، کے بغیر ایسے مجموعے کا تصور بڑا ہی دشوار ہے ۔)

جنگی نامہ‌نگار کی حیثیت سے شولوخوف نے اپنا ایک خاکہ یوں شروع کیا تھا : ''پینسلوں، نوٹ بکوں اور ہلکی مشین گنوں سے مسلح ہو کر ہم ایک کار میں بیٹھ کر اگلی صف کے مورچے پر پہنچے...،، اپنے ''امریکی دوستوں کے نام ایک خط،، میں جو انہوں نے جنگ کے دوسرے سال کے آخری دنوں میں لکھا تھا، وہ کہتے ہیں : ''جنگی نامہ‌نگار کی حیثیت سے میں جنوبی، جنوب مغربی اور مغربی محاذوں پر گیا تھا ۔ ،، شولوخوف کی انشائیہ تحریروں میں اس ''خط،، کو بڑا اہم مقام حاصل ہے ۔ اس میں انہوں نے اپنے امریکی قارئین کو بتایا ہے کہ وہ حب‌الوطنی کی جنگ‌عظیم کے بارے میں ایک ناول لکھ رہے ہیں جسکا نام ''وطن کے مجاہد،، ہوگا جس میں وہ اس بوجھ کی تفصیل بیان کرنا چاہتے ہیں جو جرمن نازی حملے کے خلاف لڑائی میں سوویت عوام کے کندھوں پر آن پڑا ہے ۔ اس دوران میں، جبکہ ناول ابھی ناتمام تھا وہ چاہتے تھے کہ اپنے امریکی دوستوں سے ایک ادیب کی طرح نہیں بلکہ اتحادی ملکوں میں سے ایک ملک کے محض ایک شہری کی طرح خطاب کریں ۔

آج سے ہزار دو ہزار برس بعد مورخ جنگ کی — جو اس وقت تک ایک معدوم مظہر بن چکی ہوگی — نوعیت کا مطالعہ کرتے ہوئے، یہ الفاظ پڑھتے ہوئے غالباً وفور جذبات سے دم گھٹتا ہوا محسوس کریں جو معنوی اور مجازی دونوں اعتبار سے سمندر پار کے ایک ملک کے ادیب نے دوسرے ملک کے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہے تھے ۔ شولوخوف نے لکھا تھا : ''ہم میں سے ہر ایک کی زندگی میں جنگ ان تمام شدتوں کے ساتھ داخل ہو گئی ہے جو ایک قوم کی دوسری قوم کو صفحۂ‌ہستی سے مٹا دینے، نگل جانے کی کسی کوشش سے مخصوص ہوتی ہیں ۔ محاذ جنگ پر جو کچھ ہو رہا ہے، جنگ کامل میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہم سب کی زندگی پر ایک انمٹ نقش چھوڑ چکا ہے ۔ میں اپنی ماں کو کھوچکا ہوں جو ہمارے گاؤں پر جسکی جنگی اعتبار سے قطعی کوئی اہمیت نہیں

جذبات، پارٹی اور عوام کے مفادات سے ان کی گہری عقیدت اور اس طرز کی سادگی جس میں عام فکروں کا اظہار کیا گیا ہے، ان مضامین کو قارئین کے وسیع ترین حلقوں کے لئے قابل فہم بناتی ہے۔ اپنے کروڑوں قارئین کو مخاطب کرتے ہوئے ادیب وہ باتیں کرتا ہے جو ذاتی طور پر اس سے متعلق ہوتی ہیں، قارئین کو اپنے خلوص سے اپنا ہمخیال بنا لیتا ہے اور پراثر تشبیہوں اور استعاروں سے جو شولوخوف کی طرزنگارش کا خاصہ ہیں اپنے بیان کے تاثر کو گہرا کر دیتا ہے۔

شولوخوف کی مابعد جنگ کی انشائیہ تحریروں میں امن کےلئے جدوجہد کے، سوشلسٹ، مجاہدانہ انسان‌دوستی کے موضوعات روزافزوں اصرار کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں غضب کا تنوع ہے۔ یہی کیفیت ان کو پیش کرنے کے انداز اور اسباب کی ہے۔ لیکن ان کی فلسفیانہ استقامت، ان کے رویے اور ان کے راہنما اصولوں کی وضعداری میں سرمو فرق نہیں آتا۔

''اک بات مادروطن کی،، وہ مضمون ہے جو عنوان کے قدرے حزینہ لہجے سے پوری مطابقت رکھتا ہے اور حق تو یہ ہے کہ شولوخوف کی انتہائی پرزور انشائیہ تحریروں میں سے ہے۔ یہ مضمون ۱۹۴۸ء میں لکھا گیا تھا جبکہ اس خون آشام جنگ کی جسکو ختم ہوئے تین برس سے بھی کم عرصہ ہوا تھا، یادیں ابھی تازہ تھیں۔

اس قدر تحکمانہ انداز میں، اس قدر بےدردی کے ساتھ ادیب ہمیں کیوں مجبور کرتا ہے کہ جو گزر چکا ہے اس کو اپنی آنکھوں کے سامنے پھر سے زندہ ہوتے دیکھیں، اس کو پھر سے بھگتیں جسے پہلے بھگت چکے ہیں، وہ ان زخموں کو پھر سے کیوں ہرا کرنا چاہتا ہے جو اب مندمل ہو چکے ہیں؟ جواب سادہ ہے: اس لئے کہ جسے فراموش نہ کرنا چاہیئے، اسے لوگ اس وقت تک فراموش نہ کریں جب تک دنیا دو ڈیروں میں تقسیم ہے۔ تاکہ لوگ امن کی جدوجہد کی پوری اہمیت کو محسوس کریں اور وہ سبق نہ بھولیں جو جنگ کے دوران میں انہیں نفرت کی سائنس نے سکھایا ہے۔ تاکہ امن کے دشمنوں سے نفرت ان کے دل میں زندہ رہے، ان لوگوں سے نفرت جو ''اپنی شیطانی، اندھی حماقت میں نوع انسانی کو جو ایک ہیبتناک تجربے سے اپنے ہوش بجا نہیں کر پائی ہے، ایک نئی جنگ کے جہنم میں جھونکنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔،، کیونکہ وہ وقت ابھی تک نہیں آیا ہے جبکہ ہم نئی جنگوں کے اندیشے کو فراموش کر سکیں: اس لئے جنگوں کے شعلے بھڑکانےوالوں کے خلاف نفرت

مار گراتا بلکہ ان بے پناہ مصیبتوں کے لئے بھی جو دشمن نے، لینن گرادوالو، آپ کو پہنچائی ھیں... ھم اس گھڑی کا بےچینی سے انتظار کر رھے ھیں جب محاصرہ ٹوٹ جائیگا اور عظیم‌الشان سوویت دیس، لینن گراد کے — سراپا اور ابدی شان کے شہر کے — بہادر بیٹوں اور بیٹیوں کو اپنے گلے لگا لےگا۔ ،،

۱۳ مئی ۱۹۴۵ء کو ’’پراودا،، نے ایک مضمون بعنوان ’’وہ فتح جسکی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی،، شائع کیا۔ شولوخوف نے لکھا تھا کہ اگر تاریخ‌عالم میں اس سے زیادہ خون‌آشام اور تباہ کن جنگ جو ۱۹۴۱ء — ۱۹۴۵ء میں ھوئی تھی، پہلے کبھی نہیں ھوئی تھی تو یہ بھی حقیقت ھے کہ کسی بھی فوج نے اتنی شاندار فتوحات حاصل نہیں کیں جتنی سوویت فوج نے، اور نہ ھی شان و شوکت، قوت و عظمت کی اس تابناکی کے ساتھ حیران‌و‌ششدر نوع انسانی کے سامنے نمودار ھوئی۔ ،،

شولوخوف کی بحیثیت مجموعی انشائیہ تصانیف یا بحرحال اس کی زیادہ نمایاں مثالوں کے تخلیقی انداز کی بعض لازمی خصوصیات جو ان کی شان امتیازی ھے، جنگ کے زمانے کے مضمونوں اور خاکوں میں واضح طور پر نظر آتی ھیں۔ وہ سب فوری، اھم ترین مسئلوں پر لکھے گئے۔ ان سب میں ان خوبیوں کا نامیاتی امتزاج ھے جو عموماً رزمیہ ادب سے وابستہ کی جاتی ھیں — عوام کی زندگی مرتب کرنےوالے واقعات پر وسیع پیمانے کی گرفت اور اس کے ساتھ ھی ساتھ اس کے ھیروؤں کی، عوام کی داخلی زندگی کے عناصر کی مفکرانہ، مرتکز بصیرت جو تاریخی واقعات میں حصہ لیتے اور ان کی تخلیق کرتے ھیں۔ ایک خفیف سے، پھر بھی صاف نظر آنےوالے، لمس سے شولوخوف کسی بیان یا قصے میں، کسی خاکے، یہاں تک کہ اخباری مراسلے میں جان ڈال دیتے ھیں۔ ممکن ھے یہ خود مصنف کا چشمدید واقعہ ھو یا کسی فرد کے مقدر یا طرزعمل میں کوئی مثالی چیز جس سے درحقیقت سوویت کردار کے عام خدوخال ابھر آتے ھوں۔

اپنے وطن کی زندگی کے اھم‌ترین واقعات‌وحوادث کے متعلق — عصری حقیقت کے ان پہلوؤں کے متعلق جو لوگوں کے دل‌ودماغ کو سب سے زیادہ متاثر کرتے ھیں — شولوخوف کے مضامین اس رویے کا جو کسی سوشلسٹ ملک کا باشندہ ان مسئلوں اور واقعوں کے بارے میں اختیار کرتا ھے اور اس تشخیص کا بھی جو وہ ان کے بارے میں کرتا ھے، ھمیشہ نہایت وضاحت کے ساتھ اظہار کرتے ھیں۔

ان تحریروں کا شستہ‌انداز فکر اور تشخیصی بصیرت، ان کا فروغ

ادیبوں کی دوسری کل‌یونینی کانگرس میں تقریر کرتے ہوئے شولوخوف نے پارٹی جذبے کی جو سوویت فنکاروں کی کرداری خصوصیت میں شامل ہوتا ہے کلاسکی تعریف پیش کی۔ ''غیرممالک میں ہمارے کینہ پرور دشمن الزام لگاتے ہیں کہ ہم، سوویت ادیب پارٹی کے حکم پر لکھتے ہیں۔ صورت حال واقعی مختلف ہے کیونکہ ہم میں سے ہر ایک اپنے دل کے کہنے پر لکھتا ہے — اور ہمارے دل پارٹی اور عوام کے ہوتے ہیں جنکی ہم اپنے فن سے خدمت کرتے ہیں۔ ،، سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگرس میں شولوخوف کی تقریر نہ صرف گہرے جذبات سے لبریز ہے بلکہ ایک شہری کی حیثیت سے سوویت ادیب کے نقطۂ نظر کا لب‌لباب بھی: ''ہم سب اپنی عظیم کمیونسٹ پارٹی کی اولاد ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک، پارٹی کے بارے میں سوچتے ہوئے نہایت ہی جذباتی انداز میں اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہتا ہے: 'تم ہماری ماں کی طرح ہو، تم نے ہمیں پروان چڑھایا، تم نے ہمیں آہن‌پیکر فولاد بدن بنایا، تم ہمیں زندگی کی واحد سچی شاہراہ پر لئے جا رہی ہو۔ ' ،،

پارٹی کی بائیسویں کانگرس میں شولوخوف کی تقریر فنکار کے تخلیقی جذبے اور اپنے کرداروں سے مصنف کے تعلق کے بارے میں ہے:

''فنکار بوقت تخلیق سرد کیسے رہ سکتا ہے! اگر آپ کا خون مچھلی کے خون کی طرح ٹھنڈا ہو اور دل پر چربی کی اتنی تہیں جم چکی ہوں کہ اس میں تڑپ باقی نہ رہی ہو تو آپ کوئی ادبی تخلیق نہ کر سکیں‌گے، اور قارئین کے دلوں تک پہنچنے کا راستہ آپ کبھی بھی تلاش نہ کر پائیں‌گے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ جب کوئی ادیب لکھ رہا ہو تو خون اس کی رگوں میں جوش کھا رہا ہو، میں چاہتا ہوں جب وہ دشمن کے بارے میں لکھ رہا ہو تو فرط نفرت سے اس کا چہرہ زرد پڑ جائے، میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے کرداروں کے ساتھ جنہیں وہ تخلیق کرتا ہے، جن سے وہ محبت کرتا ہے جو اس کو عزیز ہوتے ہیں، ہنسے اور روئے۔ صرف اس طرح ہی حقیقی فن‌پارہ تخلیق ہوگا جعلی نہیں۔ ،،

رسالہ ''انوسترانایا لتیراتورا،، میں شولوخوف نے جو خط لکھا تھا اس کا غیرممالک کے ادیبوں میں بڑا خیرمقدم ہوا۔ اس میں انہوں نے تجویز رکھی تھی کہ ساری دنیا کے ادیبوں کی ''گول میز،، قائم کی جائے۔ اس کا قیام ممکن ہوگا کیونکہ اگرچہ ان کے خیالات مختلف ہیں لیکن کار آمد ہونے کی دلی خواہش مشترک ہے جو ان کو متحد کرتی ہے۔

بعض حلقوں میں یہ خیال زور پکڑتا جا رہا ہے کہ ادب کی ایک

''کا سیلاب همارے دلوں میں کئی گنی شدت کے ساتھ ان کے خلاف ٹھاٹھیں مارےگا جن کا انسانوں کی زبان میں کوئی نام نہیں ھے، ان کے خلاف جن کی هوس کو ان منافعوں سے تسکین نہیں هوئی هے جو کروڑوں کے خون سے حاصل هوئے هیں... وقت پر وہ کام آئےگی!،،

اس مضمون میں، جیسا کہ شولوخوف کا معمول ھے، محبت اور نفرت کے موضوع نہ صرف پہلوبہ پہلو موجود هیں بلکہ خلطملط هیں۔ مادر وطن کی محبت اس کے دشمنوں سے نفرت پیدا کرتی ھے جبکہ فرد واحد اور عمومی طور پر نوع انسانی سے محبت اس کو مغلوب کرنےوالوں کے خلاف جو انسان سے کمتر هوتے هیں، نفرت کے جذبے کو ابھارتی ھے۔

مصنف نے ''اک بات مادر وطن کی،، کو ایک ذریعہ بنایا ھے جس میں نمایاں امتیازات کے ذریعے دکھایا ھے کہ سوویت عہدحکومت کے دوران میں همارے ملک کے محنت کش عوام کی زندگی کس طرح بدل گئی ھے، معیشت میں، لوگوں کی زندگی اور کردار میں تغیرو تبدل کتنا عظیمالشان هوا ھے۔ شولوخوف نے کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں لکھا ھے جس نے بہادرانہ جدوجہد کی خوبیوں کو لوگوں میں پروان چڑھایا، اور جن کو وہ اپنی رهنمائی میں بےنظیر ترقی کی جانب لے گئی۔ وہ ''واحد منصفانہ نظامحکومت،،، سوویت حکومت کا ذکر کرتے هیں جس کو لوگوں نے ''برسوں صعوبتیں برداشت کر کے اور عظیم انقلابی جدوجہد کے بعد حاصل کیا ھے... اور اپنے خون پسینے سے جسکو مستحکم کیا ھے،، اور اس حکومت پر همارے عوام کی غیرمتزلزل اعتماد کی بات کرتے هیں۔

اسپین، کوریا، ویت نام میں رونما هونےوالے واقعات سے شولوخوف ایک انساندوست ادیب کی حیثیت سے اپنے ردعمل کا اظہار کرتے هیں ... سامراجیوں اور ان کے جرائم کے خلاف اپنے حملوں کی شدت میں ان کی انشائیہ تحریریں مناظرے کا لب و لہجہ اختیار کر لیتی هیں۔

جدید دنیا میں فنکار کا مقام اور اس کا کردار، ادیب کا فرضمنصبی، اپنے عوام کے سامنے ادیب کی ذمہداری اور نوع انسانی کا مستقبل وہ موضوعات هیں جو شولوخوف کی بہت سی تحریروں اور تقریروں میں فطری طور پر آجاتے هیں۔ پارٹی کانگرسوں، ادیبوں اور ادب کے عالموں کے جلسوں میں ان کی تقریروں کا بڑا حصہ انہیں موضوعات پر وقف هوتا ھے اور انہیں کو وہ اپنے ان مضمونوں اور انشائیوں میں اٹھاتے هیں جو وہ آج کے ترقیپسند کلچر کی سرکردہ شخصیتوں اور ممتاز سماجی هستیوں کے بارے میں سپرد قلم کرتے هیں۔

بعد میں، اسٹاک ہام میں ''نوبل ہفتے،، کے دوران ناول کے سوال پر انہوں نے پھر اظہارخیال کرتے ہوئے اس صنف اور تذکرے کے حقیقت‌پسندانہ طریقے کے درمیان رشتوں پر زور دیا۔ شولوخوف نے کہا کہ ناول ہی ادیب کو اس بات کا امکان فراہم کرتا ہے کہ وہ ممکن حد تک وسیع‌ترین گیرائی اور گہرائی کے ساتھ دنیا کی حقیقت کا احاطہ کرے اور اس کے متعلق اپنے بیان میں زندگی اور اس کے اشد ضروری مسئلوں کے بارے میں خود اپنے اور اس کے نظریات سے اتفاق کرنےوالے لوگوں کے رویے کا عکس پیش کرے۔ شولوخوف نے کہا کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناول ہمیں حقیر سے ''واحد متکلم،، کو مرکزکائنات کی حیثیت سے پیش کرنے کی جانب راغب کرنے کے بجائے اس زندگی کے بارے میں جو ہمارے اطراف‌وجوانب میں پھیلی پڑی ہے، زیادہ گہرائی کے ساتھ سمجھنے کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس صنف کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ حقیقت‌پسند ادیب کو وسیع‌ترین امکانات فراہم کر دیتی ہے۔

''جدیدی،، ادب پر — یعنی حد سے زیادہ فیشن‌ایبل تجربات خصوصاً جو ہیئت کے سلسلے میں کئے گئے ہیں — شولوخوف کے اظہار خیال غیرممالک میں بہت سے لوگوں کی توجہ کا خاص طور سے مرکز بنا۔ انہوں نے اس اصطلاح کو یہ معنے پہنانے کی مخالفت کی اور کہا کہ ان کی اپنی رائے میں سچے جدیدی وہ ادیب ہوتے ہیں جو اپنی تخلیقات میں وہ نئے معنے اجاگر کرتے ہیں جن سے ہمارے دور کی زندگی لبریز ہے اور جو آج کی کرداری خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ اپنی تقریر کے دوران میں شولوخوف نے ان اہم‌ترین مسئلوں پر بھی اپنے رویے کا اظہار کیا جو آج کے ادب کے ارتقا کے دوران پیدا ہو گئے ہیں جن میں سوشلسٹ حقیقت پسندی کے اصول، عوام کے روبرو ادیب کی ذمہ‌داری، جدید دنیا میں ادیب کا مقام اور ادب اور فن کے فرائض عظیم بھی شامل ہیں۔

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی تیئیسویں کانگرس میں انہوں نے جو تقریر کی تھی اس میں انہوں نے ان مسئلوں پر پھر روشنی ڈالی تھی:

''بڑے بڑے، نمائندہ اجتماعات میں مصنفوں، صحافیوں اور اخبار نویسوں سے مجھے بارہا تبادلۂخیالات کرنے کا موقع ملا ہے کہ سماج کی زندگی میں مصنف کا کیا کردار ہوتا ہے۔ پچھلے سال نوبل انعام کی تقسیم کی رسم کے دوران میں اسٹاک ہام کے ٹاؤن ہال میں جو تقریر میں نے کی تھی اسکا بڑا حصہ اسی موضوع پر مشتمل تھا۔ سامعین موجودہ اجتماع سے بنیادی طور پر مختلف تھے۔ اور اسی لئے اپنے خیالات کو جن الفاظ کا میں

صنف اور ادبی ہیئت کی حیثیت سے ناول بس اب مٹنے ہی والا ہے۔ ادیبوں کی یورپی کمیٹی کی کارروائیوں میں شرکت کرتے ہوئے شولوخوف نے اس کا ذکر چھیڑا اور اپنی تقریر میں شدید مناظراتی لہجہ پیدا کیا، اگرچہ ویسے وہ اپنا ذاتی نقطۂ نظر پیش کر رہے تھے۔ انہوں نے دانشمندانہ پیرائے اور نہایت پروقار انداز میں تقریر کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ سوال اٹھانے کا خود تصور ھی کس قدر بےمعنی اور مصنوعی ہے۔ انہوں نے اپنے سامعین کو آگاہ کیا ''اگر کوئی تختوں پر رندہ کرنا اور ناول کو دفن کرنے کے لئے تابوت بنانا شروع کرےگا،، تو وہ اس صورت میں پھر تقریر کرنے کا اپنا حق محفوظ رکھنے کا اعلان کرتے ھیں۔ ''میرے لئے تو یہ سوال کہ ''ناول ہوگا یا نہیں ہوگا،، سرے سے اٹھتا ھی نہیں، عین اسی طرح جس طرح کسان کے لئے یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنا کھیت بوئے یا نہ بوئے۔ معاملہ اگر کسان کا ہو تو سوال اس طرح کیا جا سکتا ہے: ''بہتر فصل کاٹنے کے لئے کھیت بہترین طریقے سے کیسے بویا جائے؟،، میرے لئے بھی معاملہ عین یہی ہے اور سوال یہ ہے کہ: اپنے ناول کو اتنا اچھا کیسے بناؤں کہ واقعی وہ میری قوم کی اور میرے قارئین کی خدمت اعزاز کے ساتھ انجام دے؟،،

بعد میں شولوخوف نے ایک ادیب کی حیثیت سے اپنے لئے اور عصر حاضرہ کے ادب کی ایک صنف کی حیثیت سے ناول کی اہمیت پر اپنے نظریات کی مزید توضیح کی۔ یہ معلوم ہونے پر کہ ۱۹۶۵ء کا ادب کا نوبل انعام ان کو ملا ہے، ''پراودا،، کے نامہ‌نگار سے ایک انٹرویو میں انہوں نے کہا تھا اگرچہ اس انعام سے قدرتی طور پر انہیں بڑی مسرت ہوئی ہے لیکن یہ بات وہ قطعی طور پر واضح کر دینا چاہتے ھیں کہ یہ ایک فرد کا، ایک پیشہ‌ور ادیب کا وہ اطمینان نہیں ہے جو اس کی تخلیقات کی بین‌الاقوامی تعریف‌وتوصیف اور قبولیت سے حاصل ہوتا ہے۔ ان پر جن جذبات کا غلبہ تھا وہ بلکہ اس خوشی کے تھے کہ وہ، خواہ محدود پیمانے پر ھی سہی، اپنے ملک کی پارٹی کی جس میں رہ کر انہوں نے اپنی آدھی سے زیادہ زندگی گزاری اور سوویت ادب کی شان دوبالا کرنے میں ممدومعاون ہو رہے ھیں۔ آگے چل کر انہوں نے کہا کہ مجھے شعوری طور پر اس اطمینان کا احساس ہے کہ ''اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول کی صنف نے جس کے دور جدید میں خود وجود ھی کو بعض ادبی شخصیتیں جائز تصور کرنے پر شبہات کا اظہار کر رھی تھیں، اپنی ہستی کا جائز ہونا ثابت کر دیا ہے۔،،

2*

بیدار کرتے ھیں، انسان کے لئے، نوع انسانی کے لئے اور قوموں کی آزادی اور اخوت کے نور کے لئے، سامراجی بربریت کی ظلمت کے خلاف جہاد کے عزم واستقلال کو تقویت پہنچاتے ھیں۔ ،،

اگست ۱۹۶۸ء میں تاشقند میں منعقدہ ایک بین الاقوامی ادبی مباحثے میں شرکت کرنےوالوں کو شولوخوف کا ایک تار ملا جس میں انہوں نے اهل قلم کو دعوت دی تھی کہ وہ ساری دنیا میں امن اور ترقی کے نیک مقاصد کی خاطر باھم اشتراک عمل کریں۔

اس سے دو سال قبل فرانسیسی سیاحوں کی ایک ٹولی نے ماسکو میں ''نووستی پریس ایجنسی،، کے دفتر میں شولوخوف سے ملاقات کی تھی۔

انہوں نے ان لوگوں سے کہا تھا: ''ھمارے دونوں ملکوں کے درمیان جو وسیع پیمانے پر تعاون ھو رھا ھے اس سے مجھ کو قلبی اطمینان ھے۔ ،،

''میں ڈان کا کاسک ھوں۔ ڈیڑھ صدی قبل ڈان کے کاسک پیرس پہنچے تھے۔ چونکہ وہ انگور کی کاشت کرتے تھے اس لئے وہ انگور کی بیلیں وھاں سے لیکر آئے تھے اور ان بیلوں نے ڈان کی سرزمین میں جڑ پکڑلی ھے۔ آپ کی جانب میرے ھموطنوں کا رویہ نہایت گرمجوشی کا ھے۔،،

سیاحوں نے شولوخوف سے پوچھا کہ ان کا پسندیدہ فرانسیسی ادیب کون ھے تو انہوں نے جواب دیا تھا:

''اس طرح کے سوالوں کا جواب دینا ھمیشہ بہت مشکل ھوتا ھے۔ جو وفات پا چکے ھیں ان کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا جانا چاھیئے۔ جو زندہ ھیں ان کے بارے میں جھجک ھوتی ھے۔ لیکن حق یہ ھے کہ روسی ادب، روسی ادب عالیہ نے آپ سے تعلقات کے باعث بہت کچھ حاصل کیا ھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو مالامال کیا ھے۔ تالستائی اور استیندھال کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ماضی میں ھمیں بہت کچھ دیکھنا پڑا ھے... پچھلی جنگ، نازی جرمنی سے جنگ ایک مشترک جنگ تھی اور فرانسیسی اور سوویت عوام کا ایک ساتھ جو خون بہا تھا وہ ھماری قوموں کو واقعی ایک دوسرے کے قریب لے آیا تھا۔ ،،

اور سوویت ادب کی سب سے بڑی خوبی شولوخوف کسے گردانتے ھیں؟

''سچائی۔ اپنی سوویت تاریخ کے پورے عرصے میں ھم نے اعتماد وحقیقت سے کام لیا ھے۔ میں بلاخوف خودستائی یہ سمجھتا ھوں کہ ھم نے بہت کچھ حاصل کر لیا ھے۔ ،،

نے روپ دیا تھا وہ بھی اسی مطابقت سے مختلف تھے۔ خیال رہے، ہیئت میں، ماهیت میں نہیں۔

''کمیونسٹ کہیں بھی، خواہ کسی زبان میں کیوں نہ بولے وہ ہمیشہ کمیونسٹ ہی کی حیثیت سے بولتا ہے۔ بعضے ایسے بھی ہیں جنہیں ممکن ہے یہ پسند نہ ہو مگر حلق سے انہیں اتارنا ہی پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں یہی وہ خوبی ہے جس کا ہر جگہ احترام کیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں بھی جلسۂعام میں کوئی سوویت فرد تقریر کرے اس کو سوویت محب وطن کی حیثیت سے بولنا چاہیئے۔ سماج کی زندگی میں مصنف کے کردار کی تعریف بیان کرتے ہوئے ہم کمیونسٹوں کی حیثیت سے، اپنی عظیم مادر وطن کے بیٹوں کی حیثیت سے، ایک ایسے ملک کے باشندوں کی حیثیت سے جو کمیونسٹ سماج کی تعمیر کر رہا ہے، اپنی پارٹی کے اور اپنے عوام کے انقلابی انسان‌دوست نظریات کے ترجمانوں کی حیثیت سے بات کرتے ہیں۔''

سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی چوبیسویں کانگرس میں تقریر کرتے ہوئے شولوخوف نے کہا تھا: ''تہذیبی ارتقاء کے عالمی عمل میں سوویت ادب اور فن جو مجاهدانہ کردار ادا کرتے ہیں اس کا سب سے پہلے تعین اس کمیونسٹ نظریے اور جانب‌داری سے ہوتا ہے جو ہمارے فنکاروں کی بہترین تخلیقات میں رچے ہوئے ہوتے ہیں۔''

سوشلسٹ اور انقلابی انسان‌دوستی کے جوہر سے متعلق مسئلے شولوخوف کی حالیہ انشائیہ تحریروں میں بارہا پیش پیش نظر آئے ہیں۔ ۱۹۶۶ء میں ادیبوں کا ایک جلسہ باکو میں منعقد ہوا تھا۔ اس کے نام اپنے ایک خط میں انہوں نے لکھا تھا: ''انسان دوست وہ شخص ہوتا ہے جو جہاد کرتا ہے، جو قاتل کا ہاتھ پکڑ لینے اور اس کے بد ارادوں کو ناکارہ کر دینے میں مدد دیتا ہے۔'' سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے انہوں نے لکھا تھا کہ انسان‌دوستی اور انسان اور نوع انسانی سے محبت کے تصورات کی مختلف لوگ نہایت مختلف تعبیریں پیش کرتے ہیں جن کا انحصار ان سماجی قوتوں پر ہوتا ہے جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ اپنے کمیونسٹ اعتقادات کے مطابق سوویت ادیبوں کا کہنا ہے کہ وہ شخص جو قتل یا غارتگری کے بدقسمت شکار پر ترس کھانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا، جو صرف ماتم کرتا ہے کہ دنیا میں قتل‌وخون کا اب بھی وجود ہے، انسان‌دوست نہیں ہوتا۔ اس خط میں زور دیکر واضح کیا گیا ہے کہ ''ہماری قوت، ادیبوں کی قوت ہے۔ وہ ہمارے پرجوش الفاظ میں مضمر ہوتی ہے جو لوگوں کے دل‌ودماغ پر چھا جاتے ہیں، انسانی قوتوں کو

بھیڑ کے پاس سے گزرتے ہوئے کوئی بھی بوڑھا آدمی ایک لمحے کے لئے ضرور ٹھیر جائیگا اور اکارڈین کی دھن سنتے ہوئے اور خوش‌وخرم نوجوان چہروں کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے اپنی عمر کئی برس چھوٹی محسوس کرنے لگ جائیگا۔ میں بھی، پیارے قارئین، تمہارے بارے میں صرف سوچ کر ھی خود کو نوجوان محسوس کرنے لگتا ھوں اور کچھ افسردہ بھی کیونکہ میں تینتیس کا ھو چکا ھوں اور تمہارے شاندار جشن میں تو خاصا بوڑھا نظر آؤں گا۔ ،،

قزاخستان کے ادیبوں کی تیسری کانگرس میں اپنی تقریر کے خاصے بڑے حصے میں شولوخوف نے نوجوان ادیبوں کی تربیت اور اس بات کی ضمانت کرنے کے مسئلوں پر وقف کیا کہ انہیں تخلیقی طور پر کام کرنے کا موقع میسر آئے۔ مصنف کی باتوں میں ان لوگوں کے بارے میں پدرانہ فکرمندی رچی ہوئی تھی جنہوں نے ابھی پہلے ھی قدم بڑھائے تھے۔ پھر بھی جن نظریات کا انہوں نے اظہار کیا تھا ان میں مروت سے کسی طرح کام نہیں لیا گیا تھا اور بہت سے سامعین ان کی تقریر کے حاوی پیکر سے حیران‌وششدر رہ گئے تھے جو ایک ایسے ادیب کی خصوصیت کو ظاھر کر رھی تھی جسکی تصنیف کی بلندپرواز اشاریت طرہ استیازی ھے :

''ایک دفعہ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ سنہری شاھین اپنے بچوں کو اڑنا کیسے سکھاتا ھے۔ وہ ان کو پہلے تو اپنے پر مارکر اڑاتا ھے اور پھر نیچے اترنے نہیں دیتا بلکہ اوپر اور اوپر پرواز کرنے پر مجبور کرتا ھے اور اس وقت تک اڑاتا رھتا ھے جب تک کہ وہ تھک کر بےدم نہ ھو جائیں۔ صرف اس طرح سے ھی سنہری شاھین کے بچے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنا سیکھ پاتے ھیں... اپنے نوجوان مصنفوں کو سکھانے کا ھمیں یہی طریقہ اپنانا چاھیئے، انہیں بلند سے بلندتر پرواز کرنے پر مجبور کرنا چاھیئے تاکہ انجام‌کار وہ ادب کے حقیقی شاھین بن جائیں اور بھیگے کوے یا پالتو مرغیاں نہ بنیں۔ لیکن سنہری شاھین پہلی کوشش میں مطلوبہ بلندیوں تک پرواز نہ کر سکنے یا اس سے خوفزدہ ھونے پر اپنے بچوں کے پر توڑ نہیں ڈالتا۔ نقادوں کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ ابھرتے ہوئے مصنفوں کے پر توڑ ڈالیں۔ ،،

نوجوان کمیونسٹ لیگ کی تیرھویں کانگرس کو شولوخوف نے جو پیغام بھیجا تھا اس میں جو ترنم ھے اس کو نثری نظم کہیں تو بےجا نہ ھوگا۔ یہ ''کومسومولسکایا پراودا،، میں شائع ھوا تھا۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں :

نوجوانوں کے مسائل سے شولوخوف کا
مسلسل اور گہرا تعلق

شولوخوف کی شروع کی انشائیہ تحریروں میں ان کی دلچسپی کے دو بنیادی شعبے فوری طور پر واضح ہو گئے۔ ایک تو بہت سے اہم عصری مسائل سے دلچسپی جن میں ہماری معیشت اور اجتماعی کاشتکاروں کی فوری ضرورتیں بھی شامل ہیں اور دوسرے تہذیب کے عام مسائل جن میں ادب اور فن بھی شامل ہیں۔ ان دونوں شعبوں کو ''زندگی'' اور ''ادیب'' کے ایسے دو عنوانوں کے تحت لایا جا سکتا ہے جن کا ایک دوسرے پر بنیادی انحصار ہوتا ہے۔ لیکن جیسے کہ ہم دیکھ چکے ہیں جنگ نے ان دو بنیادی دلچسپیوں سے شولوخوف کی توجہ بانٹ دی اور انہوں نے مضمونوں کا وہ سلسلہ شروع کر دیا جن میں محبت یا نفرت کا جذبہ غالب تھا: سوشلسٹ مادر وطن سے محبت اور اس کے دشمنوں سے نفرت۔ یہ وہ انشائیہ تحریریں تھیں جو براہ راست جنگ کے واقعات اور بعد میں، جنگ ختم ہو جانے کے بعد، ساری دنیا میں امن کے لئے جد و جہد کا اثر قبول کرکے معرض‌وجود میں آئیں۔

جنگ کے بعد شولوخوف نے جو انشائیہ مضامین سپرد قلم کئے ان میں وہ پہلے کے بنیادی موضوعات پر واضح طور سے واپس آتے ہیں۔ نوجوانوں سے متعلق، ایک نسل سے دوسری نسل کو دست‌بدست ملنےوالی روایات سے متعلق، باصلاحیت نوجوانوں کی کمیونسٹ اور حب‌الوطنی کی تربیت سے متعلق موضوعات کا زیادہ واضح اور معین مقام دکھائی دیتا ہے۔ پچھلے کچھ برسوں میں نوجوانوں سے ان کے ذاتی تعلقات زیادہ گہرے ہو گئے ہیں اور ان مضامین کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے جن میں انہوں نے سوویت نوجوانوں کے مختلف حلقوں کو مخاطب کیا ہے۔

۱۹۳۸ء تک شولوخوف نے، جبکہ ان کی عمر ابھی ۳۳ برس تھی، افسانوں کے دو مجموعوں، ''اور ڈان بہتا رہا...'' کی تین جلدوں اور ''جب زمین جاگی'' کی پہلی جلد کی اشاعت کے بعد، عالمگیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ ان کا حق اور کسی حد تک فرض تھا کہ وہ بڑے بھائی کی طرح کومسومول کی عمر کے نوجوانوں کو مخاطب کریں:

''پیارے سوویت لڑکو اور لڑکیو!

''کومسومول اپنی بیسویں سالگرہ منا رہی ہے اور یہ ایک ایسا موقع ہے جسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ خوشیاں مناتے ہوئے نوجوانوں کی ایک

پہلا حصہ

زندگی

''تم میری هی گزری هوئی جوانی هو، تم همارے ملک، هماری پارٹی کی حق‌بجانب امید هو! تمهاری کانگرس کے آغاز کے موقع پر میں تمهیں مبارکباد دیتا، تمهیں گلے لگاتا، اور میرے وطن کے مایۂ ناز سپوتو تمهیں اپنے کام، تعلیم اور ذاتی زندگی میں هر طرح کامیابیوں اور خوشیوں سے همکنار هونے کی دعائیں دیتا هوں۔''

اجتماعی کاشتکاروں کی تیسری کل یونینی کانگرس میں شولوخوف نے اپنی تقریر کے آخری حصے میں ایک بار پھر سوویت نوجوانوں کو اپنے وطن کی امید اور مایۂ ناز کہا۔ انہوں نے کہا تھا کہ نوجوان ادیبوں میں بہت سے حقیقی جواهر پارے مل سکتے هیں جن سے قدرتی طور پر اهم تخلیقات کی توقع کی جا سکتی هے۔

شولوخوف کی انشائیه تحریروں کے خصوصی پہلوؤں کے پیش نظر اس مجموعے کو تین حصوں میں ''زندگی''، ''ادیب''، اور ''نوجوان'' کے عنوانوں کے تحت تقسیم کر دیا گیا هے۔

قدرتی طور پر پہلا حصه سب سے زیاده طویل هے صرف موضوعاتی تنوع کی افراط کے سبب سے هی نہیں بلکه جو مسئلے اٹھائے گئے هیں ان کی زبردست اهمیت کے باعث بھی۔ هم اس نتیجے پر پہنچے که اس حصے کی مزید ذیلی تقسیم مثلاً بعنوان ''تخلیقی کام'' اور ''جنگ'' زیاده سودمند نه هوگی۔ دوسرا حصه وسعت کے اعتبار سے بھی دوسرے درجے پر هے۔ تیسرے حصے میں مضامین، تقریریں، پیغامات‌تہنیت شامل کئے گئے هیں جو براه‌راست یا بالواسطه نوجوانوں کے نام یا ان سے متعلق هیں۔

مواد کو مختلف زمروں کے تحت جمع کرنے سے هماری مراد یه هے که اس کتاب سے قاری به‌آسانی استفاده کر سکے۔ لیکن ایک هی تقریر میں شولوخوف اکثر سلسلے‌وار ان مسائل کا احاطه کر لیتے هیں جن کا انسان کی سرگرمی کے مختلف شعبوں سے تعلق هوتا هے۔ کوئی مضمون ممکن هے متعدد عام مسئلوں سے شروع هو اور ختم جاکر ایک پیغام پر هو جو براه راست نوجوانوں کو مخاطب کر کے دیا گیا هو۔ تیسرے حصے میں شولوخوف کی وه تقریریں بھی شامل هیں جو انہوں نے لینن انعام پیش کئے جانے کی تقریب میں، بائیسویں پارٹی کانگرس میں، سوویت ادیبوں کی چوتھی کانگرس میں، اور اجتماعی کاشتکاروں کی تیسری کل‌یونینی کانگرس میں کی تھیں کیوں‌که ان میں سے هر تقریر کا ایک بڑا حصه نوجوانوں، ان کی تربیت، عوام اور تاریخ کے روبرو ان کے فرائض کے متعلق هے کیونکه وهی هماری سوویت ریاست کا مستقبل هیں۔

یو۔ لوکین

ساحل ڈان پر

فوج میں نئے نئے بھرتی ہونےوالے لوگ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ جو انہیں جنگ کے لئے رخصت کرنے آئے تھے، گاؤں کے چوک کی طرف لپکے جا رہے تھے۔ کوئی سات اور دس سال کے دو لڑکے بھاگتے ہوئے سجھ سے آگے نکل گئے۔ ان کے ماں باپ نے بھی مجھے آن لیا اور پھر پیچھے چھوڑ گئے۔ باپ قوی ہیکل، تگڑا جوان تھا، دیکھنے میں ٹریکٹر ڈرائیور معلوم ہوتا تھا، صفائی کا پیوند لگا نیلا چوغہ ڈالے اور صاف دھلی ہوئی قمیص پہنے تھا۔ ماں سنولائی ہوئی رنگت کی نوجوان عورت تھی، بھنچے ہوئے ہونٹ اور سوجی ہوئی آنکھیں گواہی دے رہی تھیں کہ ابھی ابھی خوب رو دھوکر آئی ہے۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے جو کچھ کہا وہ بہت دھیرے سے صرف اپنے شوہر کے سننے کے لئے کہا تھا:

''لو اب پھر ہمارے سر پر آن سوار ہوئے۔ آخر ہمیں چین سے رہنے کیوں نہیں دیتے؟ ذرا تم بھی خوب‌سزہ چکھانا فیدیا، سمجھے؟''

ریچھ نما فیدیا نے پسینے میں شرابور اپنے ھاتھ ایک رومال سے پونچھے جو مشین کے تیل سے کالا اور چکنا تھا، شفقت کے انداز سے اپنی بیوی کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بھاری گرجدار آواز میں کہا:

''ساری رات تم مجھے لیکچر پلاتی رہیں اور اب پھر شروع کر دیا۔ بس اب رہنے دو۔ میں اپنا کام جانتا ہوں، تمھیں پٹی پڑھانے کی ضرورت نہیں۔ تم تو یہ کرنا کہ جب گھر واپس جاؤ تو اپنے جتھے کے لیڈر سے کہنا کہ گنی‌لوئی لوگ کے پاس سے گذرتے ہوئے ہم نے جو دیکھا تھا ویسے اگر وہ بھوسے کا ڈھیر لگائے تو ہم اس کی کھال کھینچ کر بھس بھروا دیں گے۔ بس یہی کہنا۔ اچھا؟''

عورت نے کچھ حجت کرنی چاھی مگر اس کے شوہر نے اس کو اشارے سے منع کرکے چپ کرا دیا اور پہلے سے بھی زیادہ گرجدار آواز میں بولا:

سڑک پر ایک سوار نمودار ہوا۔ کار کو راستہ دینے کے لئے وہ رئی کے کھیت میں مڑ گیا اور فوراً ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ گھوڑا نظر آ رہا تھا نہ سوار کی سفید قمیص۔ صرف اس کی کاسکی ٹوپی کا سرخ فیتہ دکھائی دے رہا تھا جو ہرے پس منظر میں ایسے لگ رہا تھا جیسے رئی کی ہری بھری لہروں میں گوکھرو کا لال پھول کھلا ہو۔

ہم نے کار روک لی اور رئی کے کھیت سے نکل کر سوار ہم سے بات کرنے آیا:

''دیکھئے نا، کتنی حسین فصل ہوئی ہے اب کے برس؟'' اس نے رئی کے کھیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اب اسکو اس ہٹلر حرامزادے سے خطرہ ہے، لعنت اس کے جنم پر! پچھتائیگا کہ ہائے، میں نے یہ لڑائی کیوں شروع کی۔ ضرور پچھتائیگا۔ ساتھیو، میں دو دن سے گھر نہیں گیا، میرا تمباکو ختم ہو گیا، ذرا ایک سگریٹ تو دیجئے، ہے آپ کے پاس؟ اور لڑائی کی کوئی نئی تازہ خبر سنائیے۔''

ہم نے اسے تازہ ترین اعلامیئے کی تفصیل بتائی جسے سنتے ہوئے، وہ اپنی سفید موچھوں پر انگلیاں پھیرتا رہا اور پوچھا:

''ہمارے نوجوان جم کر لڑ رہے ہیں، ہے نا؟ اور اس وقت کیا ہوگا جب ہمیں، تین جنگوں کے آزمودہ کاروں کو طلب کیا جائیگا؟ ان نازیوں کو ناف تک چیر کر پھینک دینگے، جہاں تک ان حرامزادوں کی دائیوں نے رگ میں گرہ لگائی تھی۔ میں سچ کہتا ہوں وہ پچھتائیں گے!''

کاسک گھوڑے سے اتر آیا، پالتی مار کر زمین پر بیٹھ گیا اور ہم نے جو سگریٹ دی تھی اس کو ہوا کی طرف سے پیٹھ موڑ کر جلانے لگا، مگر لگام ہاتھ سے نہیں چھوڑی۔

''تمہارے فارم میں کام کیسا چل رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس جنگ کے بارے میں بوڑھے کاسکوں کا کیا کہنا ہے؟''

''ہم نے تو حساب یہ لگایا ہے کہ پہلے بھوسا بنائیں گے اور پھر رئی اور گیہوں کاٹ کر ٹھیک ٹھاک کرلیں گے۔ لیکن اگر لال فوج کو ہماری ضرورت اس سے پہلے ہوگی تو ہم ہر وقت تیار ہیں۔ عورتیں ہمارے بغیر ہی سارا انتظام کر لیں گی۔ آپ تو جانتے ہی ہیں ہم نے وقت ضرورت کے لئے انہیں ٹریکٹر چلانا، فصل کاٹنے کی کمبائنیں چلانا سب سکھا دیا ہے۔ سوویت حکومت بھی جاگ رہی

''چپ بھی ہو جاؤ، خدا کے لئے، بس بہت بول چکیں - جب ہم قطار سے کھڑے ہو جائیں تو پھر سب کچھ بتا دیا جائےگا، اتنی اچھی طرح کہ تم سمجھانے کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھ سکتیں - ''

* * *

چوک میں منبر کے سامنے فوج بھرتی ہونےوالے لوگ سیدھی قطاریں لگائے کھڑے تھے - انہیں خیر باد کہنے ایک بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا - سب سے پہلے ایک لمبے تڑنگے اور چوڑیچھاتیوالے کاسک یاکوف زملیاکوف تقریر کرنے کھڑے ہوئے:

''میں خود توپچی تھا، لال چھاپہمار رہا اور پوری خانہ جنگی کے دوران میں رہا - میرا بیٹا میری ہی طرح توپچیوں میں ہی لال فوج کی صفوں میں خدمت انجام دے رہا ہے - وہ فنستانی لڑائی میں لڑا تھا، زخمی ہو گیا تھا اور اب جرمن نازیوں سے لڑ رہا ہے - جرمنوں کی دغابازی مجھ سے چپ چاپ برداشت نہ ہو سکی، اس لئے میں نے درخواست دیدی کہ مجھے لال فوج میں رضاکار کی حیثیت سے بھرتی کر لیا جائے اور مجھے اسی دستے میں رکھ دیا جائے جس میں میرا بیٹا ہے تاکہ ہم دونوں مل کر نازی حرامزادوں کو جہنم رسید کریں جیسے بیس برس ہوئے سفید گارڈوں کے حرامزادوں کو جہنم رسید کیا تھا - لڑائی میں میں کمیونسٹ بن کر جانا چاہتا ہوں، میں پارٹی تنظیم سے درخواست کر رہا ہوں کہ مجھے امیدوار میمبر بنا لیا جائے - ''

اپنی باری میں ایک پرانے صنعتی مزدور پراودینکو نے کہا:

''لال فوج میں میرے دو بیٹے ہیں - ایک ہوائی فوج میں ہے، دوسرا پیدل فوج میں - میں نے ان کو پدرانہ نصیحت یہ کی ہے کہ دشمن پر بلاترس کھائے وار کریں، یہاں تک کہ آسمان اور زمین پر ان میں سے کوئی بچکر نہ جائے - اور اگر مدد کی ضرورت ہوئی تو میں خود اپنی بندوق سنبھال لوںگا، اور پرانے زمانے کی طرح خود انہیں بھون کر رکھ دونگا - ''

* * *

سرمائی گیہوں کے گھنے اور شوخ سبز رنگ کے پودے سرکنڈوں کی اونچی باڑ کی مانند کھڑے تھے - رئی کے پودے قدآدم سے بھی اونچے تھے - ان کی بھری بھری نیلگوں بالیاں اپنے ہی وزن میں جھکی پڑ رہی تھیں اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ جھولی جا رہی تھیں -

کاسک نے مسل کر اپنی سگریٹ بجھائی اور ایک ھی جھکولے میں گھوڑے پر سوار ھوگیا۔

''خیر، کوئی حرج نہیں، اس ملعون کا جو حشر ھونا ھے وہ تو ھوکر رھیگا۔ ،، اس نے لگام سمیٹ کر ھاتھ میں لی اور مجھے مخاطب کرتے ھوئے سنجیدگی سے بولا: ''اگر تمھارا اتفاق ماسکو جانے کا ھو، تو وھاں کہدینا کہ ھر عمر کے ڈان کاسک اپنا فرض بجا لانے کو تیار ھیں۔ اچھا، خدا حافظ، جلدی چلوں، نسوانی شہریوں کو بھوسا بنانے میں مدد دوں۔ ،،

اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ایک ھی لمحے میں آنکھوں سے اوجھل ھو گیا۔ اس کے گھوڑے کے سموں کی اڑائی ھوئی دھول کے مرغولوں نے زرخیز وادی کے اتار پر ھمیں دکھایا کہ وہ کس راہ گیا ھے۔

* * *

اس شام سوخوفسکی گاؤں سوویت کے سامنےوالی برساتی میں اجتماعی فارم کے کچھ کسان جمع تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا، پچکے ھوئے گالوں‌والا آدمی جسکا نام کزنیتسوف تھا، بول رھا تھا اور میری نگاہ اس کے گھٹنوں پر رکھے ھوئے بڑے بڑے، کام کرنے کی وجہ سے کھردرے ھاتھوں پر پڑی۔

''...جب میں ان کے ھتھے چڑھا تو زخمی ھو چکا تھا۔ جیسے ھی میری حالت کچھ سدھری ویسے ھی انھوں نے مجھے کام پر لگا دیا۔ انھوں نے ھم میں سے آٹھ کو ایک ھل میں جوت دیا اور اپنی جرمن زمین کو ھم سے جتوایا۔ اس کے بعد مجھے انھوں نے کوئلے کی کانوں میں کام کرنے بھیجدیا۔ روزانہ لدائی کا کوٹا آٹھ ٹن کوئلہ تھا اور ھم بمشکل دو ٹن لاد پاتے تھے۔ جب ھم کوٹا پورا نہ کرتے تو مار پڑتی۔ وہ ھمکو دیوار کی طرف منہ کراکے کھڑا کر دیتے اور گدی پر دوھتڑ مارتے جس سے ناک دیوار پر لگ کر زخمی ھو جاتی۔ اس پٹائی کے بعد ھمیں خاردار تاروں کے پنجروں میں بند کر دیا جاتا۔ پنجرے اتنے نیچے تھے کہ اکڑوں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس طرح دو گھنٹے رھنے کے بعد حالت یہ ھو جاتی کہ ھمیں کریدنی سے گھسیٹ گھسیٹ کر باھر نکالنا پڑتا۔ رینگ رینگ کر چلنے کی بھی سکت نہ ھوتی۔ ،،

کزنیتسوف نے ایک نگاہ سامعین پر ڈالی اور اسی پرسکون انداز میں

ھے، سونے کا موقع نہیں ھے،، اس نے شرارت سے آنکھ مارتے ھوئے کہا۔ ’’یہاں میدانوں میں زندگی بظاھر پرسکون ضرور معلوم ھوتی ھے، مگر کاسکوں نے پرسکون زندگی کی کبھی جستجو نہیں کی اور کبھی کسی کی آڑ لینے کی کوشش نہیں کی۔ ھم بخوشی یہ لڑائی لڑیں گے۔ اس حرامزادے ھٹلر پر لوگ تاؤ کھائے بیٹھے ھیں۔ لیکن اس کو ھو کیا گیا ھے، کیا وہ جنگ کا دیوانہ ھے یا کیا؟،،

وہ چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پیتا رھا اور چین سے گھاس چرتے ھوئے اپنے گھوڑے کو کن انکھیوں سے دیکھتا بھی جاتا۔

’’پچھلے اتوار کو جب میں نے جنگ کے بارے میں سنا تو جیسے اندر ھی اندر اتھل پتھل سی مچ گئی۔،، اس نے کسی سوچ میں ڈوبے ھوئے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ’’اس رات میں بالکل بھی نہ سو سکا۔ پڑے پڑے سوچتا رھا پچھلے سال فصلوں کے کیڑوں مکوڑوں نے ھم پر حملہ کیا تھا اور امسال ھٹلر نے۔ کوئی نہ کوئی جھنجٹ لگی ھی رھتی ھے۔ اور میں سوچ رھا تھا کہ یہ ھٹلر کس قسم کا موذی کیڑا ھے جو اچھل اچھل کر ھر ایک کو کاٹ رھا ھے اور کسی کو چین نہیں لینے دے رھا؟ اور پھر مجھے پہلی جرمن جنگ یاد آگئی جس میں میں آخر تک لڑا اور مجھے یاد آیا کہ کس طرح میں نے دشمن کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے... میں نے اس ھاتھ سے آٹھ کا کام تمام کیا تھا اور سب کا حملوں کے دوران۔،، کاسک جھینپتے ھوئے مسکرایا اور آواز دھیمی کر لی۔ ’’آجکل میں اسکا بہ‌آواز بلند ذکر کر سکتا ھوں، لیکن پہلے کچھ عجیب سا لگتا تھا... اس جنگ میں میں نے سینٹ جارج کی دو صلیبیں جیتی تھیں اور تین تمغے۔ کوئی مفت میں تو انہیں میں نے اپنے سینے پر نہیں لگوا لیا تھا، کیوں؟ جی نہیں۔ اور میں بستر میں پڑے پڑے پچھلی جنگ کی باتیں سوچ رھا تھا اور اچانک یاد آیا کہ میں نے کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ خود ھٹلر اس جرمن جنگ میں سوجود تھا۔ اور میرے دل میں غم و اندوہ کی ایک ایسی چبھن ھوئی کہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور بہ‌آواز بلند کہنے لگا: ’وہ ملعون ان آٹھ میں کیوں نہ ھوا جو میرے ھاتھ سے مارے گئے؟ تلوار کا بس ایک وار ھی میں نے کیا ھوتا اور وہ دو نیم ھو جاتا۔، بیوی جاگ اٹھی اور مجھ سے پوچھنے لگی: ’بڑبڑا کس پر رھے ھو؟، میں نے جواب دیا: ’ملعون، مردود ھٹلر پر! تم سو جاؤ، ناستاسیا، یہ ساری باتیں تمھاری سمجھ میں نہیں آئینگی۔،،،

وهیں ایک بوڑھی عورت نے اس سے کہا: ''تم گھر واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟ ہم اپنے آپ سب کچھ کر لیں گے۔''

اس پر بڑے میاں نے اپنی بےرنگ، بچوں جیسی آنکھیں اٹھا کر دیکھا اور جھلا کر جواب دیا:

''میرے تین پوتے اس جنگ میں لڑ رہے ہیں، مجھے جیسے بن پڑے ان کی مدد کرنی ہی چاہئے۔ اور مجھے نصیحت کرنے کےلئے تم مجھ سے بہت چھوٹی ہو۔ میری عمروں کی ہو جاؤ تو کر لینا مجھے نصیحت جتنا جی چاہے۔''

* * *

ڈان کاسکوں کے دل پر دو جذبے غالب ہیں: اپنی مادروطن سے محبت اور نازی حملہ آوروں سے نفرت۔ محبت رہتی دنیا تک جاگزیں رہیگی لیکن نفرت دشمن کا مکمل صفایا ہونے تک ہی قائم رہے۔

یہ نفرت اور عوام کے جوش‌انتقام کو ابھارنےوالوں پر لعنت!

۱۹۴۱ء

کاسک اجتماعی فارم

ڈان کے بےکنار کھیتوں میں فصل کی کٹائی پورے زورشور سے جاری تھی۔ ٹریکٹر گرج رہے تھے، گڑگڑا رہے تھے اور فصل کاٹنے کی مشینوں پر دھواں رئی کے سفیدی مائل غبار کے ساتھ ملکر چھایا ہوا تھا۔ اونچی گھنی رئی کو کاٹتے ہوئے مشین گھومتے ہوئے بھرا رہی تھی۔ بظاہر یہ منظر پرامن تھا لیکن ہر چیز پر جنگ کی سنجیدگی کا ٹھپہ تھا۔ لوگ اورمشینیں جس رفتار سے کام میں مصروف تھے وہ مختلف تھی، اس کی دھن تیز تھی اور پہلے سے زیادہ ایک تشنجی کیفیت طاری تھی۔ ساحل ڈان کے سرخی مائل سنہری گھوڑے جو گلوں میں سے لائے گئے تھے گاؤں کے چوک میں لمبی لمبی رسیوں سے بندھے ہنہنا رہے تھے۔ دھوپ میں سنولائے ہوئے نوجوان سوار، دوپلی پرانی ٹوپیاں پہنے بھرتی کے مرکزوں کی طرف چلے جا رہے تھے اور عورتیں جو کھیتوں میں پولیاں باندھ رہی تھیں اٹھ کر سیدھی کھڑی ہو جاتیں اور دیر تک ہاتھ ہلا ہلا کر چیخ چیخ کر کہتیں: ''صحیح سلامت آؤ، کاسکو! تقدیر تمہارا ساتھ دے! نازی زہریلے سانپ کا سر کچل دینا۔ اور بودیونی کو ڈان‌والوں کا سلام کہنا!''

سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ''ذرا میری طرف دیکھئے: ھڈی سے چمڑا لگا ھوا ھے اور بیمار ھوں مگر وزن ۷۰ کلوگرام ھے۔ لیکن اس قید خانے میں میں نے جو ڈھائی سال گزارے اس کے دوران میں میرا وزن ۴۰ کلوگرام سے کبھی زیادہ نہیں ھوا۔ یہ حشر کیا انھوں نے میرا۔''

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے پھر بولنا شروع کیا:

''اس وقت میرے دو بیٹے نازیوں کے خلاف لڑ رھے ھیں۔ میرا خیال ھے کہ اب وقت آ گیا ھے کہ میں ان سے اپنا حساب بھی صاف کر لوں۔ لیکن لوگو، میں معافی چاھتا ھوں کہ میرا ارادہ انھیں قیدی بنانے کا نہیں ھے۔ یہ میں کر ھی نہیں سکتا۔''

سامعین پر ایک گہری، چوکنی خاموشی چھا گئی۔ بادامی رنگ کے رہ رہ کر پھڑکتے ھوئے اپنے ھاتھوں پر سے آنکھیں اٹھائے بغیر کزنیتسوف نے اور بھی دھیمے لہجے میں کہا:

''لوگو، میں معافی ضرور چاھتا ھوں... مگر انھوں نے میرے جسم کی ساری توانائی، آخری رمق تک، نچوڑ لی۔ اگر میں لڑائی پر گیا تو چاھے ان کے جوانوں کو تو قیدی بنالوں، مگر ان کے افسروں کو، ھرگز نہیں۔ ایسا میں کر ھی نہیں سکتا، اور بس۔ سب سے زیادہ وحشتناک تکلیفیں مجھے ان افسر حضرات کے ھاتھوں برداشت کرنی پڑیں، اس لئے آپ مجھے معاف کر دیں...''

وہ اٹھ کھڑا ھوا — لمبا تڑنگا، سوکھا سا آدمی، جسکی آنکھیں اچانک زیادہ روشن، زیادہ جوان معلوم ھونے لگی تھیں، نفرت کی آگ سے۔

* * *

جنگ کے دوسرے دن واشچائیفسکی اجتماعی فارم کا ھر مرد، اور بچہ کام کرنے کے لئے آ گیا۔ بہت بوڑھے لوگ بھی جنھیں عرصہ ھوا کام کرنے سے مہلت مل چکی تھی ھاتھ بٹانے نکل آئے تھے۔ غلہ پچھوڑنے کے فرش صاف کرنے کا سارا کام بوڑھے آدمیوں اور بوڑھی عورتوں کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ ایک بڈھا پھونس اسٹول پر بیٹھا، لرزتی ھوئی ٹانگیں خوب چوڑی کر کے پھیلائے، ایک بیلچے سے فرش کھرچ کھرچ کر صاف کر رھا تھا۔

''بیٹھے بیٹھے کیوں کام کر رھے ھو، دادا؟'' میں نے پوچھا۔

''میری کمر سے جھکا نہیں جاتا، بیٹا، بیٹھے بیٹھے بڑے مزے میں ھوں۔''

''ضرور ہے۔ ''

''کون؟''

''میری بیوی۔ ''

''تمہیں یقین ہے وہ یہ کام کر سکیگی؟''

زیلینکوف کے چہرے پر جو دھول کی ایک باریک تہ جم جانے کی وجہ سے قدرے کالا پڑ گیا تھا مسکراہٹ پھیل گئی۔ جو نوجوان عورت پہیہ گھما رہی تھی کٹھرے پر جھک کر بولی:

''میں زیلینکوف کی بیوی ہوں۔ یہ کام میں عارضی طور پر کر رہی ہوں، اور پچھلے سال میں نے کمبائن آپریٹری کی تھی اور اپنے شوہر سے زیادہ کمایا تھا۔ ''

ظاہر ہے زیلینکوف کو یہ یاددھانی بری لگی اور اس نے قدرے بےدلی سے کہا:

''اگر وقت ہی آن پڑے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ میری جگہ کام کرلے۔ لیکن ہمارے منصوبے کچھ اور ہی ہیں۔ ہم دونوں محاذجنگ پر ساتھ ساتھ جانا چاھتے ہیں...''

مارینا زیلینکووا فطرتاً ایسی عورت نہیں تھی جو شوہر ہی کو ساری باتیں کر لینے دیتی۔ چنانچہ میاں نے جو بات کہنی شروع کی تھی وہ بیوی نے ختم کی:

''چونکہ ہمارے ہاں بچے نہیں ہوئے اس لئے ہم دونوں ساتھ ساتھ محاذ جنگ پر جا سکتے ہیں۔ اور میں ٹینک چلانے میں اپنے شوہر سے کچھ ہیٹی نہیں رہونگی، اس کی آپ ہرگز فکر نہ کریں!''

زیلینکوف لپک کر اپنی کمبائن میں چلا گیا کیونکہ گپ شپ میں ضائع کرنے کو اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ فارم کے ۴۰۰ ھیکٹر کے اس رقبے سے جس میں رئی کی کاشت کی گئی تھی ۱۴۷ میں فصل کی کٹائی مشینی ھنسیوں سے ہو چکی تھی اور وہ چاھتے تھے کہ جو وقت ضائع ہو گیا ہے اس کو کسی نہ کسی طرح پورا کر لیں۔

اس مرتبہ روستوف علاقے کے بیشتر اجتماعی فارموں نے معمولی مشینی ھنسیوں کو وسیع پیمانے پر استعمال کیا تھا۔ فصل کاٹنے کی کمبائنوں کے لئے اناج اچھی طرح پک جانے کا انتظار کئے بغیر انھوں نے سادہ مشینی ھنسیوں سے کام شروع کر دیا، فصل کی کٹائی کی رفتار بہت بڑھ گئی اور ایندھن کی بھی بڑی بچت ہوئی۔ اس کے متعلق ''استالینیتس'' اجتماعی فارم کے ایک آدمی نے جو کچھ کہا وہ یہ تھا:

اناج کے ذخیروں کی طرف جانےوالی سڑکوں پر نئی فصل کے اناج کے بوروں سے لدے ہوئے اور بہترین قسم کی، بہار کی نئی پیاز جیسی ہری ہری، بارش کے ایک قطرے سے بھی محفوظ گھاس کے جھومتے ہوئے پہاڑ کے پہاڑ بار کئے چھکڑوں کے کاروان چلے آ رہے تھے۔ لال فوج کو ہر چیز کی ضرورت تھی۔ اور سب کچھ لال فوج کے لئے کیا جا رہا تھا۔ تمام لوگوں کا دھیان وہیں، محاذ پر لگا تھا۔ اور تمام دلوں میں ایک خواہش دھڑک رہی تھی: نازی زہریلے سانپ کی کمر جلدی سے جلدی ٹوٹ جائے۔

ایک بوڑھا کاشتکار جو گیہوں کی بالی انگلیوں سے مسلتے ہوئے مسکرا رہا تھا بولا:

''خود قدرت ہمارے حق میں اور ہٹلر کے خلاف ہے، صرف انگلستان اور دوسری ہوشیار قومیں ہی نہیں جو ہماری اتحادی بن گئی ہیں۔ اب کی فصل ہی کو دیکھ لیجئے، معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پریوں کی کہانی کی بات ہو۔ گندم کی بالیاں بانس کی طرح موٹی ہو جاتی ہیں، اور آلو چھکڑوں کے پہیوں کے برابر۔ گندم، سورج مکھی اور باجرے کو کٹائی سے ذرا پہلے بارش کی ضرورت ہوتی ہے اور بارش ہوئی۔ یہ ساری فصلیں آنکھوں کو تراوٹ پہنچا رہی ہیں! ہر چیز ہمارے حق میں ہے۔''

''بالشیوستسکی پوت،، پنچائتی فارم میں میں نے فصل کاٹنے کی کمبائن کے آپریٹر پیوتر زیلینکوف سے بات چیت کی۔ اس نے مجھے بتایا کہ رئی کے کھیت کے پہلے ہی ہیکٹر سے ۲۰۸ ٹن اناج کمبائن کے ذخیرے لے پہنچا اور بڑی بات یہ کہ سیلن نسبتاً کم تھی اور کوڑا بھی برائے نام۔ کہیں کہیں تو پیداوار تین ساڑھے تین ٹن فی ہیکٹر تک پہنچ گئی تھی۔

آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ زیلینکوف کو فصل کاٹنے کی اپنی مشین خالی کرنی پڑتی تھی۔ اور اس کے رکنے سے پہلے مجھے انتظار کرتے رہنا پڑتا تھا۔ آرام کے اس مختصر وقفے کے دوران میں وہ اپنی مشین سے اتر پڑتا، ایک نظر مشین کے ذخیرے پر ڈالنے کے بعد کٹے ہوئے پودوں کے نوکیلے ٹھنٹھ پار کرکے کچھ فاصلے پر جا کر سگریٹ پینے لگتا۔

''تمہیں اگر محاذ پر جانا پڑ جائے تو تمہاری جگہ لینے کو کوئی ہے؟،، میں نے پوچھا۔

کی مدافعت کو تیار ہو جائیں گے۔ پھر بہرحال اس صورت میں بےدلی سے بھلا کون کام کریگا جبکہ قریب قریب ہر کنبے کا کوئی نہ کوئی فرد محاذ جنگ پر لڑ رہا ہے۔ اب میری ہی مثال لیجئے۔ میرے دو بیٹے ہیں اور دونوں لڑائی پر گئے ہوئے ہیں۔ الیکسئی توپچی ہے اور نکولائی ٹینک چلاتا ہے۔ محاذ پر جانے کے لئے میں زیادہ بوڑھا ہو گیا ہوں۔ لیکن پھر بھی ہوم گارڈوں میں میں نے اپنا نام لکھوا لیا ہے۔ پچھلی جرمن جنگ میں میرے پیٹ میں گولی لگی تھی۔ اس جرمن زخم نے مجھے بڑی تکلیف پہنچائی تھی۔ لیکن کام میں اب بھی کر سکتا ہوں... اگر ضرورت پڑی تو لڑائی میں میں اپنے بیٹوں سے جا ملوں گا۔،،

جب انہیں پتہ چلا کہ میں ''کراسنایا زویزدا،، (ایک فوجی اخبار) کے لئے مضمون لکھنےوالا ہوں تو بڑے اشتیاق کے ساتھ کہا:

''میرے لڑکوں اور محاذ جنگ پر لڑنےوالے تمام لوگوں کو اپنے اخبار کے ذریعے مطلع کر دیں کہ یہاں، عقب میں ہم کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ ان سے کہئے کہ نازیوں پر ذرا ترس نہ کھائیں، ان کا جینا اس طرح محال کر دیں کہ ہماری سرزمین پر انہیں اپنی قبروں کے علاوہ کچھ نہ ملے۔ ،،

جب ہم ''پوت کے سوتسیالزمو،، اجتماعی فارم کے دفتر پہنچے تو ایک بوڑھے کھاتہ نویس کے علاوہ وہاں کسی کو نہ پایا۔ اس نے بتایا کہ فارم کے صدر کھیتوں میں کام کرنے گئے ہوئے ہیں۔ گاؤں کے اندر آدم تھا نہ آدم‌زاد: پوری آبادی فصل کاٹنے، غلہ پچھوڑنے کے فرش صاف کرنے یا اناج لادنے میں لگی ہوئی تھی۔

کھاتہ نویس نے ایک لمحے کے لئے اپنا قلم میز پر رکھتے ہوئے کہا: ''میرا بیٹا مغربی محاذ پر ہے۔ تین سال تک وہ فوج میں عملی خدمات پر مامور رہا، توپچیوں کے ایک دستے کا کمانڈر تھا۔ میں اسے خط لکھتا تو پوچھتا کہ اس کی توپ کس قسم کی ہے اور جواب میں وہ لکھا کرتا: 'میں اچھی طرح سے ہوں، گھر میں سب کو سلام کہئے اور توپوں کے بارے میں مجھ سے مت پوچھا کیجئے۔ ابا، اس سے آپ کا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ '،، کھاتہ نویس کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جا رہی تھیں۔ ''مطلب یہ کہ اسے قاعدے قانون اچھی طرح معلوم ہیں۔ خانہ جنگی کے دنوں کی لڑائی میں میں نے بھی حصہ لیا تھا۔ پہلے شمال میں لڑنے گیا، پھر ''باسماچی،، ٹولیوں کے

''اجتماعی فارم قائم ہو گئے تو ہم نے پسینہ بہانا چھوڑ دیا۔ سوویت حکومت نے ہمیں کمرتوڑ محنت سے نجات دیدی۔ اور اب یہ نوجوان جو مشینی ہنسئے چلاتے ہیں دن بھر کا کام کمر کے درد کی شکایت کئے بغیر نہیں کر سکتے! لاڈ کے بگاڑے ہوئے ہیں، اور نہیں تو کیا! امن کے زمانے میں سب ٹھیک تھا کہ ٹریکٹر ہمارے لئے کھیتوں میں جتائی کریں، اور فصل کاٹنے کی کمبائنیں اناج کاٹیں اور غلہ پچھوڑیں، لیکن اب جبکہ نازیوں نے ہم سے لڑائی شروع کر دی ہے تو یہ کمر میں درد کی شکایتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ اب کام کرنے کا طریقہ یہ ہونا چاہئے کہ جسم کا ایک ایک جوڑ اپنا کام کرے اور ایندھن جتنا ہو سکے لال فوج کے لئے بچایا جائے جسے اسکی ہم سے زیادہ ضرورت ہے۔ اسے وہ اتنی اچھی طرح استعمال کریگی کہ نازیوں کا جوڑ جوڑ نہ صرف چٹخ جائیگا بلکہ چرمرا کر رہ جائیگا۔،،

قریب قریب یہی بات مجھ سے واسیلی سولداتوف نے کہی جو ''چھبیس باکو کمیسار،، اجتماعی فارم میں کام کرتے ہیں اور جنہوں نے بوریوں کی تھئی جمانے کا روز کا کام کوٹے سے دگنا پورا کیا تھا۔

''ہمارا دشمن سخت جان اور اڑیل ہے اس لئے ہم کو بھی سخت جان اور اڑیل بن کر کام کرنا چاہئے۔ اور کوٹا... کوٹا تو ہم کو یہاں حد سے زیادہ پورا کرنا چاہئے لیکن جب ہمیں محاذ جنگ پر بھیجدیا جاتا ہے تو دشمن پر دھاوا بولنے ہم کوئی کوٹا مقرر کئے بغیر ہی جائینگے۔ ،،

جن اجتماعی فارموں کا میں نے دورہ کیا ان سب میں محنت کے نظم وضبط سے، اور اپنے شہری فرائض کا لوگوں میں جو احساس ہے اس سے میں بڑا ہی متاثر ہوا۔ ایک ایک فرد کام کرنے آتا — جوان، بوڑھے اور یہاں تک کہ وہ لوگ بھی جو پچھلے سال ہی اس قدر بڑھا محسوس کرنے لگے تھے کہ کام نہیں کر پاتے تھے۔ بلااستثنا ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق زیادہ سے زیادہ کام کرتا اور بے پناہ جوش و خروش کے ساتھ۔ ''بالشیوستسکی پوت،، اجتماعی فارم میں جتھے کے ایک لیڈر واسیلی تسیلی کوف نے ضلع کمیٹی کے ایک عہدیدار سے تعریف سننے کے بعد یہ کہا:

''اپنی سی بہترین کوشش سے کم تو ہم کام کر ہی نہیں سکتے۔ میرا نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ فی الحال ہم اپنی محنت سے ملک کا دفاع کر رہے ہیں اور جب وقت آئیگا تو ہتھیار لیکر اس

کی بےقراری میری سمجھ میں اچھی طرح آ رہی تھی کہ جائیں اور جا کر جرمنوں کو جو خون بہانے اور سستی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد بدمست ہو گئے تھے، اچھی طرح سرست کریں ۔ یہ وہ بےقراری تھی جو ڈان کے تمام نوجوان کاسکوں میں مشترک تھی، ان لوگوں کی بےقراری جن کے پرکھے صدیوں سے ہمارے ملک کی سرحدوں کو بیشمار دشمنوں سے حفاظت کرتے ہوئے اپنے خون سے سینچتے آئے تھے ۔

مجھے تراسی‌ساله ایسائی مارکووچ یولانتیف کی باتیں یاد آئیں جو فارم پر اناج پچھوڑنے کے صحن میں پہریداری کرتے ہیں ۔ جولائی کی پرسکون رات تھی، تاریک آسمان پر ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے ۔ وہ بوڑھے آدمی کی نحیف آواز میں بول رہے تھے:

''میرے دادا نپولین کے خلاف لڑے تھے اور جب میں چھوٹا سا تھا تو انہوں نے یہ قصہ مجھکو سنایا تھا ۔ ہمارے خلاف جنگ شروع کرنے سے پہلے نپولین نے ایک خوشگوار دن اپنے جرنیلوں کو ایک وسیع میدان میں جمع کیا اور ان سے کہا: 'میرا خیال ہے کہ روس کو فتح کر لوں ۔ جرنیل صاحبان، اس کے بارے میں آپ حضرات کی کیا رائے ہے؟'، اور ان سب جرنیلوں نے بیک‌آواز کہا: 'ایسا نہیں ہو سکتا اعلحضرت، یہ بڑا ہی زبردست، طاقتور ملک ہے، اس کو ہم کبھی بھی فتح نہیں کر سکتے ۔'، پھر نپولین نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور پوچھا: 'دیکھو وہ ستارہ نظر آ رہا ہے؟'، 'نہیں، جرنیلوں نے جواب دیا 'ہمیں تو نظر نہیں آرہا ۔ دن میں ستارہ دکھائی نہیں دیتا'۔ نپولین نے ان سے کہا: 'مگر مجھے دکھائی دے رہا ہے ۔ یہ ستارہ نیک شگون کا ہے ۔'، اور پھر اس نے اپنی فوجیں لیکر ہمارے ملک پر چڑھائی کر دی ۔ وہ ایک عالیشان دروازے سے داخل ہوا اور ایک چھوٹے سے، نہایت تنگ دروازے سے جس میں سے وہ بمشکل نکل پایا تھا، واپس گیا ۔ ہمارے لوگ اس کو یہاں سے لیکر پیرس تک پہنچانے گئے ۔ لگتا ہے اس جرمن کمانڈر کو وہی بےتکا ستارہ دکھائی دے گیا ہے اور جب اس کے ہوش ٹھکانے لگا دئے جائیں‌گے اور اس کو جب اتنے تنگ دروازے سے نکل کر بھاگنا پڑیگا تو معلوم نہیں اس میں سے نکل بھی پائیگا یا نہیں ۔ خدا سے امید ہے کہ وہ نکل نہ پائیگا ۔ تا کہ دوسرے پھر کبھی بھی ایسی حرکت نہ کریں ۔''

۱۹۴۱ء

خلاف اور ہر وضع قطع کی دشمنوں کے خلاف لڑنے گیا۔ اب میں ھوم گارڈ میں ھوں۔ گاؤں میں ھم کوئی ایک سو ھیں۔ آج کل بڑا عجیب معاملہ ھے۔ یہاں عقب میں بہت سارے نوجوان بھی ھیں۔ جب ھم سو ھوم گارڈ قطاریں لگا کر کھڑے ھوتے ھیں تو بوڑھوں میں بہت سے نوجوان بھی ھوتے ھیں، اتنے طاقتور کہ توپ گھسیٹ لے جائیں۔ گھوڑوں کی طاقت ھے ان میں، سچ مچ ھے۔ انھوں نے رضا کاروں میں نام لکھوا رکھے ھیں لیکن کسی وجہ سے ان کا بلاوا ابھی تک نہیں آیا ھے۔ اس کے معنے ھیں ھماری فوج بہت بڑی ھے۔ یہ سوچ کر دل کو بڑا ھی اطمینان اور سکون ملتا ھے۔''

جتھہ نمبر ۲ فصل کاٹ رھا تھا۔ فصل کاٹنے کے ایک ایک آلے میں دو دو بیل جتے ھوئے تھے اور پودے کاٹنے کے پھلوں کو پوری اونچائی تک اٹھا دیا گیا تھا مگر آگے بڑھنا مشکل ھو رھا تھا کیونکہ رئی بہت اونچی اور گھنی تھی۔ بیل ھانکنے والی عورتیں بہت خوب ٹٹخارتیں، کوڑے سے چلاتیں اور کڑیل نوجوان کاسکوں کو جو کٹے ھوئے پودے جیلی سے جمع کر رھے تھے اس قدر تیزی سے کام کرتے ھوئے بڑھنا پڑ رھا تھا کہ ان کو اتنی مہلت نہیں مل رھی تھی کہ اپنے منہ پر بہتا ھوا پسینہ پونچھ ڈالیں۔ آخرکار جب وہ لوگ ذرا دم لینے رکے تو میں ان کے پاس گیا اور پوچھا کہ بیلوں کو اس تیز رفتاری سے کیوں دوڑا رھے ھیں۔

''یہ بیل اس کے عادی ھیں، ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچیگا،'' ان میں سے ایک کاسک نے جواب دیا۔ ''کام جب تیزی سے ھو تو ھمیں آسان معلوم ھوتا ھے۔ اور پھر ھمیں عجلت تو کرنی ھی چاھیئے، کیا پتہ محاذ پر جانے کا کب بلاوا آجائے اور عورتوں کے لئے اس طرح فصل کا کام سنبھالنا پھر مشکل ھو جائیگا۔ اچھا، بتائیے تو، مجھے کیوں بھرتی نہیں کرتے یہ لوگ؟ میری عمروں کے اوروں کو تو بھرتی کر لے گئے، پتہ نہیں کیوں مجھے چھوڑ گئے۔ کیا میں دوسروں سے کسی بات میں ھیٹا ھوں، یا کیا بات ھے؟''

اس شخص کا نام پوکوسائیف تھا اور وہ مقامی لوھار کا بیٹا تھا۔ فوجی خدمت کے زمانے میں یہ تگڑا جوان جس کا چوڑا چکلا سینہ پیپے کی مانند تھا، توپخانے میں کام کر چکا تھا۔ دوسروں سے باتچیت کرنے پر معلوم ھوا کہ وہ سب کوئی نہ کوئی فوجی خدمت انجام دینے کی تربیت حاصل کر چکے تھے اور ان طاقتور اور صحتمند نوجوانوں

لینن گرادوالوں کے نام ایک خط

ہمارے لینن گراد کے ساتھیو!

ہمیں معلوم ہے کہ دشمن کے محاصرے میں رہتے ہوئے آپ کے لئے زندگی بسر کرنا، کام کرنا اور لڑنا کتنا دشوار ہے۔ لوگ آپ کو ہر جگہ — ہر محاذ پر اور عقب میں یاد کرتے ہیں۔ دورافتادہ یورال میں فولادساز مزدور کو پگھلی ہوئی دھات بہتی دیکھ کر آپ کی یاد آتی ہے اور وہ بلامہلت کام کئے چلا جاتا ہے تاکہ آپ کی نجات کی گھڑی قریب آ جائے۔ لڑائی کے مورچے پر، ڈانباس میں جرمن حملہ آوروں پر وار کرنےوالا فوجی ان کو صرف اپنے تباہ و برباد یوکرین کی خاطر ہی نہیں مار گراتا بلکہ ان بےپناہ مصیبتوں کے لئے بھی جو دشمن نے، لینن گرادوالو، آپ کو پہنچائی ہیں... ہم اس گھڑی کا بےچینی سے انتظار کر رہے ہیں جب محاصرہ ٹوٹ جائیگا اور عظیم‌الشان سوویت دیس، لینن گراد کے — سراپا اور ابدی شان کے شہر کے — بہادر بیٹوں اور بیٹیوں کو اپنے گلے لگا لیگا۔

۱۹۴۲ء

نفرت کی سائنس

جنگ میں درختوں کا — لوگوں ہی کی طرح — اپنا اپنا نصیبہ ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ ہماری توپوں کی زد میں آنے کے بعد جنگل کے ایک بڑے قطعے کے درختوں کا صفایا ہو گیا۔ جرمن جنہیں س۔ نام کے گاؤں سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا گیا تھا، اس جنگل میں جم کر مقابلہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن درختوں کے ساتھ ان کو بھی کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیا گیا۔ مردہ جرمن فوجی صنوبر کے پرخچے اڑے درختوں کے تلے دبے پڑے تھے۔ ان کی چیتھڑے اڑی لاشیں فرن کی سرسبز جھاڑیوں کے درمیان پڑی سڑ رہی تھیں اور توپ کے گولوں سے چرے ہوئے درخت کے تنوں سے آتی ہوئی رال کی سہک سڑتے گوشت کے تعفن، میٹھی میٹھی بدبو میں دب کر رہ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود زمین سے جس میں جگہ جگہ توپ کے گولوں نے غار ڈالدئے تھے، جن کی کگریں جھلسی ہوئی، خاکستری اور سخت

پاجی پن

میدان جنگ سے فوجی اطلاع ملی ھے: ''یلنیا گاؤں کے نزدیک گھمسان کی لڑائی ھو رھی تھی۔ جرمنوں نے گھروں کے سامنے قلعہ‌بندیاں بنا لی تھیں اور ان کو ڈھانک کر چھپا دیا تھا اور دیر تک وھیں سے آتش باری کا جواب دیتے رھے۔ جب ھمارے دستے نے حملہ شروع کیا تو نازیوں نے تمام عورتوں اور بچوں کو گھروں سے باھر نکال لیا اور ان کو اپنی خندقوں کے سامنے لے آئے...''

یہ ھٹلر کی فوج کے سپاھیوں کی حرکت تھی جنھیں نازی ریڈیو بہادر اور شریف کہہ کہہ کر تعریفوں کے پل باندھتا تھا۔ انکی جیسی ''شرافت'' سے سڑاند پھوٹتی ھے۔ اور یہ سوچے بغیر نہیں رھا جاتا: اگر یہ سپاھی زندہ بچ رھے تو اپنی ماؤں، بیویوں اور بہنوں کے روبرو کیا انھیں شرم نہیں آئیگی؟

نازیوں نے جب اپنی تبلیغ سے عقیدہ بدلا تو ان کو شاید سخت کام کرنا پڑا ھوگا تاکہ اپنے فوجیوں کا قلب اس قدر پلٹ دیں کہ انسانیت کے سارے جذبات سلب ھو جائیں۔ اور پوری ذی حیات مخلوق کو انسانیت سوز وحشیانہ کام انجام دینےوالے خودکار آلوں میں تبدیل کردیں۔

مجھے نہیں معلوم یلنیا میں نازیوں کی اس حرکت کو گوئبلز کی زبان میں کیا کہا جائیگا — فوجی فراست یا جرمن خوش تدبیری — لیکن دنیا کی تمام مہذب قوموں کی زبان میں ایسی حرکت کو جو ھر فوجی کے لئے باعث رسوائی ھوتی ھے، ھمیشہ پاجی پن کہا جائیگا۔ اس نئی نازی ظالمانہ حرکت کے متعلق جو بھی سنیگا اس کا ردعمل جرمن قوم کے لئے شرم کے احساس کا ھوگا، ان لوگوں سے کراھیت اور نفرت جو نہتی شہری آبادی کے پیچھے نہایت بےشرمی سے پناہ لیتے ھیں۔

سوویت یونین کے لوگ اور لال فوج نازیوں کے جرائم کا حساب رکھ رھے ھیں۔ ھمارے لوگوں کا انھوں نے جو خون بہایا ھے اس کی قیمت اور اپنی ھی بےعزتی کی قیمت بہت خون کی شکل میں ادا کریں گے۔

۱۹۴۱ء

انگلیوں کو آپس میں باربار پھنسا کر دونوں ہاتھوں کی ایک مٹھی بناتا جاتا اور یہ انداز جس سے خاموش غم یا گہری، دلسوز یادوں کا واضح اظہار ہوتا تھا اس کے قوی جثے اور اس کے چہرے سے عیاں توانائی اور مردانگی سے میل کھاتا نہیں معلوم ہوتا تھا۔

اچانک وہ خاموش ہوگیا اور فوراً ہی اس کا چہرہ بدل گیا۔ اس کے سیاہ گالوں پر زردی کھنڈ گئی۔ اس نے اپنے دانت اس قدر زور سے بھینچے کہ جبڑے کے عضلات تنی ہوئی جلد کے اندر پھڑکنے لگے۔ اس کی آنکھوں سے، جو سامنے ایک ہی جگہ گھورے جارہی تھیں، اس قدر ناقابل تسکین، خوفناک نفرت کے شعلے بھڑکنے لگے کہ بلاارادہ میری نگاہیں بھی اسی طرف اٹھ گئیں جدھر وہ دیکھے جارہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ہمارے اگلے دفاعی مورچے سے اڑے اڑے رنگ کی، قریب قریب بے رنگ وردی پہنے دوپلی ٹوپی گدی تک پیچھے سرکا کر اوڑھے ایک فوجی کی حراست میں تین جرمن قیدی چلے آرہے ہیں۔

ہمارا فوجی آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کے جچے تلے قدم کے ساتھ ساتھ کندھے پر پڑی رائفل جھول رہی تھی اور دھوپ میں سنگین چمچما رہی تھی۔ اسی سست رفتاری سے قیدی گھسٹ گھسٹ کر اپنے پیروں کو آپس میں رگڑتے ہوئے چل رہے تھے جن میں وہ زرد کیچڑ میں لت پت چھوٹے بوٹ پہنے ہوئے تھے۔

خندق کے پاس پہنچکر اس قیدی نے جو قطار میں آگے آگے چل رہا تھا — ادھیڑ عمر کا جرمن جس کے پچکے ہوئے گالوں پر داڑھی کے بھورے بال بڑھ آئے تھے — بھیڑیئے جیسے انداز میں کن انکھیوں سے ہمیں دیکھا اور اپنی پیٹی میں لٹکے ہوئے خود کو ٹھیک کرنے کے بہانے ہماری طرف سے منہ پھیرلیا۔ اس پر لفٹنٹ گیراسیموف اچھل کر کھڑا ہوگیا اور تیز تحکمانہ آواز میں نگراں فوجی پر چیخا:

''ان کو لیکر ٹہلنے نکلے ہو کیا؟ کوئک مارچ! سنا، جلدی جلدی لیکر جاؤ، سنا تم نے؟''

لگتا تھا کہ جیسے ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا ہو مگر بے پناہ غصے نے اس کا گلا دبوچ لیا اور ایڑی کے بل گھوم کر وہ دوڑتا ہوا خندق کی سیڑھیاں اتر گیا۔ سیاسی معلم جو اس موقع پر موجود تھا میری حیرت دور کرنے کے لئے دھیمی آواز میں وضاحت کرتے ہوئے بولا:

''اس کے اعصاب خراب ہوچکے ہیں، اس کے بس کی بات نہیں

معلوم هورہی تھیں، موت و ہلاکت کی مضر بدبو پھوٹ رہی ہو۔
ہماری توپوں کے بنائے اور کھودے ہوئے اس قطعہ اراضی پر جلاد اجل کی خاموش حکمرانی تھی۔ بیچوں بیچ برچ کا ایک درخت گویا کسی معجزے سے باقی بچ رہا تھا اور اس کی مجروح شاخیں ہوا میں جھوم رہی تھیں اور نئی، چمکدار، چپچپی پتیوں میں سرسراہٹ پیدا ہو رہی تھی۔

اس قطعہ اراضی کو پار کرنے کے لئے ہم روانہ ہوئے۔ میرے آگے آگے چلتے ہوئے فوجی نے برچ کے اس درخت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پرخلوص و پرشفقت انداز میں کہا: ''بیچارہ، تو کیسے بچ رہا ہوگا؟''

صنوبر کے درخت فوراً مر جاتے ہیں، جب کوئی گولا ان کے آن کر لگتا ہے تو وہ بس بےجان ہوکر گر پڑتے ہیں، پھننگ الگ ہو کر جاپڑتی ہے، زمین پر بچھی ہوئی سوئی جیسی پتیوں پر رال بہہ بہہ کر جم جاتی ہے۔ اس کے برعکس شاہ بلوط کے درخت اتنی آسانی سے موت کا شکار نہیں ہوتے۔

ایک بےنام چھوٹی سی ندی کے کنارے شاہ بلوط کے پرانے درخت کے تنے پر ایک جرمن گولا آکر لگا۔ آدھا درخت چر مرا گیا اور گہرے زخم سے ادھڑ کر مرگیا لیکن دوسرا حصہ جو دھماکے کے زور سے ندی کی طرف جھک گیا تھا بہار میں پھر سے جی اٹھا اور اس میں نئی پتیاں نکل آئیں۔ مجھے امید ہے آج بھی اس کٹے چھنٹے معذور درخت کی نچلی ٹہنیاں دریا میں ڈبکیاں لگاتی ہوں گی اور اوپروالی اپنی تنی ہوئی تراشیدہ پتیاں بلند ہوکر سورج کی حرارت سے فیض حاصل کررہی ہوں گی...

* * *

لفٹنٹ گیراسیموف لمبے قد کا آدمی تھا۔ اس کے چوڑے چکلے شانے چیل کے بازوؤں کی طرح قدرے خمیدہ تھے۔ وہ اپنی خندق میں داخل ہونے کے راستے کے پاس بیٹھا اس روز کی لڑائی کا اور بٹالین نے جرمن ٹینکوں کے حملے کو جس طرح پسپا کیا تھا اس کا تفصیلی حال سنا رہا تھا۔

لفٹنٹ کا ستا ہوا، جذبات سے قریب قریب عاری چہرہ پرسکون تھا اور اس کی لال لال آنکھوں کے گرد تکان سے حلقے پڑ گئے تھے۔ وہ بھاری اور پھٹی پھٹی آواز میں بول رہا تھا۔ بڑی بڑی گٹھیلی

میرے کنبے میں بیوی، دو چھوٹے چھوٹے بچے اور معذور باپ ھیں۔ خیر تو جب وہ مجھے خیرباد کہنے آئے تو بیوی ظاھر ھے رو دھو رھی تھی اور چلتے وقت ان الفاظ کے ساتھ مجھے رخصت کیا: 'ملک کی اور ھماری حفاظت اپنی پوری قوت سے کرنا۔ ضرورت پڑے تو جان بھی لڑا دینا، مگر دیکھنا جیت ھماری ھو۔'، مجھے یاد ھے کہ اس کی بات پر میں ھنس دیا تھا اور کہا تھا: 'تم میری کون ھو، بیوی یا خاندان کی سیاسی معلم؟ میں خود سمجھدار ھوں، اور رھی جیت کی بات، تو تم فکر مت کرو، جرمنوں کے گلے کاٹ کر، پیٹ چیر کر بھی حاصل کرنی ھوئی تو کریں گے۔'

"میرے والد، ظاھر ھے کہ پکی مٹی کے ھیں، وہ روئے نہیں، مگر نصیحت کرنا انہوں نے بھی ضروری سمجھا: 'یاد رکھنا، وکتور، گیراسیموف نام محض ایک نام سے کچھ زیادہ ھے۔ تم موروثی صنعتی مزدور ھو۔ تمہارے پردادا استروگانوف* کے ھاں ایک مزدور تھے، اتنا پرانا خاندانی پیشہ ھے ھمارا۔ صدھا برس سے ھمارا خاندان روس کے لئے لوھا بنا رھا ھے اور اس جنگ میں تم کو بھی لوھا بن جانا چاھئے۔ ریاست نے، یاد رکھو، تمہاری ریاست نے تم کو جنگ شروع ھونے تک محفوظ فوجی افسر بنا کر رکھا ھے اور اب، دشمن کی تمہیں خوب ھی مرمت کرنی ھے، سمجھے؟'، اور میں نے جواب دیا تھا: 'ایسا ھی کروں گا۔'

"ریلوے اسٹیشن جاتے ھوئے راستے میں میں ضلع پارٹی کمیٹی کے دفتر گیا۔ ھمارے سیکریٹری خاصے خشک مزاج تھے اور میں سوچ رھا تھا کہ اگر میری بیوی اور میرے والد نے الوداعی باتوں میں اتنا کچھ کہا ھے تو یہ حضرت تو لمبی چوڑی تقریر کرکے ھی دم لیں گے۔ یہ سب غلط نکلا! 'بیٹھو گیراسیموف، وہ بولے 'پرانے رواج کے مطابق روانہ ھونے سے پہلے ذرا کی ذرا بیٹھ جاؤ۔'، دو ایک منٹ تک ھم چپ چاپ بیٹھے رھے اور پھر وہ اٹھے۔ میں نے دیکھ لیا کہ ان کے چشمے کے تال کچھ دھند لائے ھوئے تھے۔ خیر تو ھے، میں نے دل ھی دل میں سوچا، لوگوں کو کیا ھوگیا ھے! اور اب ھمارے سیکریٹری بولے: 'سب کچھ اتنا صاف ھے کہ زیادہ کچھ کہنے کی

---

*یورال کے سوداگروں اور کارخانہداروں کا ایک کنبہ جس کی تاریخ سترھویں صدی تک جاتی ھے۔ (ایڈیٹر)

ہے۔ آپ کو معلوم نہیں، وہ جرمنوں کا قیدی رہ چکا ہے؟ کبھی اس سے پوچھیئےگا۔ وھاں جو جو مصیبتیں اس نے اٹھائی ھیں اس کے بعد وہ کسی جرمن کو دیکھنا برداشت ھی نہیں کرسکتا، میرا مطلب ہے زندہ جرمنوں کو۔ مردہ ھوں تو کوئی بات نہیں۔ لیکن جب جرمن قیدیوں کو دیکھ لیتا ہے تو اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے اور وھیں بیٹھے بیٹھے اس کا زرد چہرہ پسینے پسینے ھو جاتا ہے یا پھر وہ اٹھ کر چلا جاتا ہے۔،، اس نے سرگوشی کا لہجہ اختیار کرتے ھوئے میرے پاس آکر کہا: ''دو بار میں اس کے ساتھ حملے پر گیا۔ اس میں گھوڑے کی طاقت ہے۔ وہ کیا کچھ کر سکتا ہے یہ چیز دیکھنے ھی سے تعلق رکھتی ہے... میں نے ھر طرح کی چیزیں دیکھی ھیں مگر اسے سنگین چلاتے یا بندوق کے کندے سے ضربیں لگاتے دیکھ کر رونگٹے کھڑے ھو جاتے ھیں۔،،

* * *

اس رات جرمنوں کی بھاری توپوں نے پریشان کرنے کے لئے گولہ باری کی۔ مقررہ وقفے سے باقاعدہ گولہ باری ھوتی رھی۔ پہلے پہل دور کہیں گولے چلنے کی آواز آتی، چند لمحوں بعد ھمارے اوپر تاروں بھرے آسمان میں گولوں کی آھنی چیخ سنائی دیتی، اس کی گونج بڑھتی اور پھر رفتہ رفتہ غائب ھو جاتی اور پھر ھمارے پیچھے کہیں اس سڑک کی سمت سے جہاں دن بھر گولہ بارود محاذ پر پہنچانےوالی لاریوں کا تانتا بندھا رھا تھا، زرد شعلہ چمکتا اور دھماکے کی زوردار گرج سنائی دیتی۔

بیچ بیچ میں جب کبھی جنگل پر خاموشی چھا جاتی تو ھمیں باریک آوازوں میں مچھروں کی گنگناھٹ سنائی دیتی اور خوفزدہ مینڈک قریب ھی ایک چھوٹے سے پوکھر میں سہمی سہمی آواز میں ایک دوسرے کو پکارنے لگتے۔

ھم ایک جھاڑی کے نیچے لیٹے ھوئے تھے اور لفٹنٹ گیراسیموف ٹوٹی ھوئی ٹہنی سے ان مچھروں کو بھگاتے ھوئے جو بہت ستا رہے تھے، اپنے انداز سے مجھے اپنے متعلق بتا رھا تھا۔ اپنے حافظے کے مطابق اس کا سنایا ھوا قصہ میں آپ کو بھی سناتا ھوں۔

''جنگ سے پہلے میں مغربی سائبیریا کی ایک فیکٹری میں مستری کا کام کرتا تھا۔ پچھلے سال نویں جولائی کو مجھے بھرتی کیا گیا۔

کرتا۔ واقعی ان مشینوں کے بنانے والے ھاتھ کاریگروں کے تھے اور جرمن مصنفوں کی کتابوں کو بھی میں پسند کرتا تھا اور جرمن عوام کی میرے دل میں بڑی عزت تھی۔ مانا کہ بعض اوقات یہ سوچ کر کراھیت آتی کہ ایسی جفاکش اور چابکدست قوم ھٹلر کی طفیلی حکومت کو کیسے برداشت کئے ھوئے ھے، لیکن بہرحال، یہ ان کا اپنا معاملہ تھا۔ اور پھر مغربی یورپ میں جنگ شروع ھوگئی...

''چنانچہ میں محاذجنگ کی طرف جا رھا تھا اور سوچ رھا تھا کہ جرمنوں کے پاس طاقتور مشینیں ھیں، اور ان کی فوج بھی کچھ معمولی نہیں ھے۔ میں نے سوچا: ایسے دشمن سے دو دو ھاتھ ھو جائیں اور اس کو دھول چٹا دی جائے تو بڑا مزہ رھے۔ ھم بھی آپ جانیں، بدھو تو ھیں نہیں۔ ظاھر ھے مجھے یہ امید ھرگز نہیں تھی کہ لڑائی میں وہ کوئی خاص ایمانداری برتیں گے — جب واسطہ فاشزم سے ھو تو ایمانداری کی بھلا کون امید کرسکتا ھے؟ — لیکن ھٹلر کی فوج جیسی پاجی ذلیل نکلی ایسی فوج سے لڑنے کی ھمیں کبھی توقع نہیں تھی۔ چلئے چھوڑیئے، ابھی میں اس کا ذکر نہیں کرونگا...

''جولائی کے آخر میں ھمارا دستہ محاذ پر پہنچا۔ ستائیسویں تاریخ کو ھم لڑائی میں شامل ھوئے۔ پہلے پہل تو ذرا خوف آیا۔ ان کی توپوں کی گولہ‌باری نے بڑا ھی پریشان کیا لیکن دن ڈوبنے سے پہلے ھمارے قدم جم گئے اور جس گاؤں پر انھوں نے قبضہ کرلیا تھا وھاں سے مار بھگایا۔ اس معرکے میں ھم نے کوئی پندرہ قیدی پکڑے۔ مجھے یوں یاد ھے جیسے کہ یہ کل ھی کا واقعہ ھو۔ ان کو جب لایا گیا تو وہ خوفزدہ تھے، منہ پر ھوائیاں اڑ رھی تھیں۔ میرے جوان معرکے کے بعد اب ٹھنڈے پڑچکے تھے اور اب ان میں سے ھر ایک جرمنوں کی جس طرح بن پڑ رھا تھا خاطر کرنا چاھتا تھا — کوئی شوربے کا پیالہ بڑھاتا تو کوئی تمباکو، سگریٹ، چائے، یا جو تھا پیش کر رھا تھا۔ جرمنوں کی پیٹھ پر کوئی ھاتھ رکھتا، کوئی جرمن لہجے میں کامریڈ کہتا اور ان سے پوچھتا کہ وہ کس مقصد کے لئے لڑ رھے ھیں۔

''ایک بوڑھا فوجی پیار محبت کے اس منظر کو تھوڑی دیر تک تو دیکھتا رھا اور پھر جوانوں سے بولا: 'اپنے ''کامریڈوں،، کی خاطر مدارات تم بڑے جذباتی بن کر کر رھے ھو۔ یہاں سب کامریڈ ھیں، یہ تو درست مگر انہیں کامریڈوں کو ذرا مورچوں کے اس پار

ضرورت نہیں، کامریڈ گیراسیموف۔ مجھے تمہارے ان دنوں کے مڑے ہوئے کان یاد ہیں جب تم نوعمر پائنیروں کی لال ٹائی باندھا کرتے تھے، کوسسومول کے میمبر کی حیثیت سے تم مجھے یاد ہو اور پورے دس برس سے میں تم کو کمیونسٹ کی حیثیت سے جانتا ہوں۔ جاؤ اور ان حرامزادوں کو بغیر ترس کھائے مارو۔ پارٹی تنظیم کو تم پر پورا اعتماد ہے۔، سیکریٹری نے مجھے گلے سے لگایا، ہم نے رواج کے مطابق الوداعی بوسہ لیا اور واللہ وہ مجھے روکھے پھیکے ذرا بھی نہیں لگے... ان کا خلوص دل کو اس قدر گرما دینےوالا تھا کہ دفتر سے جب باہر نکلا تو واقعی خوشی سے دل بلیوں اچھل رہا تھا۔

''اور پھر میری بیوی نے مجھے خوب ہنسایا۔ آپ تو جانتے ہیں شوہر کو لڑائی پر جاتے وقت رخصت کرنا بیوی کے لئے کوئی کھیل نہیں ہوتا اور قدرتی بات ہے میری بیوی کے ہوش بجا نہیں تھے، وہ اسی کوشش میں رہی کہ مجھ سے کوئی اہم بات کہے مگر اس کے خیالات سب گڈمڈ ہو رہے تھے اور اس کو یاد ہی نہ رہتا کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ ریل روانہ ہو چکی تھی۔ پلیٹ‌فارم پر وہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی، کھڑکی کے بالکل قریب، میرا ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے اور جلدی جلدی باربار کہے جارہی تھی: 'دیکھو احتیاط رکھنا، وکتور، محاذ پر ٹھنڈ نہ لگ جائے، اچھی طرح اپنی احتیاط کرنا!'، اور میں نے اسے جواب دیا تھا: 'اچھا اچھا نادیا، میں ٹھنڈ ہرگز نہ لگنے دوں گا۔ محاذ پر آب و ہوا بہت ہی اچھی اور واقعی بڑی معتدل ہے۔'، میری بیوی کی پیاری پیاری، احمقانہ باتوں نے الوداعی لمحات کے میرے تکلیف دہ درد کو رفع کردیا تھا اور جرمنوں پر تو سارے غصے کے دیوانہ ہوگیا تھا! اچھا تو دغاباز پڑوسیو، میں نے دل ہی دل میں کہا، تم نے شروع کیا ہے تو پھر اس کا خمیازہ بھگتنے کو بھی تیار ہو جاؤ! تمہارے کئے کی سزا تم کو ضرور ملیگی اور اس سے بھی زیادہ ملیگی!،،

اچانک دور کہیں دونوں طرف سے مشین گنیں چلنے کی آواز آنے لگی اور اس کو سننے کے لئے گیراسیموف چپ ہوگیا اور آتش‌باری کے رکتے ہی اس نے اپنا قصہ پھر شروع کردیا:

''جنگ سے پہلے ہمارے ہاں مشینیں جرمنی سے آیا کرتی تھیں۔ ہم ان مشینوں کے پرزے جب یکجا کرتے تو میں ہر پرزے کو کم از کم پانچ بار ٹٹولتا، اور گھما پھرا کر چاروں طرف سے دیکھا

ہوئی... آٹھ مقتول فوجیوں کو زمین پر تلے اوپر ڈھیر کیا ہوا تھا۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ کونسا عضو کس جسم کا ہے۔ گوشت کے محض بڑے بڑے لوتھڑے تھے اور اس ڈھیر کے اوپر سوویت فوجیوں کی آٹھ ٹوپیاں نہایت صفائی کے ساتھ ایک میں ایک پھنسا کر رکھ دی گئی تھیں...

''وہاں جو جو کچھ دیکھا کیا آپ کی رائے میں کوئی شخص پوری تفصیل سے بیان کر سکتا ہے؟ نہیں کرسکتا۔ ایسے الفاظ موجود ہی نہیں ہیں۔ یہ منظر تو صرف آنکھوں سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ اور بہرحال، اس موضوع کو یہیں چھوڑئیے،، گیراسیموف نے جھنجھلا کر کہا اور بڑی دیر تک چپ چاپ رہا۔

''سگریٹ پی سکتے ہیں یہاں؟،، میں نے پوچھا۔

''ضرور، لیکن مٹھی میں چھپا کر،، اس نے بھاری آواز میں کہا۔

خود اس نے بھی سگریٹ سلگالی اور سلسلۂ کلام جاری کردیا:

''نازیوں کے یہ سارے مظالم دیکھ کر آپ جانیں ہم وحشی ہو گئے اور ہونا ہی تھا۔ ہم سب اچھی طرح جان گئے کہ ہمارا آمنا سامنا انسانوں سے نہیں بلکہ خون کے پیاسے درندوں سے ہے۔ ہمارے لوگوں کو وہ اسی کمال سے ایذائیں پہنچاتے، عصمت دری کرتے اور موت کے گھاٹ اتار دیتے تھے جس طرح کہ کبھی وہ اپنے مشینی اوزار بنایا کرتے تھے۔

''بعد میں ہمیں پھر پسپا ہونا پڑا تھا، لیکن لڑے ہم دیوانوں کی طرح۔

''میری کمپنی میں قریب قریب تمام لوگ سائبیریائی تھے لیکن یوکرینی سرزمین کی ہم نے واقعی بےجگری سے مدافعت کی۔ میرے بہت سے ہموطن یوکرین میں شہید ہوئے مگر ان سے کہیں زیادہ جرمن ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ ہم پسپا ہو رہے تھے مگر پھر بھی ان کو خوب ہی مزہ چکھایا۔،،

سگریٹ کا زوردار کش لیتے ہوئے لفٹنٹ گیراسیموف نے اب مختلف، نرم لہجے میں کہنا شروع کیا:

''یوکرین کی زمین بڑی نفیس ہے اور مناظر نہایت حسین! ہر گاؤں، چھوٹا ہو یا بڑا، ہمیں اپنے وطن جیسا پیارا لگا، شاید اس لئے کہ ہم نے وہاں کی زمین اپنے خون سے سینچی تھی اور کہتے ہیں کہ

دیکھنا کہ ہمارے زخمیوں سے، شہری آبادی سے کیسا سلوک کرتے ہیں!، یہ کہہ کر وہ تو چلا گیا مگر ہمیں ایسا لگا جیسے کسی نے بالٹی بھر ٹھنڈا برف پانی ہمارے منہ پر پھینک دیا ہو۔

''جلد ہی ہم نے بڑھ کر حملہ کیا اور جو منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے وہ واقعی وحشتناک تھے۔ گاؤں کے گاؤں جلا کر خاکستر کر ڈالے گئے تھے، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو سیکڑوں کی تعداد میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا، جنگی قیدیوں — خود ہمارے سوویت جوانوں کی مسخ شدہ لاشیں، عورتوں، جوان لڑکیوں اور محض بچیوں کی لاشیں جن کی عصمت‌دری کرکے بےرحمی سے قتل کردیا گیا تھا...

''ان میں سے ایک کو میں کبھی بھی فراموش نہ کر سکوں گا۔ کوئی گیارہ برس کی بچی تھی، ایسا لگتا تھا کہ وہ اسکول جارہی تھی۔ جرمنوں نے اسے پکڑ لیا، گھسیٹ کر اس کو کسی کے پائیں باغ میں لے گئے، عصمت‌دری کی اور اس کو مار ڈالا۔ وہ آلو کے روندے ہوئے چھوٹے سے کھیت میں پڑی تھی۔ چھوٹی سی لڑکی، بچی سے کچھ ہی زیادہ، اور اس کے چاروں طرف اس کی کتابیں تتربتر پڑی تھیں، خون میں تربتر۔ اس کے چہرے پر کرچ سے بھرپور وار کیا گیا تھا اور وہ بری طرح مسخ ہو گیا تھا... ہاتھ میں وہ اپنا بستہ دبوچے ہوئے تھی جس کا منہ کھلا تھا۔ ہم نے اس کی لاش کو ایک برساتی سے ڈھانک دیا اور خاموش کھڑے ہوگئے۔ پھر میری ٹکڑی کے جوان چپ چاپ اپنی اپنی راہ چلے گئے لیکن میں وہیں کھڑا خبطیوں کی طرح بڑبڑاتا رہا: 'بارکوف اور پولووینکن۔ طبیعیاتی جغرافیہ۔ سات یا دس سالہ اسکولوں کے لئے نصابی کتاب۔'، لڑکی کے بستے سے گری ہوئی ایک کتاب کے سرورق پر میں نے یہ عبارت پڑھی تھی۔ اس نصابی کتاب سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ میری بیٹی بھی پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی۔

''یہ روژین سے کچھ ہی دور کا واقعہ ہے اور اسکویرا سے کچھ دور ایک گھاٹی میں ہمیں وہ جگہ ملی جہاں جرمنوں نے ان سوویت فوجیوں کو ایذائیں پہنچا پہنچا کر قتل کیا تھا جن کو انہوں نے قیدی بنا لیا تھا۔ کیا آپ کبھی قصاب خانے میں گئے ہیں؟ بس، وہ جگہ بالکل ایسی ہی لگ رہی تھی۔ بےبازو، بےٹانگوں کے جسم گھاٹی کے پاس درختوں کی شاخوں میں لٹکے ہوئے، کھال آدھی ادھڑی

جس کسی نے میرے سر پر پٹی کی تھی وہ عجلت میں تھا کیونکہ پٹی کا سرا اڑسا ہوا نہیں تھا اور میرے سینے پر پڑا تھا۔ ہوش میں آتے ہی پہلا خیال یہ ہوا تھا کہ میرے جوان مجھے یہاں لے آئے ہیں اور بھاگتے بھاگتے میری مرہم پٹی کردی گئی ہے اور بمشکل سر اٹھا کر دیکھتے ہوئے انہیں کے نظر آنے کی توقع تھی۔ لیکن جو لوگ دوڑ کر میری طرف آ رہے تھے وہ جرمن تھے۔ وہ مجھے بالکل صاف نظر آ رہے تھے جیسے کسی فلم میں دیکھ رہا ہوں۔ ہاتھوں سے ٹٹول کر آس پاس دیکھا کہ قریب کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ نہ کوئی پستول، نہ بندوق، یہاں تک کہ کوئی دستی گولہ بھی نہیں تھا۔ میرے ہی کچھ آدمیوں نے نقشوں کا ڈبہ بھی نکال لیا ہوگا اور میرے ہتھیار بھی۔

’’ ’لو اب موت آ گئی۔ ، میں نے سوچا۔ اس لمحے میں نے اور کیا سوچا؟ کچھ بھی نہیں۔ اگر آپ اپنے آئندہ ناول کے لئے کچھ جاننا چاہتے ہوں، تو خود ہی کچھ سوچ کر لکھ دیجیئگا کیونکہ واقعی کچھ اور سوچنے کی مجھے قطعاً مہلت نہیں تھی۔ جرمن بہت نزدیک پہنچ چکے تھے اور میں لیٹے لیٹے مرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیٹے لیٹے میں قطعی نہیں مرنا چاہتا تھا، سمجھے آپ؟ میں نے اپنی رہی سہی ساری قوت مجتمع کی اور چاروں ہاتھوں اور پیروں سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ جرمنوں کے پہنچتے پہنچتے میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں کھڑے ہوکر جھوم رہا تھا اور خوف اس بات کا طاری تھا کہ میں گرپڑونگا اور وہ لیٹے ہی لیٹے مجھے تہ تیغ کردیں گے۔ مجھے صورت ایک کی بھی یاد نہیں۔ وہ مجھے گھیر کر کھڑے ہوگئے تھے اور آپس میں باتیں کرکے قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا: ’آؤ، مار ڈالو مجھے، حرامزادو ! مجھے گرنے سے پہلے مار ڈالو۔ ، ان میں سے ایک نے اپنی بندوق کا کندہ میری گردن پر مارا۔ میں گرپڑا مگر سنبھل کر پھر اٹھا۔ سب نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ان میں سے ایک نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور مجھے چلنے کا حکم دیا۔ میں چلا۔ میرے پورے چہرے پر خون کی پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ سر کے زخم سے تازہ خون کی ایک باریک سی لکیر اب بھی جاری تھی۔ شانے میں سخت درد تھا اور دایاں ہاتھ اٹھایا نہیں جاتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرا جی کس قدر چاہ رہا تھا کہ فوراً زمین پر لیٹ جاؤں اور کہیں نہ جاؤں مگر پھر بھی میں چل پڑا...

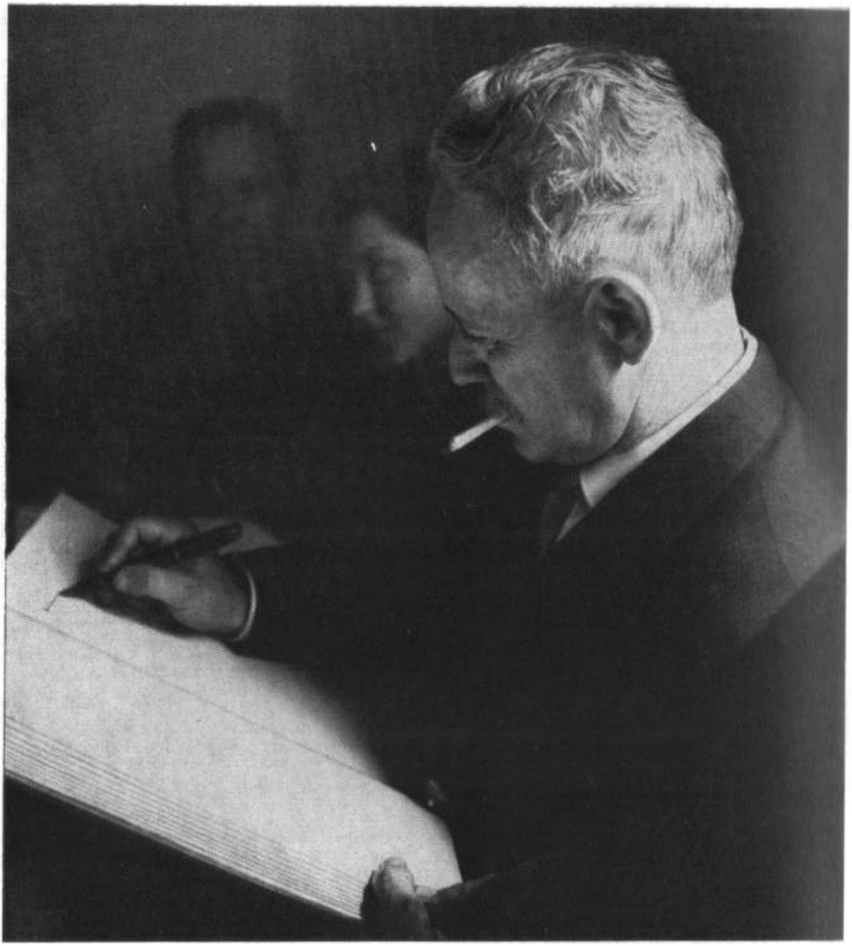
’’ نہیں، میں مرنا ہرگز نہیں چاہتا تھا اور قید میں رہنا تو بالکل

خون لوگوں میں بھائیوں کا رشتہ پیدا کردیتا ہے... اور جب ہمیں کوئی گاؤں چھوڑ کر پیچھے ہٹنا پڑتا تو بیچارے دل کو مسوس کر رہ جاتے تھے۔ ہمیں اتنا افسوس ہوتا، اور اتنا ملال ہوتا کہ پیچھے ہٹتے وقت ایک دوسرے کی آنکھ سے آنکھ نہ ملاپاتے تھے۔

''...میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ کبھی قید سے پالا پڑے گا۔ مگر ہونی ہوکر رہی۔ پہلی بار میں ستمبر کے شروع میں زخمی ہوا تھا مگر میں اپنی صفوں ہی میں رہا۔ دوسری بار اکیسویں ستمبر کو علاقہ پولتاوا کے گاؤں دینیسوفکا کی لڑائی میں زخمی ہوا اور وہاں مجھے قیدی بنا لیا گیا۔

''جرمن ٹینکوں نے ہمارے میسرے کو توڑ دیا اور ان کے بعد پیدل فوج اندر گھس آئی۔ ہم لڑتے ہوئے اس محاصرے کو توڑ کر نکل رہے تھے۔ اس روز میری کمپنی کو زبردست نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ دو بار ہم نے ان کے حملے پسپا کئے، ان کے چھ ٹینکوں کو آگ لگادی اور ایک بکتربند گاڑی پھونک دی اور مکئی کے کھیت میں کوئی ایک سو بیس ہٹلریوں کی لاشیں بچھا دیں۔ لیکن پھر وہ اپنی توپیں گھسیٹ لائے اور دوپہر سے لیکر سہ پہر چار بجے تک ہم جس بلند مقام پر قابض رہے تھے اس کو ہمیں چھوڑنا پڑا۔ صبح سویرے ہی سے سخت گرمی تھی، آسمان میں بادل کا ایک ٹکڑا بھی نہ تھا، اور دھوپ اس قدر تیز تھی کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ گولے دنادن گر رہے تھے، اور مجھے یاد ہے ہم سب کے مارے پیاس کے منہ خشک تھے، ہونٹ سیاہ پڑگئے تھے اور خود میرا گلا اس قدر خشک ہو گیا تھا کہ حکم دیتے وقت عجیب پھٹی پھٹی سی آواز نکل رہی تھی۔ ہم بھاگ کر ایک گڈھا پار کر رہے تھے کہ ایک گولا میرے سامنے آن کر پھٹا۔ اس ایک لمحے میں مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے گرد و غبار کا ایک کالا بادل سا زمین سے اٹھتا ہوا دیکھا اور پھر کچھ ہوش نہ رہا۔ گولے کا ایک ٹکڑا میرے خود کو چیرتا ہوا گزر گیا تھا اور دوسرے نے میرے داھنے شانے کو چھید ڈالا تھا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ میں وہاں کب تک پڑا رہا۔ لیکن جب ہوش آیا تو قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ اس جگہ نہیں ہوں جہاں زخمی ہوا تھا۔ کسی نے میرا کوٹ اتار دیا تھا اور شانے پر پٹی باندھ دی تھی۔ میرا خود غائب تھا اور



بھی نہیں ۔ سر چکرا رہا تھا، متلی ھو رھی تھی، مگر ان سب پر قابو پا کر میں چلتا رہا، اور اس کے معنے یہ تھے کہ میں زندہ تھا، مجھ میں عمل کی صلاحیت اب بھی باقی تھی ۔ اللہ، کس قدر شدت کی پیاس تھی! منہ بالکل خشک ھوچکا تھا، آنکھوں کے سامنے جیسے سیاہ نقاب لہرا رھی تھی ۔ میں قریب قریب بیہوش تھا مگر چلے چلا جا رہا تھا اور دل ھی دل میں کہہ رہا تھا : ’ تھوڑا سا پانی اور کچھ آرام مل جائے تو فوراً بھاگ کھڑا ھوں ۔ ‘

”ھم سب قیدیوں کو جنگل کے باھر جمع کرکے قطاریں لگوائی گئیں ۔ بیشتر جوان دوسرے دستے کے تھے اور صرف دو میری رجمنٹ کی تیسری کمپنی کے تھے ۔ بیشتر قیدی زخمی تھے ۔ ٹوٹی پھوٹی روسی میں جرمن لفٹنٹ نے پوچھا کہ ھم میں کوئی کمیسار یا افسر ھے ۔ کسی نے جواب نہیں دیا ۔ پھر اس نے کہا : ’ کمیسار اور افسر، دو قدم آگے! ‘ کسی نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی ۔

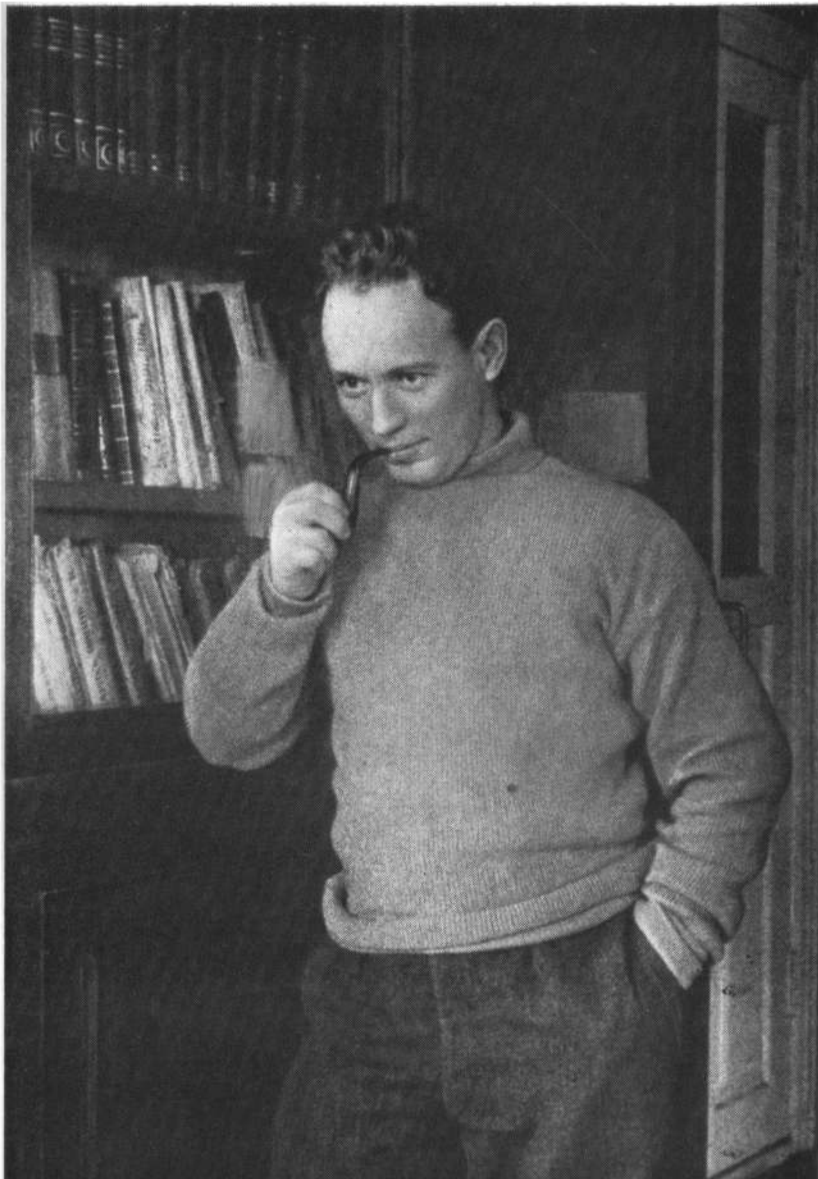
”لفٹنٹ آھستہ آھستہ قطار کے سامنے سے گزرا اور پندرہ سولہ آدمیوں کو جو صورت سے یہودی لگے چن لیا ۔ ’ یہودی ؟ ‘ ، اس نے ان آدمیوں میں سے ھر ایک کے سامنے رک کر پوچھا تھا اور ان کے جواب کا انتظار کئے بغیر انہیں قطار سے باھر نکل آنے کا حکم دیا تھا ۔ بیشتر یہودی ھی تھے مگر کچھ آرمینیائی اور روسی بھی تھے جن کے بال سیاہ اور رنگت سانولی تھی ۔ ان کو ایک طرف لیجا کر ھماری آنکھوں کے سامنے گولی سے اڑا دیا گیا ۔ اس کے بعد جلدی جلدی ھماری جامہ تلاشی لی گئی ۔ ھمارے بٹوے اور جو کچھ بھی ھمارے پاس تھا وہ چھین لیا گیا ۔ میں اپنا پارٹی کارڈ بٹوے میں کبھی نہیں رکھتا تھا کہ کہیں کھو نہ جائے ۔ اس کو میں اپنی پتلون کی جیب میں رکھتا تھا اور تلاشی کے وقت وہ جرمنوں کے ھاتھ نہ لگا ۔ میں تو کہوں گا انسان عجیب مخلوق ھے! مجھے معلوم تھا کہ میری جان کو سخت خطرہ ھے ۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر بھاگ نکلنے کی کوشش میں نہ مارا گیا تو راستے میں ماردیا جاؤنگا کیونکہ خون نکل جانے کی وجہ سے میں اتنا کمزور ھو گیا تھا کہ باقیوں کے ساتھ پیدل نہ چل سکوں گا ۔ اور پھر بھی مجھے بےحد خوشی تھی کہ پارٹی کارڈ محفوظ ھے، اتنی کہ اپنی پیاس تک کو بھول گیا ۔

”پورے جتھے کو مغرب کی طرف پیدل روانہ کردیا گیا ۔ سڑک کے دونوں طرف بہت بڑا محافظ دستہ ساتھ تھا ۔ اور کوئی دس آدمی موٹرسائیکلوں پر سوار تھے ۔ ھم کو تیز چال سے چلنے پر مجبور کیا جا رہا



ان کے بیٹے ۔
نین کے جلسے میں جس میں فیکٹری کے مزدوروں نے شرکت کی ۔





مىخائىل شولوخوف ١٩٣٦ ـ يىلى



نووچیرکاسک ـ میمبر اور ان کے ووٹر ـ

محاذ جنگ پر ـ ادیب یوگینی پیروف، میخائل سولوحوف اور الکساندر فادیئف ان آلات کا معائنہ کر رہے ہیں جو ایک تباہ شدہ جرمن ٹینک سے نکالے گئے ہیں ـ





سنہ تیس کی دہائی کی ایک تصویر ۔



۱۹۴۴ء-



میخائل شولوخوف توپچیوں کے ایک دستے کے ساتھ۔

جرنیل لفٹنٹ ڈونیف میخائل شولوخوف اور الکساندر فادیئف سے باتیں کر رہے ہیں۔





ویشنسدیا کا ایک منظر۔

ویشنسدیا کی ایک سڑک۔





مجاہدین وطن ۔

شولوخوف پیدل فوج کے دستے کی کمان کی ایک چوکی پر ۔





...خوف اور ان کی اہلیہ ماریا پیتروونا ناشتے کی میز پر۔
...ف اپنے کام میں مصروف ہیں۔





ویشنسکایا ۔ پل کی طرف جانے والی سڑک ۔

مصنف کے گھر سے ساحل دان کا منظر ۔





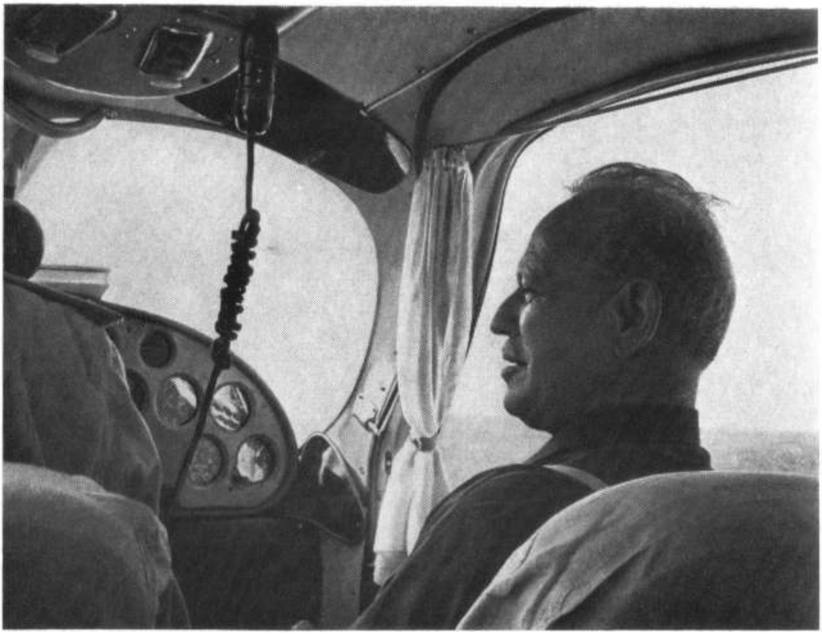
کنبے کی ایک تصویر ۔

مچھلی کا شکار ۔





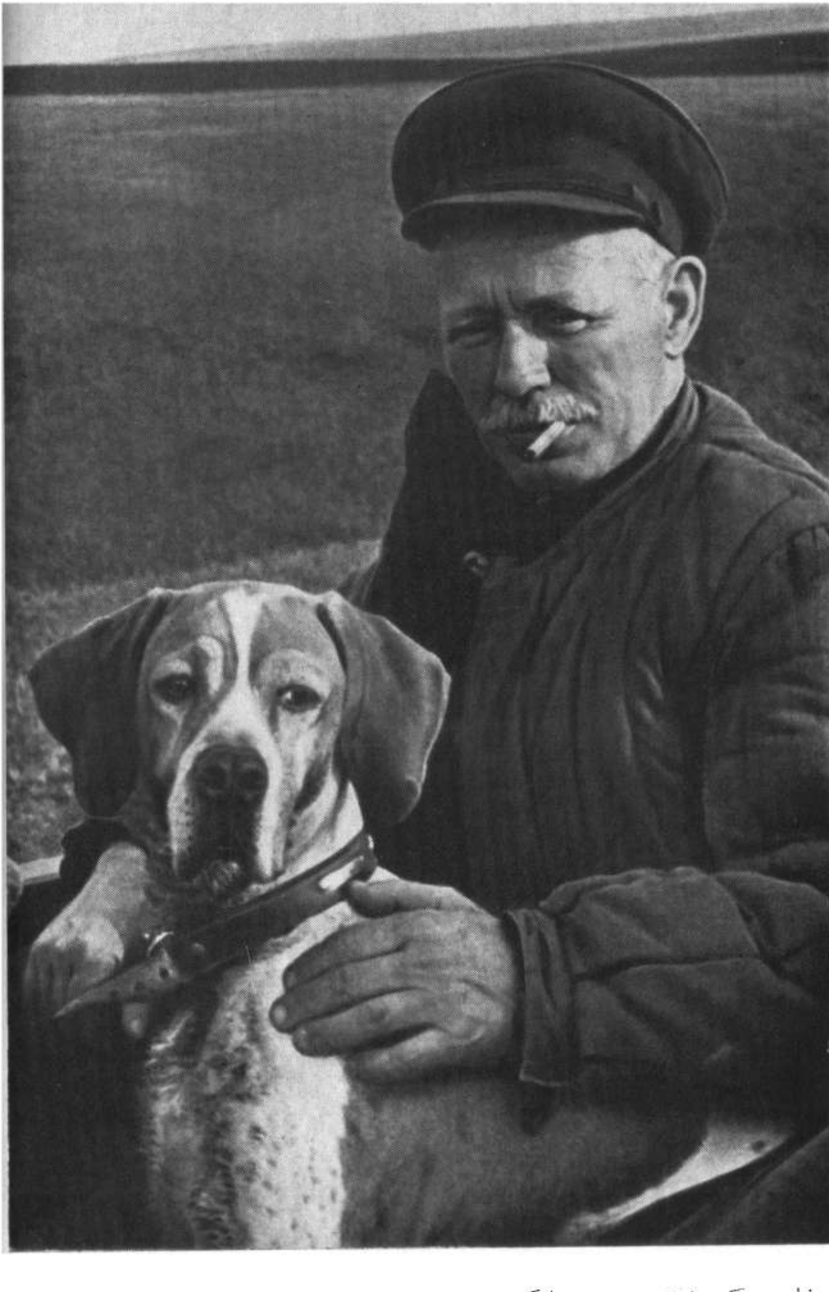
شولوخوف اور ان کی اہلیہ اپنے پائیں باغ میں ۔



وادیٔ ڈان پر پرواز۔

فلم ''مقدر انسان کا،، کی شوٹنگ کے دوران۔





مرغابی کے شکار پر روانگی۔

تھا اور میری طاقت رفتہ رفتہ جواب دیتی جارہی تھی۔ دو مرتبہ میں گرا، اٹھا اور پھر چل پڑا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اگر دوسرے لمحے زمین پر پڑا رہا اور دستہ آگے بڑھ گیا تو وہیں سڑک پر گولی مار دی جائےگی۔ میرے آگےوالی قطار میں ایک سارجنٹ کے ساتھ یہی ہوا۔ اس کی ٹانگ میں زخم تھا اور وہ بمشکل چل پا رہا تھا۔ وہ کراہتا رہا اور جب تکلیف برداشت سے باہر ہوگئی تو رو بھی دیا۔ کوئی ایک کاوسیٹر چلنے کے بعد اس نے بہ‌آوازبلند کہا: 'نہیں، اب نہیں چلا جاتا۔ خدا حافظ ساتھیو۔' اور وہ بیچ سڑک پر بیٹھ گیا۔ بغیر رکے، لوگوں نے اسے اٹھانے اور پیروں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پھر بیٹھ رہا۔ خواب کی طرح مجھے اب بھی اس کا زرد، پرشباب نوجوان چہرہ، سکڑی ہوئی بھنویں اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں یاد ہیں... دستہ آگے بڑھ گیا۔ میں مڑا تو دیکھا کہ موٹرسائیکل‌سوار ایک محافظ آ کر سارجنٹ کے پاس رکا، اپنا پستول نکالا اور اس کی کنپٹی پر رکھ کر داغدیا۔ آپ جانتے ہیں وہ اپنی موٹرسائیکل سے اترا تک نہیں۔ دریا تک پہنچنے سے پہلے جرمنوں نے اس طرح پیچھے رہ جانے والے کئی دوسرے قیدیوں کو گولی مار دی تھی۔

''اب دریا نظر آنے لگا تھا، اس کا پل بھی جو اڑا دیا گیا تھا، اور لاری جو ایک سرے پر پھنس گئی تھی۔ یہاں پہنچکر میں منہ کے بل سڑک پر گرگیا۔ نہیں، میں بیہوش نہیں ہوا تھا۔ میں وہیں ٹانگیں پھیلائے پڑا رہا، دھول منہ میں بھر گئی تھی، شدید غصے کے مارے دانت کٹکٹا رہا تھا مگر اٹھتے کسی طرح نہ بن پڑ رہی تھی۔ لوگ میرے پاس سے گزرتے چلے جارہے تھے۔ ان میں سے ایک نے دھیرے سے کہا: 'چلو، اٹھ کھڑے ہو، ورنہ تمہیں گولی ماردیں گے۔' میں نے اپنا منہ کھرچ لیا اور آنکھیں نوچ ڈالیں تاکہ تکلیف کی شدت مجھے اٹھ کھڑے ہونے میں مدد دے...

''دستہ گزر چکا تھا اور مجھے موٹرسائیکل قریب آتی سنائی دے رہی تھی اور میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ متوقع جلاد کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر، شرابی کی طرح جھومتا ہوا آ کر دستے میں پھر شامل ہوگیا اور ساتھ چلنے لگا۔ جرمن ٹینکوں اور گاڑیوں نے جو ابھی ابھی اس چھوٹی سی ندی کو پار کرکے کنارے آئی تھیں پانی کو گدلا کردیا تھا لیکن ہم اس گرم اور گدلے پانی پر ٹوٹ پڑے اور یہ کیچڑ ہمیں چشمے کے شفاف پانی سے بھی زیادہ میٹھی معلوم ہوئی۔ میں نے اپنے سر اور زخمی شانے کو پانی سے دھویا اور مجھ میں حیرت‌انگیز تازگی آ گئی۔ اب مجھ میں چلتے رہنے



آج کے داویدوووں کے درمیان (لینن گراد کے کیروف کارخانے میں)۔

میں ایک بار کھانا اور پانی ملتا تھا ــ ایک مگا پانی اور مٹھی بھر کچی کدووں یا سورج مکھی کے سڑے ہوئے بیج ۔ کسی کسی دن تو قیدیوں کو محافظ کھلانا ھی بھول جاتے تھے ۔

''ھمیں وھاں پہنچے تیسرا ھی دن تھا کہ موسلادھار بارش ھونے لگی ۔ گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ کھڑی ھو گئی ۔ صبح لوگوں کے جسم سے یوں بھاپ اٹھتی جیسے گھوڑوں کے اور بارش کے تھمنے کے کوئی آثار ھی نظر نہ آتے تھے... ھر رات دسیوں آدمی مرتے ۔ دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ھم لوگ فاقوں کی وجہ سے کمزور ھوتے گئے ۔ اس پر طرہ یہ کہ اب میرے زخموں میں سخت تکلیف شروع ھو گئی تھی ۔

چھٹے دن میرے شانے میں سخت درد شروع ھو گیا اور سر کی حالت اس سے بھی خراب تھی ۔ زخموں میں مواد بھرنے لگا تھا ۔ سخت سڑاند بھی آنے لگی تھی ۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ شدید زخمی سوویت فوجیوں کو اس کیمپ کے قریب ھی اجتماعی فارم کے اصطبل میں رکھا گیا ھے اور ان کی دیکھ بھال کے لئے ایک ڈاکٹر بھی موجود ھے ۔ صبح میں نے محافظوں کے سارجنٹ سے کہا کہ وہ مجھے ڈاکٹر کو دکھا دے ۔ اس کو روسی اچھی آتی تھی ۔ جواب دیا 'جاؤ، اپنے ڈاکٹر کو دکھاؤ ۔ وہ ابھی تمھارا علاج کر دے گا ۔ '

''طنز کو میں نہ سمجھ سکا اور بڑی امید لیکر اصطبل کی طرف چلدیا ۔

''سرجن مجھے دروازے پر ھی مل گیا ۔ یہ آدمی بالکل ختم ھوچکا تھا ۔ خوفناک حد تک بے جان دبلاپتلا وہ شخص جو مصیبتیں جھیل چکا تھا ان کے باعث نیم پاگل ھوگیا تھا ۔ زخمی گندے بھوسے پر پڑے تھے اور اصطبل کی بدبو میں ان کا دم گھٹا جا رھا تھا ۔ بیشتر کے زخموں میں کیڑے پڑنے شروع ھو گئے تھے اور جن زخمیوں میں اتنی ھمت تھی وہ ان کو اپنی انگلیوں یا تنکوں سے کرید کرید کر نکال رھے تھے... وھیں ایک ڈھیر کی شکل میں مردے بھی پڑے تھے ۔ جتنی تیزرفتاری سے ان میں اضافہ ھو رھا تھا اتنی تیزی سے انہیں ھٹایا نہیں جا سکتا تھا...

'' 'کہئے؟ میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ھوں؟' ڈاکٹر نے مجھ سے پوچھا ۔ 'میرے پاس پٹی کی ایک چندی تک نہیں ھے، میرے پاس کچھ نہیں ھے! چلے جاؤ، خدا کےلئے، یہاں سے چلےجاؤ! اپنی پٹیاں نوچ‌ڈالو اور اپنے زخموں پر تھوڑی سی راکھ چھڑک لو ۔ یہیں دروازے کے قریب ۔ '

کی طاقت آ گئی تھی، مجھے آس ہوگئی تھی کہ گرکر راستے میں ڈھیر نہ ہوجاؤں گا۔

''ابھی ہم دریا پار کرکے کچھ ہی آگے بڑھے تھے کہ سامنے سے سڑک پر منجھولے جرمن ٹینکوں کی ایک ٹکڑی اپنی طرف آتے دیکھی۔ آگے والے ٹینک چلانےوالے نے ہمیں پہچان لیا کہ قیدی آرہے ہیں اور اس نے رفتار تیز کردی اور سیدھا ہمارے دستے میں گھس آیا جس کی وجہ سے اگلی قطاروں میں بھگدر مچ گئی اور ہمارے آدمی ٹینکوں کے پہیوں میں آکر کچل گئے۔ اس منظر کو دیکھ کر ہمارے محافظوں کا مارے ہنسی کے برا حال ہوگیا اور وہ ٹینک چلانےوالوں سے جو موکھے کھول کر باہر جھانکنے لگے تھے چیخ چیخ کر کچھ کہنے لگے۔ جب ہنسی کا یہ دورہ ختم ہوا تو انہوں نے ہماری قطاریں پھر سے لگوائیں اور سڑک کے کنارے کنارے لیکر پھر سے روانہ ہوگئے۔ واقعی خوب ٹھٹھے لگانا آتا ہے ان جرمنوں کو...

''اس رات میں نے بھاگ نکلنے کی کوئی کوشش نہیں کی کیونکہ مجھے احساس تھا کہ ایسی حالت میں بھاگ کر زیادہ دور نہ پہنچ پاؤنگا۔ اس کے علاوہ ہماری نگرانی اتنی سخت تھی کہ اس میں ناکامی یقینی تھی۔ مگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ کوشش نہ کرنے پر میں نے بعد میں اپنےآپ کو کتنا کوسا! اگلے روز ہمیں اس گاؤں میں سے لیجایا گیا جس میں جرمن پیدلفوج کی ایک کمپنی کا پڑاؤ تھا۔ سارے جرمن ہمیں دیکھنے سڑک کے کنارے آکر کھڑے ہو گئے تھے۔ ہمارے محافظوں نے پورے گاؤں سے ہمیں دوڑا کر گذارا، ہماری توہین کی تاکہ محاذجنگ پر روانہ ہونےوالی اس پیدل فوج کی ہمتیں بڑھائیں۔ ہم دوڑے۔ جو بھی لڑکھڑایا یا گرا اسے وہیں گولی ماردی گئی۔ دن ختم ہونے سے پہلے ہم جنگی قیدیوں کے کیمپ میں پہنچ گئے۔ اس مقصد کےلئے ایک مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن کے صحن کے چاروں طرف موٹے خاردار تار کھنچوا دئے گئے تھے اور اس کے اندر قیدیوں کو اس طرح ٹھونس دیا گیا تھا جیسے ڈبوں میں مچھلیوں کو۔ ہمیں کیمپ کے محافظوں کے سپرد کردیا گیا جنہوں نے اپنی بندوقوں کے کندوں سے ٹھوکے دیکر اور مارمار کر اس احاطے میں ہمیں ٹھونس دیا۔ یہ جہنم نہیں تھی، اس سے بھی بدتر جگہ تھی۔ وہاں پاخانے نہیں۔ قیدی جہاں تھے وہیں رفع حاجت کرلیتے تھے اور ان کو وہیں اس غلاظت میں کھڑے رہنا یا لیٹنا پڑتا تھا۔ جو کمزور تھے وہ تو کبھی اٹھ ہی نہ پائے۔ ہمیں دن

گرم کوٹ مجھے مل گیا تھا۔ مگر پھر بھی ٹھنڈ کے مارے ھڈیاں تک یخ ھوگئی تھیں۔ بھوک کی تو اب عادت پڑ چکی تھی ...

''ھمارے ھاں پہرہ ان فوجیوں کا رہتا تھا جو لوٹ مار سے موٹے ھورہے تھے۔ کردار کے اعتبار سے وہ سب ایک ھی سانچے کے ڈھلے تھے، اور ان میں سے ایک ایک پکا بدمعاش تھا۔ دل بہلانے کےلئے وہ لوگ جو کچھ کیا کرتے تھے وہ بھی سن لیجئے: صبح کو لانس کارپورل خاردار تاروں کے پاس آتا اور مترجم سے کہلواتا کہ ھم لوگ کھانا لینے قطار باندھ کر کھڑے ھوجائیں جو کیمپ کے بائیں سرے سے تقسیم ھونا شروع ھوگا۔

''ھم سب وھاں جا کر جمع ھو جاتے یعنی وہ لوگ جن میں ابھی تک کھڑے ھونے اور گھنٹے، دو گھنٹے، تین گھنٹے تک انتظار کرنے کی سکت باقی ھوتی۔ سینکڑوں زندہ ڈھانچے، سخت سردی میں کپکپاتے کھڑے رہتے اور انتظار کئے جاتے۔

''اچانک صحن کے دوسرے سرے پر پہریدار آتا اور خاردار تاروں کے اوپر سے گھوڑے کے گوشت کے ٹکڑے اچھال کر پھینکنا شروع کردیتا۔ بھوکوں کی بھیڑ اس طرف دوڑ پڑتی اور گوشت کے گندے لوتھڑوں پر جانوروں کی طرح آپس میں دھکم پیل کرتی ٹوٹ پڑتی... یہ منظر دیکھ کر پہریدار قہقہے لگاتے اور پھر اچانک مشین گن سے گولیوں کی بوچھار شروع ھوجاتی۔ زمین پر کچھ مردوں اور کچھ زخمیوں کو چھوڑ کر مجمع گھبرا کر بائیں طرف لپکتا۔ پھر طویل‌قامت اوبر لفٹنٹ جو کیمپ کا افسراعلی تھا خاردار تار کے پاس آتا اور اپنے قہقہے پر بمشکل قابو پاتے ھوئے کہتا: 'کھانے کی تقسیم کے وقت تم لوگ بہت بدتمیزی سے پیش آئے! یہ حرکت اگر پھر سے ھوئی تو روسی سورو، میں تم کو بلاتامل بھنوا کر رکھدوں‌گا۔ لاشوں اور زخمیوں کو ھٹاؤ۔'، اپنے افسراعلی کے پیچھے جو فوجی جمع ھوجاتے ان کا ھنستے ھنستے برا حال ھوجاتا۔ وہ اس کو بڑا ھی ظریف‌الطبع گردانتے اور یہ مذاق ان کا بھی پسندیدہ شوق تھا۔

''ھم لوگ لاشیں اٹھاتے اور کیمپ سے قریب ھی ایک کھائی میں دفن کر دیتے... اس کیمپ میں بھی زدوکوب کرنا روز کا معمول تھا۔ مکے، لاٹھیوں اور بندوق کے کندوں سے کام لیا جاتا۔ پہریدار ھمیں صرف اس لئے پیٹا کرتے کہ خالی بیٹھے‌بیٹھے اکتا جاتے تھے اور اس سے تفریح طبع کا اچھا سامان پیدا ھوجاتا تھا۔ میرے زخم اچھے ھو گئے تھے مگر سیلن یا پٹائی کی وجہ سے وہ پھر کھل جاتے اور بےقراری کا درد ھونے لگتا۔

''میں نے وهی کیا جو اس نے کہا تھا۔ جب میں واپس کیمپ میں پہنچا تو محافظوں کے سارجنٹ نے باچھیں چیرتے ہوئے کہا: 'کہو، کیسی بیتی؟ تمھارے فوجیوں کے پاس بہت ھی اچھا ڈاکٹر ھے! اس نے مدد کی تمہاری؟'، میں بغیر کچھ کہے اس کے پاس سے چلا جانا چاهتا تھا لیکن اس نے میرے سنه پر ایک مکا رسید کیا اور چیخا: 'اچھا، تو تو جواب نہیں دےگا، گندے سور؟'، میں گر پڑا اور اس نے میرے سر اور سینے کا نشانہ لےلیکر ٹھوکریں مارنی شروع کر دیں۔ وہ اس وقت ھی رکا جب خود بیدم هوگیا۔ اس نازی کو میں تازیست نہیں بھولوں‌گا، هرگز نہیں! اس کے بعد بھی میں نے کئی بار اس کی مار کھائی۔ جب بھی کبھی خاردار تاروں کے پیچھے وہ مجھے دیکھ لیتا فوراً باهر آنے کا حکم دیتا اور نہایت مستعدی اور خاموشی سے مجھے زد و کوب کرنا شروع کر دیتا۔

''آپ پوچھینگے میں زندہ کیسے بچ نکلا؟

''بات دراصل یه ھے که مستری بننے سے پہلے میں دریائے کاما پر حمالی کیا کرتا تھا اور جب جہاز سے سامان اتارنا هوتا تو میں اپنی پیٹھ پر نمک کے دو دو بورے لاد لیا کرتا تھا — هر ایک سو سو کلوگرام کا۔ چنانچه جسمانی اعتبار سے میں خوب طاقتور تھا، میری صحت عموماً اچھی رهتی تھی، لیکن سب سے بڑی بات یه تھی که میں مرنا نہیں چاهتا تھا، مجھ میں زبردست قوت‌مدافعت پیدا هوگئی تھی۔ میں تو بس یه چاهتا تھا که وطن کی حفاظت کرنےوالی اپنی فوج میں کسی طرح پہنچ جاؤں۔ اور میں دشمن سے انتقام لینے واپس پہنچ ھی گیا۔

''میرا تبادله ایک اور کیمپ میں کوئی ایک سو کلومیٹر کے فاصلے پر کردیا گیا۔ پہلاوالا ایک طرح سے تقسیم کا مرکز تھا۔ دونوں کیمپ بہت کچھ ایک ھی جیسے تھے۔ یہاں بھی خاردار تاروں کی بہت اونچی باڑہ کھچی هوئی تھی اور کوئی چھت نہیں تھی۔ کھانا بھی گندہ تھا۔ فرق صرف اتنا تھا که کچی کودوں کی جگه کبھی کبھی همیں سڑے هوئے گیہوں کا دلیه ملتا تھا اور کبھی ایسا هوتا که کوئی مردہ گھوڑا لاکر احاطے میں ڈال دیا جاتا اور اس کا بدبودار گوشت آپس میں بانٹ لینے کا کام هم پر چھوڑ دیا جاتا۔ همیں اسے کھانا پڑتا که کہیں بھوکوں نه مرجائیں اور زهرباد سے مرتے بھی تھے سینکڑوں کی تعداد میں...ستمبر ختم هونے سے پہلے ھی سردیاں شروع هوگئیں۔ بارش مسلسل هوئے جارهی تھی۔ صبح سویرے کہرہ جمنے لگا تھا۔ زندگی ایک عذاب مسلسل بن گئی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی که مرنےوالوں میں سے ایک کی وردی اور

''انٹرنیشنل،، گانا شروع کردیا اور ہم اپنی باریک بےسری آوازوں میں اس کا ساتھ دینے لگے۔ محافظوں نے مشین گنوں اور ٹامی گنوں سے ہم پر فائر کئے اور حکم دیا گیا: 'لیٹ‌جاؤ!'، میں برف سے بالکل چمٹ کر لیٹ گیا، اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہ خوشی کے آنسو تھے اور اپنی قوم پر فخر کے آنسو۔ نازی ہمیں غیرمسلح اور بھوک سے کمزور لوگوں کو ہلاک کر سکتے تھے، ایذائیں پہنچا پہنچاکر مارسکتے تھے، لیکن ہمارے جذبے کو ختم نہیں کرسکتے اور ہرگز نہ کرسکینگے! اور اگر ان کا خیال ہے اسے ختم کرسکتے ہیں تو انہیں چاہئے پھر غور کر لیں۔ ،،

* * *

لفٹنٹ گیراسیموف کا باقی قصہ اس رات نہ سن سکا کیونکہ ہیڈ کوارٹر سے ان کا فوری بلاوا آ گیا تھا۔ چند روز بعد ہماری پھر ملاقات ہوگئی۔ خندق میں سے پھپوندی اور صنوبر کی رال کا بھبکہ آرہا تھا۔ لفٹنٹ گیراسیموف اپنے چوڑےچکلے شانے جھکائے اور بڑے بڑے ہاتھوں سے اپنا گھٹنا دبوچے ایک بینچ پر بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس طرح بیٹھنے کی عادت اس کو کیمپ میں گھنٹوں تک بغیر بات کئے، اپنے تلخ، بےفائدہ خیالات میں گم بیٹھے رہنے سے پڑی ہوگی...

''آپ جاننا چاہتے ہوں گے کہ میں بھاگ کیسے نکلا؟ میں اب وہی بتانےوالا ہوں۔ ،، اس نے کہنا شروع کیا۔ ''جس رات ہم نے توپوں کی آواز سنی تھی اس کے بعد ہی ہمیں دفاعی پشتے وغیرہ بنانے کےلئے لے گئے۔ برف پگھلنی شروع ہوگئی تھی اور بارش بھی ہوئی۔ کیمپ سے ہمیں شمال کی طرف کو لیجایا گیا اور پھر وہی بات ہوئی: جب کوئی تکان کے مارے گر پڑا تو اس کو گولی ماردی گئی اور سڑک ہی پر پڑا ہوا چھوڑ دیا گیا۔ ایک آدمی کو اس لئے گولی ماری گئی کہ اس نے یخ‌بستہ آلو اٹھا لیا تھا۔ ہم آلو کے کھیت سے گزر رہے تھے اور اس شخص نے — گونچار اس کا نام تھا، وہ یوکرینی تھا — اس کمبخت آلو کو اٹھالیا اور اس کو چھپانے کی کوشش کی۔ جرمن محافظ نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی اور ایک لفظ کہے بغیر وہ گونچار کے پاس آیا اور گولی مارکر بھیجا اڑا دیا۔ دستے کو رکنے اور قطار باندھ کر کھڑے ہو جانے کا حکم ملا۔ 'یہ سب رائخ کی ملکیت ہے'، محافظ نے کھیتوں کی طرف عام اشارہ کرتے ہوئے

لیکن پھر بھی میں زندہ رہا اور امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا... ہم لوگ زمین پر، کیچڑ میں سوتے، بستر کےلئے بھوسہ تک نہیں دیا گیا تھا۔ ہم‌لوگ گٹھڑی بنکر ایک دوسرے کے قریب لیٹ جاتے۔ ہمارا ڈھیر رات کے وقت بےچینی سے کلبلایا کرتا، کوئی سرک سرک کر ادھر ادھر جاتا، کوئی کروٹیں بدلا کرتا کیونکہ جو لوگ کیچڑ پر لیٹے ہوتے یا سب سے اوپر ہوتے ان کے لئے تو سردی قلفہ جمادینےوالی تھی۔ جانکنی کا عالم ہوتا تھا، نیند کیا خاک آتی۔

''اور اس طرح دن گھسٹ گھسٹ کر گزرتے رہے جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہے ہوں۔ میں دن‌بدن زیادہ کمزور ہوتا چلا گیا۔ بچہ مجھے دھکہ دیکر گرا سکتا تھا۔ میں اپنے سوکھے ہوئے بازوؤں کو دیکھ کر تھراجاتا تھا — خشک کھپچیاں جن پر کھال منڈھ دی گئی ہو — اور حیرت سے سوچا کرتا کہ یہاں سے میں کبھی بھاگ بھی سکوں گا کہ نہیں؟ میں اپنے آپ کو کوسا کرتا کہ شروع ھی میں بھاگ نکلنے کی کوشش کیوں نہ کی۔ اگر اس وقت ان لوگوں نے مجھے مار ڈالا ہوتا تو کیا تھا؟ اس اذیت سے تو بچ جاتا۔

''جاڑا آیا۔ ہم نے برف ہٹائی اور جمی ہوئی زمین پر سونے کےلئے جگہ بنائی۔ کیمپ میں اب ہم تھوڑی ھی تعداد میں رہ گئے تھے... آخرکار ہمیں بتایا گیا کہ جلد ھی کہیں کام پر بھیجدیا جائیگا۔ ہماری ہمتیں پھر بڑھ گئیں۔ بہت ھی ہلکی سی امید تھی مگر پھر بھی ہم میں سے ہر ایک نے پھر سے آس لگانی شروع کردی تھی کہ ممکن ہے نکل بھاگنے کی کوئی سبیل ہوجائے۔

''رات بڑی سردی تھی مگر ہوا نہیں تھی۔ پو پھٹنے سے پہلے ہم نے توپ دغنے کی آواز سنی۔ ہمارا پورا یکجا ڈھیر ہڑبڑا کر جاگ اٹھا۔ جب آواز دوبارہ آئی تو کسی نے بہ‌آوازبلند کہا: 'ساتھیو، یہ تو ہماری فوج پیشقدمی کر رہی ہے!'

''اللہ، پھر تو دیکھئے کیسی کھلبلی مچی! ہم سب ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے، ہم میں سے وہ لوگ بھی جن سے پچھلے کئی روز سے مارے نقاہت کے ہلا بھی نہ جاتا تھا۔ پرجوش سرگوشی کے لہجے میں لوگ باتیں کرر ہے تھے، دبی دبی سبکیاں بھی سنائی دےجاتی تھیں... میرے پاس ھی کوئی رورو کر اپنی جان ہلکان کئے لےرہا تھا، عورت کی طرح سبکیاں لےرہا تھا... اور میں... میں بھی... آنسو بہتے ہوئے میرے گالوں پر آ گئے اور برف بن کر جمے رہ گئے... کسی نے پھٹی پھٹی ہلکی سی آواز میں

سکتا ۔ طاقت ھی باقی نہ رھی تھی اور بس ۔ میں دم لینے کو رکا ۔ اور پھر آگے بڑھنے لگا، گھونگھے کی رفتار سے ۔ خشک نالے کے پار جنگل زیادہ گھنا ھوگیا تھا اور میرا رخ اسی طرف کو تھا ۔ یاد نہیں کتنی بار میں گرا، گرکر اٹھا اور پھر گر پڑا ۔ پھر بھی میں دور ھی نکلتا چلا جارھا تھا ۔ ٹیلے کی دوسری طرف گھنی جھاڑیوں میں گرتا پڑتا، سبکیاں لیتا اور تھکن کے مارے ھانپتا چلا جارھا تھا کہ بہت دور پیچھے سے سب‌مشین گن کی تڑتڑاھٹ اور کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دی ۔ اب مجھے پکڑنا آسان نہیں تھا ۔

''اندھیرا ھو چلا تھا ۔ اگر جرمن مجھے ڈھونڈ نکالتے تو میں ایک کے علاوہ ساری گولیاں ان پر چلادیتا ۔ آخری گولی خود کو ختم کرنے کےلئے باقی رکھتا ۔ اس خیال سے ھمت بندھی اور میں زیادہ احتیاط سے آگے بڑھنے لگا ۔

''رات میں نے جنگل میں گذاری ۔ تھوڑی ھی دور ایک گاؤں دکھائی دیا مگر اس ڈر کےمارے کہ کہیں دشمن کے ھاتھ نہ لگ جاؤں میں وھاں نہیں گیا ۔

''اگلے روز چھاپہ‌مار مجھے اٹھا لائے ۔ دو ھفتوں تک میں ان کی خندقوں میں بستر پر لیٹا آرام کرتا اور تقویت حاصل کرتا رھا ۔ شروع شروع میں انہوں نے مجھے ایک حد تک شبہے کی نظر سے دیکھا حالانکہ میں ان کو اپنا پارٹی‌کارڈ دکھاچکا تھا جو میں نے کیمپ میں اپنے اوورکوٹ کے استر میں کسی نہ کسی طرح سی لیا تھا ۔ جب میں ان کی کارروائیوں میں حصہ لینے کے قابل ھوگیا تو ان کا رویہ میری جانب بالکل بدل گیا تھا ۔ وھیں سے میں نے باقاعدہ حساب رکھنا شروع کیا کہ کتنے نازیوں کو مارا اور یہ عدد بتدریج سو کے قریب پہنچنے لگا ۔

''جنوری میں چھاپہ‌ماروں نے مجھے محاذ کے پار پہنچا دیا ۔ تقریباً ایک مہینے تک میں اسپتال میں رھا جہاں توپ کے گولے کا وہ ٹکڑا میرے شانے سے نکالا گیا جو اب تک وھیں گھسا ھوا تھا ۔ کیمپ میں مجھے گٹھیا کا جو روگ لگ گیا میں نے اس کو اور دوسری بیماریوں کے علاج کو جنگ ختم ھونے کے بعد تک اٹھا رکھا ۔ اسپتال سے جب چھٹی ملی تو مجھے صحت بحال کرنے کی غرض سے گھر جانے کی چھٹی ملی ۔ وھاں میں ایک ھفتے رھا اور اس سے زیادہ وھاں نہ ٹھہر سکا ۔ فوج میں واپس پہنچنے کےلئے جی بیقرار تھا کیونکہ آپ چاھے کچھ کہیں میری جگہ تو آخر تک یہیں ھے ۔''

کہا۔ 'تم میں سے جو بھی یہاں سے کوئی چیز بلااجازت اٹھائیگا اس کو گولی ماردی جائیگی۔ '

''جب هم ایک گاؤں کے اندر سے گزرے تو وهاں کی عورتوں نے روٹی کے ٹکڑے اور بھنے ہوئے آلو ہماری طرف پھینکے۔ ہم میں سے کچھ ان کو لپک لینے میں یا زمین پر سے اٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ باقی اتنے خوش‌قسمت نہ تھے کیونکہ ہمارے محافظوں نے کھڑکیوں کی طرف فائر کرنے شروع کر دئے اور ہمیں حکم دیا کہ تیز تیز قدموں سے چلیں۔ گاؤں کے بچے — آپ جانیں بچے تو نڈر ہوتے هی ہیں — دوڑ کر ہم سے بہت آگے نکل گئے اور سڑک پر روٹیاں ڈال گئے تاکہ جب ہم گزریں تو اٹھالیں۔ میں چند خوش‌قسمتوں میں سے تھا — میں نے ایک بڑا سا آلو لپک لیا تھا۔ آدھا میں نے اپنے پڑوسی کو دیدیا اور اسے ہم چھلکے سمیت کھا گئے۔ زندگی میں مجھے اس سے زیادہ لذیذ کھانا پہلے کبھی نہیں ملا تھا!

''پشتے جنگل میں تعمیر ہونے تھے۔ محافظوں کی تعداد دگنی کردی گئی اور ہمیں بیلچے دے دئے گئے۔ میں چاهتا یہ تھا کہ پشتے بناؤں نہیں بگاڑ دوں!

''میں نے فیصلہ کیا کہ آج رات ہونے سے پہلے هی پہلے بھاگ نکلوں گا۔ جو گڑھا ہم کھود رہے تھے میں اس میں سے باهر نکل آیا، بیلچہ بائیں هاتھ میں پکڑا اور پہریدار کے پاس گیا۔ وہ ہمارے جتھے کی نگرانی پر اکیلا هی تھا کیونکہ باقی سب جرمن ان قیدیوں کی نگرانی کررہے تھے جنہیں خندق کھودنے پر لگایا گیا تھا۔

'' 'دیکھو میرا بیلچہ ٹوٹ گیا ہے۔ '، میں نے منمناتے ہوئے کہا۔ مجھے احساس تھا کہ اگر پہلے هی وار میں اس کو مار گرانے میں کامیاب نہ ہوا تو موت یقینی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ میرے چہرے سے اس کو کچھ شبہہ ہوگیا تھا کیونکہ اس نے سب‌مشین گن کا پٹکہ کندھے سے سرکانا شروع کردیا تھا۔ اسی وقت میں نے اپنے بیلچے سے اس کے منہ پر زوردار وار کیا۔ اس کے سر پر وار نہیں کرسکتا تھا کیونکہ وہ خود پہنے ہوئے تھا۔ پھر بھی میری ضرب زوردار پڑی اور وہ بلاآواز وهیں ڈھیر ہوگیا۔

''اب میرے پاس ایک سب‌مشین گن اور کارتوسوں کے تین خزانے تھے۔ میں نے بھاگنا شروع کردیا اور یہاں مجھے پتہ چلا کہ بھاگ نہیں

ڈھکیلنے کا اہتمام کرلیا ھے۔ لیکن غالباً آپ کو ان مصیبتوں کے بارے میں کافی معلومات نہیں ھیں جو اس جنگ کی وجہ سے ھم کو برداشت کرنی پڑرھی ھیں۔ اور میں چاھوں‌گا کہ ھمارے دوستوں کو ان کا علم ھو۔

جنگی نامہ‌نگار کی حیثیت سے میں جنوبی، جنوب مغربی اور مغربی محاذوں پر گیا تھا۔ آجکل میں ایک ناول لکھ رھا ھوں ''وطن کے مجاھد،، جس میں یہ دکھانا چاھتا ھوں کہ اپنی آزادی کے لئے لوگ جو لڑائی لڑ رھے ھیں وہ کتنی سخت ھے۔ ناول ابھی ناتمام ھے اور اس لئے میں ایک ادیب کی طرح نہیں بلکہ اتحادی ملکوں میں سے ایک ملک کے محض ایک شہری کی حیثیت سے آپ سے مخاطب ھونا چاھتا ھوں۔

ھم میں سے ھر ایک کی زندگی میں جنگ ان تمام شدتوں کے ساتھ داخل ھوگئی ھے جو ایک قوم کی دوسری قوم کو صفحۂ‌ھستی سے مٹا دینے، نگل‌جانے کی کسی کوشش سے مخصوص ھوتی ھیں۔ محاذجنگ پر جو کچھ ھورھا ھے، جنگ کامل میں جو کچھ ھورھا ھے وہ ھم سب کی زندگی پر ایک انمٹ نقش چھوڑ چکا ھے۔ میں اپنی ماں کو کھوچکا ھوں جو ھمارے گاؤں پر جس کی جنگی اعتبار سے قطعی کوئی اھمیت نہیں ھے، ھوائی حملے کے دوران جرمن ھوائی جہاز سے گرائے ھوئے ایک بم سے ھلاک ھوئیں۔ اس کارروائی کے پیش‌نظر مقصد وہ تھا جو ڈاکوؤں کا ھوتا ھے — آبادی کو تتربتر کر دیا جائے تاکہ بڑھتی ھوئی جرمن فوج کے روبرو لوگ اپنے سویشیوں کو مشرق کی طرف ھانک کر نہ لیجاسکیں۔ جرمن توپوں کے گولوں نے میرے گھر، میری لائبریری کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ میرے بہت سے دوست — ادیب اور میرے گاؤں کے ساتھی — مجھ سے بچھڑ چکے ھیں، وہ محاذجنگ پر کام آئے۔ ایک عرصۂ‌دراز تک مجھے اپنے بال بچوں کی کوئی خبر نہ مل‌سکی۔ اس دوران میں میرا بیٹا بیمار رھا اور میں کسی طرح کی کوئی مدد نہ کرسکا۔ لیکن، بہرحال یہ نجی مصائب ھیں، وہ ذاتی رنج‌وغم جن سے ھم میں سے بیشتر کو سابقہ پڑتا رھتا ھے۔ جب جنگ لوگوں کی زندگی کا جزو بن جاتی ھے تو یہ غم جمع ھوکر ایک عام، قومی المیہ بن جاتے ھیں۔ ھمارے اپنے ذاتی المئے عوام کی مصیبتوں پر جن کے بارے میں کوئی ادیب، کوئی فنکار ابھی دنیا کو باخبر نہیں کر سکا ھے، غالب نہیں آسکتے۔

آپ کو یاد رکھنا چاھئے کہ ھمارے دیس کے وسیع خطے اور کروڑوں لوگوں کو دشمن نے، تاریخ کے سب سے زیادہ سنگدل دشمن نے ھتھیا لیا ھے۔ قدیم تاریخوں سے ھمیں ھنوں، منگولوں اور دوسرے وحشی

* * *

خندق میں جانے کے راستے کے پاس ہم نے خداحافظ کہا۔ جنگل سے گھرے ہوئے میدان میں پھیلی ہوئی دھوپ کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے لفٹنٹ گیراسیموف نے کہا:

''ہم نے صحیح طریقے سے لڑنا سیکھ لیا ہے، ہم نے نفرت کرنا اور محبت کرنا سیکھ لیا ہے۔ تمام احساسات پر دھار رکھنے کےلئے جنگ ایک اچھا سان ہے۔ شاید کوئی سوچے کہ محبت اور نفرت کبھی ساتھ نہ ہوسکتی ہوں۔ نظم کے شاید وہ مصرعے آپ کو یاد ہوں جن میں کہا گیا ہے کہ مضبوط گھوڑے اور نازک اندام ہرنی کو ایک گاڑی میں نہیں جوتا جاسکتا۔ مگر ہم نے جوت لیا ہے۔ اور دونوں ساتھ ساتھ مزے میں چل رہے ہیں۔ جو سلوک میرے وطن اور خود میرے ساتھ نازیوں نے کیا ہے اس کی وجہ سے میں ان سے نفرت کرتا ہوں اور اپنے ہموطنوں سے میں دل‌وجان سے محبت کرتا ہوں اور میں نہیں چاہتا کہ وہ نازیوں کی ماتحتی کی صعوبتیں برداشت کریں۔ یہی دونوں احساسات، محبت اور نفرت، مجھے اور ویسے تو ہم سب کو مجبور کرتے ہیں کہ جوش انتقام سے لڑیں اور یہی وہ دو جذبات ہیں جو ہمیں فتح سے ہمکنار کریں‌گے۔ وطن کی محبت ہمارے دلوں میں جاگزیں ہے اور جب تک ہمارے دلوں میں دھڑکن باقی ہے وہیں رہیگی۔ اپنی نفرت کو ہم سنگینوں کی نوک پر لئے پھرتے ہیں۔ اس مبالغہ‌آرائی کی معافی چاہتا ہوں، مگر مجھے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔،، ان الفاظ کے ساتھ اس نے اپنا قصہ پورا کیا اور جب میری اس سے ملاقات ہوئی تھی تب سے اب تک پہلی بار اس نے سادہ، پیاری سی، بچوں جیسی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا۔

پہلی بار میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس بتیس سالہ آدمی کی جو اتنا کچھ سہنے کے بعد اب بھی شاہ بلوط کی طرح طاقتور تھا، کنپٹیاں سفید ہوچکی تھیں۔ یہ سفیدی جو بےپناہ تکلیفوں اور دکھ درد سے حاصل ہوئی تھی اس قدر شفاف تھی کہ اس کی دوپلی فوجی ٹوپی میں لگا ہوا مکڑی کا جالا بالوں کو چھوتے ہی غائب ہوگیا اور لاکھ جتن کرنے پر بھی مجھے قطعی نظر نہیں آیا۔

۱۹۴۲ء

امریکی دوستوں کے نام ایک خط

ہم یہ سفاک، دشوار جنگ قریب دو سال سے لڑرہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ دشمن کی پیشقدمی کو ہم نے روک دینے اور اس کو پیچھے

ایک طاقتور، چالاک دشمن سے ہے جو ہمارے اور آپ کے بھی عوام سے نفرت کرتا ہے، سہلک نفرت۔ اپنے ھاتھ خون‌آلودہ کئے بغیر اس جنگ سے نکل آنا غیرممکن ہے۔ جنگ خون کا، پسینے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اگر انکار کیا گیا تو وہ دگنی قیمت وصول کرےگی۔ پس‌وپیش کا انجام ممکن ہے ناقابل تلافی نقصان ہو۔ آپ نے اپنے جگر گوشوں کا خون اپنے گھر کی دھلیز پر بہتے نہیں دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا ہے اور اس لئے مجھے آپ سے اس طرح دو ٹوک بات کرنے کا حق پہنچتا ہے۔

۱۹۴۳ء

وہ فتح جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی

(ایک مضمون کا اقتباس)

... اگر تاریخ عالم میں اس سے زیادہ خون‌آشام اور تباہ کن جنگ جو ۱۹۴۱ء — ۱۹۴۵ء میں ھوئی تھی، پہلے کبھی نہیں ھوئی تھی تو یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی بھی فوج نے اتنی شاندار فتوحات حاصل نہیں کیں جتنی سوویت فوج نے، اور نہ ھی شان‌وشوکت، قوت‌وعظمت کی اس تابناکی کے ساتھ حیران‌وششدر نوع انسانی کے سامنے نمودار ھوئی۔

جب ہماری فوجوں نے مشرقی پروشیا میں آئڈکونین پر قبضہ کیا تو ریلوے اسٹیشن کی عمارت پر جرمن عبارت: ''برلن ۷۴۰۷ کلومیٹر دور ہے،، کے ساتھ روسی میں ایک عبارت تحریر تھی۔ ہمارے ایک فوجی نے موٹے موٹے حروف میں لکھا تھا: ''پھر بھی ہم پہنچ جائیں‌گے۔،، اور نیچے دستخط کئے تھے: ''چیرنووسوف،،۔

کیا روسی فوجی کی لکھی ھوئی اس سادہ تحریر میں حقیقی معنوں میں پرشکوہ اعتماد کی کھنک سنائی نہیں دیتی؟ اور یہ روسی فوجی یقیناً برلن پہنچے اور بڑی بات یہ کہ انہوں نے ہٹلر کے صدر مقام کے کھنڈر میں عالمی اقتدار کے مجنونانہ خوابوں کو بھی ہمیشہ کےلئے دفن کر دیا۔

صدیاں گزر جائیں‌گی مگر نوع انسانی ہماری بہادر لال فوج کو ہمیشہ احسانمندی کے ساتھ یاد کیا کرےگی...

۱۹۴۵ء

قبیلوں کے خون‌آشام حملوں کا حال معلوم ہوا ہے ۔ ہمارے خلاف جنگ میں جرمن نازیوں نے جو ایذائیں پہنچائی ہیں ان کے سامنے سب ماند پڑجاتے ہیں ۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ گاؤں اور باڑے دیکھے ہیں جنہیں مسمار کرکے زمین کے برابر کردیا گیا — یہ گھر میرے ہموطنوں کے تھے میری کتابوں کے ہیروؤں کے — اور میں نے یتیموں کو دیکھا ہے، ان لوگوں کو جن کے سروں پر چھت کا سایہ نہ تھا، میں نے خوفناک حد تک مسخ شدہ لاشیں دیکھی ہیں اور ہزاروں برباد زندگیاں ۔ یہ سب کچھ ہمارے ملک میں ہٹلری لیکر آئے ہیں اپنے دیوانے رہنما کے احکامات پر ۔

دنیا کے تمام ملکوں — آپ کے ملک کےلئے بھی، آپ کے گھر، آپ کی زندگی کےلئے ہٹلریت اسی کی تیاریاں کر رہی ہے ۔

ہم چاہتے ہیں کہ آپ مستقبل کے بارے میں سنجیدگی سے غور کریں ۔ آپ کی دوستانہ، بےلوث مدد کو ہم بہت سراہتے ہیں ۔ ہمارے ملک کےلئے سامان تیار کرنے اور خاص طور پر اسے پہنچانے میں آپ جس پیمانے کی کوششیں کررہے ہیں اور جو دقتیں آپ کو پیش‌آرہی ہیں ان کا ہمیں علم ہے اور ان کی ہم قدر کرتے ہیں ۔ میں نے آپ کے ہاں کے ٹرک وادی ڈان کے میدانوں میں دیکھے ہیں اور میں نے آپ کے ہاں کے شاندار ہوائی جہازوں کو ان جہازوں سے نبردآزما دیکھا ہے جو ہمارے گاؤں پر حملہ کرنے آئے تھے ۔ ہمارے ملک میں ایک بھی شخص ایسا نہیں ہے جو آپ کی دوستانہ امداد سے واقف نہ ہو ۔

لیکن میں آپ سے نہایت صاف گوئی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں اس طرح جس طرح جنگ نے ہمکو بات کرنا سکھا دیا ہے ۔ اس جنگ میں ہمارے ملک اور ہماری قوم کو کاری زخم آئے ہیں ۔ ٹکر تو ابھی زور پکڑ ہی رہی ہے ۔ اور ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے دوست ہمارے شانہ‌بہ‌شانہ لڑیں۔ ہم آپ کو میدان‌جنگ میں چلنے کی دعوت دیتے ہیں ۔ ہم آپ کو محض دو قوموں کی دوستی کی ہی نہیں بلکہ فوجیوں کی دوستی کی پیش کش کرتے ہیں ۔

اگر محل وقوع کی بنا پر واقعی شانہ‌بشانہ نہیں لڑسکتے تو ہم یہ خبر سننی چاہتے ہیں کہ آپ کی فوجوں کی طاقتور ضربیں اس دشمن کی پشت پر پڑ رہی ہیں جو ہمارے ملک پر حملہ‌آور ہے ۔

”ہم جانتے ہیں کہ آپ کی ہوائی فوج ہمارے مشترک دشمن کے صنعتی مرکزوں پر زبردست کامیابی کے ساتھ بمباری کررہی ہے ۔ لیکن اگر جنگ اچھی طرح لڑنی ہے تو تمام قوتیں شامل ہونی چاہیئں ۔ ہمارا مقابلہ

اک بات مادروطن کی
(اقتباس)

سردیاں ھیں ۔ رات کا وقت...

رات کی تنہائی اور خاموشی میں، میرے پیارے ھموطن اور دوست، اپنی آنکھیں بند کر لے اور یادوں کے سہارے ماضئ قریب میں پہنچ جا۔ پھر ذھن کی بصارت تجھے دکھائیگی:

... ٹھنڈا، دودھیا کہرا بیلوروس کے جنگلوں اور دلدلوں پر، خالی، عرصۂ دراز سے اجاڑ، فرن کی چرمرائی ھوئی ٹہنیوں سے ڈھکی ھوئی خندقوں پر، گرتےھوئے پشتوں اور زنگ آلود پانی سے بھرے گڈھوں پر جن کی تہ میں پڑی کارتوسوں کی پیٹیوں کی جھلک نظر آتی ھے، بھیانک انداز میں بل کھا رھا تھا...

اسمولینسک اور ماسکو کے دیہی علاقوں میں صنوبر کے درخت جنہیں گولوں کی کرچیوں نے اوپر سے نیچے تک جگہ جگہ سے کاٹ ڈالا تھا، کھوکھلی سی آواز میں کراھتے ھیں اور تند شمالی ھوا کے سامنے اپنی چوٹیاں سرنگوں کر لیتے ھیں۔

لینن کے لازوال شہر کے مضافات میں روئی کے گالوں جیسی برف تیز تیز گرتی ھے۔ جیسے اس سرزمین کے جسے ھمارے عوام متبرک تصور کرتے ھیں جنگ کے دوران لگے زخموں کے داغوں کو جلدی سے ڈھانک دینے کی کوشش کر رھی ھو۔

پھر سے جی اٹھنےوالے یوکرینی کھیتوں پر جنہیں توپوں اور بموں کے بیشمار گولے باربار جوت چکے تھے، جنہیں لڑائیوں کی گرج کڑک کا شور ابھی تک یاد ھے سائے اترتے چڑھتے نظر آرھے ھیں۔

کورسک، اوریل، وورونیژ اور تولا کی اس قدیم روسی سرزمین پر کڑکڑاتے جاڑے کی تیز برفباری ھورھی ھے اور تیز ھوا کے جھکڑ برف کو چاروں طرف اڑائے پھر رھے ھیں جو ھزاروں ٹینکوں کے بےپناہ بوجھ سے پورے تین برس تک لرزتی رھی تھی۔ پالے کی ماری آخری پتیاں درختوں سے جھڑ چکی ھیں اور وہ ھر جگہ — کھیتوں میں، شاھراھوں اور کچے راستوں پر جو بلاشبہ دنیا کی بہترین ھماری پیدل فوج کے بےشمار پراستقلال پیروں کے تلے آچکے ھیں — گیروے رنگ کے دھبوں کی شکل میں نظر آرھی ھیں گویا انسانی خون جمی ھوئی برف سے رس رس کر اوپر آ رھا ھو۔

استالن گراد کے اطراف و جوانب کے بےکنار میدانوں میں جہاں زمین کے ایک ایک چپے میں ایک زمانے کے مہلک گولوں کی کرچیاں پیوست

ویشنسکایا کے رائے دهندگان کے ایک جلسے میں تقریر

ساتھیو !

سوویت یونین کی اعلی سوویت کی میمبری کےلئے مجھے نامزد کرکے آپ نے جو میری عزت افزائی کی ھے اور مجھ پر جو اعتماد کا اظہار کیا ھے اس کےلئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ھوں۔

خود اپنے گاؤں کے لوگوں کے سامنے پیش ھوتے ھوئے مجھے خوشی ھورھی ھے۔ آپ سب مجھے اچھی طرح جانتے ھیں اور میں بھی آپ سب سے بخوبی واقف ھوں۔ اس لئے مجھے اپنے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں صرف چند باتیں ان فرائض کے بارے میں کہوں‌گا جو آپ کو اور مجھے درپیش ھیں۔ سوویت حکومت اور ھماری پارٹی ھم سے چاھتی ھیں کہ جنگ کی تباہ‌کاریوں کا جلدازجلد ازالہ کر لیں۔ معیشت کو بحال کرنے پر ھمیں اپنی ساری کوششیں صرف کرنی چاھئیں۔ زراعت کی بحالی مادروطن کی صلاحیت میں اضافہ کردیگی۔

عام مسئلوں کے علاوہ جنھیں ھم سارے سوویت عوام کے ساتھ مل کر حل کریں‌گے، ھمیں اپنے ضلع کی سابقہ شان و شوکت اور حسن و دلکشی بھی بحال کرنی ھے۔ ویشنسکایا ضلع کی بحالی کےلئے حکومت نے بڑی بڑی رقمیں منظور کی ھیں لیکن ھمیں مقامی امکانات سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کرنے کی کوشش کرنی چاھئے۔ فریضہ یہ ھے کہ دو ایک سال کے اندر اندر اپنے تباہ و برباد ویشنسکایا گاؤں کو خوبصورت، آراستہ مقام بنا دیں جیسا کہ وہ جنگ سے پہلے تھا۔

میمبر کو بہت سارے پیچ درپیچ فرائض انجام دینے ھوتے ھیں۔ میمبر کو چاھئے کہ وہ اپنے رائےدھندگان کی تمام درخواستوں اور شکایتوں کو گوش ھوش سے سنے۔ میمبر کو سرگرم عمل کارکن ھونا چاھئے جو حکومت کے فیصلوں کی خود اپنے حلقۂرائےدھندگان میں تعمیل کی جوش‌و خروش سے نگرانی کرے۔

میں آپ کے مفادات کی خدمت کرنے کا وعدہ کرتا ھوں۔ میرا خاص پیشہ تصنیف‌وتالیف ھے اور میں وعدہ کرتا ھوں کہ ادبی میدان‌عمل میں بھی اچھا کام کروں‌گا تا کہ آپ کو میری وجہ سے شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

۱۹۴۶ء

آنکھوں میں جھانک کر دیکھے جن کے آنسوؤں کا ایک ایک قطرہ سوگوار ماں کے شدید المئے نے خشک کرکے رکھدیا ہو ۔ اور کھوکھلی سی، تھرتھراتی ہوئی آواز میں وہ کہہ رہا ہو : ''آؤ، آؤ، ماں، یوں اپنی جان ہلکان نہ کرو... غم نہ کرو... غمزدہ ہم ھی تو نہیں...،، کسی جواب کا انتظار کئے بغیر وہ کھڑکی کے پاس چلا گیا ہو اور چھوٹی سی خشک سبکی کے ساتھ امنڈتے ہوئے اپنے آنسوؤں کو کھنکھار کر اپنا گلا صاف کرنے کے بہانے روکا ہو اور دھندلائی ہوئی کھڑکی کو، کچھ نہ دیکھتے ہوئے دیر تک گھورتا رہا ہو...

دوست، یاد رکھنا، سوویت حکومت کے تیس سال میں سوویت یونین نے کبھی مات نہیں کھائی ھے، نہ جنگ میں نہ کسی اور کام میں خواہ کتنی بڑی مشکلیں کیوں نہ سامنے آئی ہوں ۔ پچھلی ساری لڑائیوں میں سب سے بڑی لڑائی میں فتح بڑی مصیبتیں اور بےاندازہ نقصانات اٹھانے کے بعد حاصل ہوئی لیکن اپنے وطن کی آزادی کے لئے پیش کی ہوئی ان قربانیوں نے ہماری قوت سلب نہیں کی، نہ جانی نقصان کی تلخی سے ہماری ہمتیں پست ہوئیں ۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ھے کہ گھاس کے میدانوں کی افسنتین گھنگھنا کر پھوٹ آتی ھے اور گیہوں کے کھیتوں کے پاس لہلہلاتی گھاس کی چراگاھوں پر نیلگوں دھند کی طرح چھا جاتی ھے اور جب گیہوں کے دانے پکتے ھیں تو وہ افسنتین کی تلخی جذب کرلیتے ھیں ۔ اس گیہوں کا آٹا کیک اور ایسی ھی تکلفات کی چیزوں کےلئے اچھا نہیں ھوتا ۔ لیکن روٹی پھر روٹی ھوتی ھے، چاھے مزے میں ھلکی سی تلخی کیوں نہ ھو ۔ اور جو خون پسینہ ایک کرکے محنت کرتے ھیں ان کے لئے نعمت ھوتی ھے کیونکہ وہ انسان کو آئندہ محنت کے لئے توانائی فراوانی سے بخشتی ھے ۔

جنگ میں کھائے ہوئے زخموں کو لوگ کرشماتی سرعت کے ساتھ مندمل کر رھے ھیں ۔ کھنڈروں کی جگہ شہر اور گاؤں تعمیر ھوتے جارھے ھیں ۔ ھمارے ڈانباس کی معدنی کانوں میں زندگی واپس آ گئی ھے ۔ ان کھیتوں میں فصل اگ رھی ھے جن میں دو سال ھوئے گھاس پھوس اور سرکنڈے کھڑے تھے ۔ جن کارخانوں میں زندگی کی روح پھونکدی گئی ھے ان کی چمنیوں سے دھواں اٹھنے لگا ھے ۔ جہاں پہلے سناٹا چھایا رھتا تھا وھاں اب نئے صنعتی کارخانے قائم ھو رھے ھیں ۔ سوویت باشندہ بھی جو اپنی آنکھوں سے بہت کچھ دیکھ چکا ھے اور عوام کے علم و دانش کی زبردست تخلیقی قوت سے ناممکن کے ممکن ھونے کی توقع کرنا سیکھ چکا ھے،

ھیں، جہاں چننده جرمن فوجوں کے ڈویژن خاک و خاکستر کردئے گئے تھے، والگا کے اس پار سے آتی ھوئی غضبناک تیز ھوائیں خس وخاشاک کے ایک گولے کو رگید رھی ھیں جو اسی قدر بدنما اور ویسا ھی زنگی کتھئی رنگ کا ھے جیسے کہ جرمن ٹینکوں اور گاڑیوں کے ڈھانچے جو سارے میدان میں پھیلے پڑے ھیں۔

کرائمیائی اور نیلگوں قفقازی پہاڑیوں کے دامن میں باریک جالے کے چمچماتے ھوئے سفید تار اب بھی شفاف اور ٹھنڈی ھوا میں تیرتے پھر رھے ھیں۔ جہاں کبھی دن رات لڑائی کی گھن گرج ھوتی رھتی تھی وھاں خندقیں اور گولوں کے بنائے ھوئے گڈھے جن کی کگروں پر گھنی گھاس اگ آئی ھے اب نقرئی جالے سے ڈھک گئے ھیں اور ان جالوں کے تار جن میں شبنم کے اشک نما قطرے پروئے ھوئے ھیں، بوجھ سے جھول گئے ھیں اور لرز رھے ھیں۔

اور ھر جگہ، استالن گراد سے برلن تک، قفقاز سے بحیرہ بارینتس تک، میرے دوست، جہاں بھی تیری نگاہ ٹھہریگی تجھے ان فوجیوں کی قبریں نظر آئیں گی جو لڑائی میں کام آئے، وہ قبریں جو ھماری مادروطن کو دل سے عزیز ھیں۔ اور اس لمحے تجھے ایک کسک کے ساتھ وہ بے شمار نقصانات یاد آئیں گے جو تیرے ملک کو، ھماری اپنی سوویت حکومت کی مدافعت کرتے ھوئے، برداشت کرنے پڑے تھے اور تیری یادداشت میں ''ھماری مادروطن کی آزادی اور خودمختاری کے لئے میدان جنگ میں شہید ھونےوالے سورما امر ھیں،، کے الفاظ ایک دعا بن کر گونجیں گے۔

ماضی کو یاد کرتے ھوئے تو ضرور سوچیگا: جنگ میں کتنے لوگ یتیم ھوئے! جاڑوں کی اس لمبی رات میں جب غمناک یادوں کے لئے وقت بھی ھوگا اور موقع بھی، تو کتنی عورتوں نے، جنگ نے جن کا سہاگ لوٹ لیا، تنہائی میں اپنے سن رسیدہ چہرے کو اپنے ھاتھوں سے ڈھانک لیا ھوگا اور تاریکی میں افسنتین کی طرح تلخ آنسوؤں سے اپنی انگلیوں کو جھلسا لیا ھوگا۔ بہت سے بچوں کے دل، جو سوشلسٹ مادروطن کی خاطر میدان جنگ میں کام آنےوالے اپنے باپ کی موت کے غم سے ھمیشہ کےلئے مجروح ھو چکے ھیں، رات کو سوتے وقت اتفاقاً یاد آجانے پر غیرطفلانہ درد و کرب سے سہم کر رہ جاتے ھوں گے۔ ممکن ھے کہ ایسا ھو: ایک چھوٹے سے کمرے میں، جہاں برسوں سے ایک افسردہ سی خاموشی چھائی رھتی ھو، ایک بوڑھا آدمی اپنی بیوی کے پاس آئے، جس کے بال سفید ھوچکے ھوں اور جو بغیر آنسو بہائے اپنے شہید بیٹوں کا سوگ منا رھی ھو اور اس کی بے نور

پہلے کیا تھا، بالکل اس طرح جس طرح وہ اس ماتمی دن سے اب تک کرتے هیں - انہوں نے، عظیم پارٹی کے رهنما اور دنیا کی سب سے پہلی سوشلسٹ ریاست کے بانی نے ۱۹۱۹ء میں یہ ناقابل‌فراموش الفاظ کہے تھے:

''اس ملک میں، روس میں، دنیا کی تاریخ میں پہلی بار، ملک کی حکومت اس طرح منظم هوئی هے کہ استحصال کرنےوالوں کو مستثنا کرکے، صرف مزدور اور محنت‌کش کسان، عوام الناس کی ان تنظیموں کی تشکیل کرتے هیں جو سوویتیں کہلاتی هیں، اور ان سوویتوں کو ریاست کا سارا اقتدار حاصل هے - یہی وجہ هے کہ روس کے متعلق تمام ملکوں میں بورژوازی کے نمائندوں کی افتراپردازیوں کے باوجود لفظ 'سوویت، ساری دنیا میں نہ صرف قابل فہم بلکہ مقبول هوگیا هے، مزدوروں کا اور تمام محنت‌کشوں کا پسندیدہ لفظ بن گیا هے - ،،

لینن نے کہا تھا: ''سوویت اقتدار سوشلزم کی طرف لیجانےوالی شاهراہ هے جو محنت‌کش عوام‌الناس نے دریافت کی تھی اور یہی وجہ هے کہ یہ سچی شاهراہ هے، یہی وجہ هے کہ یہ ناقابل تسخیر هے - ،،

همارے دوست جانتے هیں کہ جنگ اور پرامن کام دونوں کےلئے هماری قوت کا لازوال سرچشمہ کیا هے -

همارے دشمن اپنے روپے کی نمک حلالی کرتے هیں: بعض بھونڈےپن اور اپنی کرداری ڈھٹائی سے براہ‌راست بہتان لگاتے هیں، جبکہ کچھ اور هیں جو ''کرشماتی سلافی روح،، اور ''روسی کٹرپن،، کے بارے میں پرانے کرم‌خوردہ دلائل پیش کرتے اور ان چیتھڑوں سے اپنی رذالت اور کمینگی کی پردہ‌پوشی کرنا چاهتے هیں اور یوں ظاهر کرتے هیں کہ جیسے ان کی سمجھ هی میں نہ آتا هو کہ سوویت عوام کو اپنی بےپناہ قوت کہاں سے حاصل هوتی هے -

برسہابرس مصیبتیں جھیلنے اور عظیم‌الشان انقلابی جدوجہد کے بعد همارے عوام نے حکومت کا واحد منصفانہ نظام دریافت کیا، اس کےلئے وہ عزم و شجاعت سے لڑے، اپنے خون اور اپنی محنت سے اس کو مستحکم کیا اور اس نظام پر ان کے اعتماد کو دنیا کی کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکتی -

آپ جب حالیہ ماضی کا همارے حال سے موازنہ کریں‌گے تو صاف نظر آجائیگا کہ روحانی اعتبار سے روسی اور خاص طور سے روسی کسان جنہوں نے اجتماعی کاشتکار کی حیثیت سے قابل تعریف نئی خوبیاں حاصل کرلی هیں، کتنے بدل گئے هیں -

یہ سنکر دم بخود رہ جائیگا اور حیرت و خوشی کے مارے سر ھلاھلا کر کہیگا کہ دھاتسازی کا ایک ازسرنوتعمیرشدہ دیوپیکر کارخانہ وقت‌مقررہ سے پہلے چالو کر دیا گیا ھے یا یہ کہ اب تک کے ایک گمنام استخانوواِئٹ* نے ایک نیا کل یونینی ریکارڈ قائم کر دیا ھے۔

لینن گراد کے مزدور طبقے نے — جس پر سارا ملک ناز کرتا ھے — ھر جگہ کے مزدوروں کو چیلنج دیدیا ھے کہ کوشش کریں اور پنجسالہ منصوبہ چار سال میں پورا کرکے دکھائیں۔ اور ایک نئی، خوبصورت زندگی کا خاکہ ھماری آنکھوں کے سامنے ابھرنا شروع ھوگیا ھے۔

وہ پارٹی واقعی بڑی زبردست قوت کی حامل ھے جو لوگوں کو تاریخ کے بےنظیر کارنامے انجام دینے کے لئے منظم کر سکی، ان کو تعلیم دے سکی، مسلح و یکجا کر سکی۔ واقعی عظیم اور ناقابل تسخیر وہ عوام ھیں جنھوں نے نہ صرف اپنے ملک کی خودمختاری کی حفاظت کی اور تمام دشمنوں کا صفایا کردیا بلکہ دنیا میں ھر جگہ محنت‌کش عوام کی امیدوں کی مشعل راہ بن گئے ھیں!

ایسے عوام اور ایسی پارٹی کا سپوت ھونا، کیا میرے دوست، وہ عظیم‌ترین مسرت نہیں جو ھم اور ھمارے ھم عصر زندگی میں حاصل کرسکتے ھیں؟ اور کیا ھم کو، جو آج کی دنیا میں رھتے ھیں اپنی مادروطن کےلئے، پارٹی کے نصب‌العین کےلئے اس سنجیدہ ذمہ‌داری سے، جو ھم پر نہ صرف آنےوالی نسل کی جانب سے بلکہ ھمارے ملک کی حفاظت میں جو لوگ لڑے اور جانیں دیدی ان کی متبرک یاد سے بھی عائد ھوتی ھے انتھک کوشش کرتے رھنے اور بہادری کے کارھائے نمایاں انجام دیتے رھنے کا جوش و خروش نہیں ملتا؟

* * *

۲۱ جنوری کو، لینن کی وفات کے دن، ساری دنیا کے مزدور اس انسان کو جس نے نوع انسانی کو نئی زندگی کی راہ دکھائی، خاموش خراج‌عقیدت پیش کریں‌گے، بالکل اسی طرح جس طرح انھوں نے ۲۴ برس

---

* استخانوف — اس صدی کی چوتھی دھائی کے مشہور کان‌کن جن کے نام سے محنت کی کارگزاری بڑھانے کی مزدوروں کی تحریک موسوم کی گئی تھی۔ (ایڈیٹر)

''وهی، اجتماعی فارم شروع ہو رہے ہیں، اور لوگ گھنٹوں جلسوں میں بیٹھے رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، ماسکو میں بھی اس طرح جلسے نہ کیا کرتے ہوں گے!''

''کس طرح؟''

''ارے، رات اور دن جلسے ہوتے رہتے ہیں، تین تین دن لگاتار!''

''تمہارے ہاں بہت سے لوگ اجتماعی فارم میں شامل ہو گئے کیا؟''

''دو حصوں میں بٹ گئے ہیں: آدھے شامل ہوگئے ہیں اور باقی ابھی ڈھلمل یقین ہیں اور بھیڑوں کے گلے کی طرح باڑے کے پھاٹک پر گڈمڈ جمع ہو جاتے ہیں۔ جلسہ کرنے سب بیٹھتے ہیں، اور وہاں لڑنا بھی شروع کردیتے ہیں، مرغوں کی طرح۔ سچ، بڑی ہنسی آتی ہے! میرا پڑوسی سیخیئی فوسیچ بوڑھا آدمی ہے، عمر کی آخری منزلوں میں۔ وہ جلسے میں سے صرف اس وقت اٹھتا ہے جب حاجت بہت ہی ستاتی ہے، جیسے بڈھوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ یوں سمجھئے وہ اب گاؤں کی سوویت ہی میں رہتا ہے، وہیں سوتا بھی، وہیں کھاتا پیتا بھی ہے۔ اس کی بڑھیا کھانے کے وقت ایک برتن میں بند گوبھی کا شوربہ لے آتی ہے۔ مگر وہاں پہنچتے پہنچتے اسے گھنٹوں لگ جاتے ہیں، برف میں سے گھسٹ کر آنا پڑتا ہے۔ تو سیخیئی فوسیچ ٹھنڈا برف شوربہ تھوڑا بہت چمچوں سے حلق میں انڈیل لیتا ہے اور جلسے کی کارروائی میں حصہ لینے پھر جم کر بیٹھ جاتا ہے۔ گاؤں سوویت میں اس طرح چپکتا ہے جیسے دیوار میں کیل گاڑ دی ہو... اف فو، کتنا سرگرم کارکن نکلا وہ!''

''کیا وہ اجتماعی فارم کا سرگرم کارکن ہے؟''

''کون، سیخیئی فوسیچ؟ جی، وہ تو دوسری طرف کا سرگرم کارکن ہے، وہ تو مالدار، متوسط کسانوں میں سے ہے۔ وہ اجتماعی فارم کی مخالفت میں تقریر نہیں کرتا۔ وہ تو چپ چاپ پچھلی نشست میں بیٹھا زہر چھوڑتا رہتا ہے۔ کبھی کوئی انجیل کا فقرہ، یا کبھی کوئی اپنے ہی دل سے گھڑی ہوئی بات۔ ابھی پچھلے دنوں میں خود اس جلسے میں گیا تھا۔ بینچوں کی کچھ کمی پڑگئی تھی۔ اسی سیخیئی فوسیچ کے پاس میں ایک کگر پر بیٹھ گیا اور اس کے برابر ایک بیوہ بیٹھی ہوئی تھی، یفروسینیا سیلنی کووا اس کا نام ہے۔ سیخیئی فوسیچ کچھ بھنبھنائے جارہا تھا اور تقریر کرنےوالوں کی بات ہمیں صاف نہیں

* * *

جنوری ۱۹۳۰ء میں جب ڈان کے دیہات میں کاشتکاری کو اجتماعی کرنے کا عمل جاری تھا تو میں ایک مرتبہ میلیراوو سے ویشنسکایا کا سفر گھوڑوں سے چلنےوالی سلیج میں کر رہا تھا۔ مجھے اور میرے گاڑیبان دونوں کو کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ ہم ۱۶۸ کلومیٹر کا سفر کسی طرح جلدی طے کر لینگے۔ گھوڑے تھک گئے تھے، سڑک بہت ہی خراب تھی، کم ازکم لوگوں کا یہی کہنا تھا کہ بےشمار گڈھے سارے راستے ملیںگے، میدانوں میں زمین پر برف تھی اور مشرق کی سمت سے تاریک پہاڑی سلسلوں میں سے اٹھتے ہوئے نارنجی بادل خراب موسم کی غمازی کر رہے تھے۔

صبح تڑکے ہی ہم روانہ ہو گئے۔ شہر سے باہر نکل کر دھات کی بدبو کی اور چمنیوں میں سے نکلتے ہوئے دھوئیں کی دھانس رفتہ رفتہ غائب ہو گئی تھی اور ہوا میں صاف، نئی برف کی ٹھنڈک، گاڑیوں میں سے راستے کے دونوں طرف گرے ہوئے پھوس کی سہک اور گھوڑوں کے پسینے کی تیز بو نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ سردیوں کی گہری خاموشی کو برفگاڑی کی پھسلنےوالی لکڑیوں کی چرسراہٹ، گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور کبھی جب سڑک کا گڈھا زیادہ ہی گہرا ہوتا تو بموں کے آڑی لکڑیوں سے ٹکرانے کا شور ہی توڑ رہا تھا۔

میرا گاڑیبان جو ایک معمر، باریش، پرشباب انداز، شرارت کی چمک لئے چھوٹی چھوٹی دھنسی ہوئی آنکھوںوالا جن پر ایک گنگھریالی سی لٹ پڑی ہوئی تھی کاسک تھا اور نہایت ہی باتونی آدمی ثابت ہوا۔ شروع شروع میں تو وہ چپ چاپ، منہ کی سیٹی سے کوئی غمگین سی دھن نکالتا اپنے ہی خیالوں میں مست، گھوڑوں کو ہنکائے چلا جارہا تھا۔ مجھے صرف اس کی چوڑی چکلی پیٹھ جس پر بھیڑ کی کھال کا کوٹ منڈھا ہوا تھا، اس کی جھریوںدار بادامی گدی اور بالوں کی وہ لٹ دکھائی دے رہی تھی جس پر برف کے گالے جمے ہوئے تھے اور جو اس کی ترچھی سموری ٹوپی میں سے نکل آئی تھی۔ لیکن جیسے ہی میں نے اس سے کچھ پوچھا تو وہ لگام اپنی گدی کے نیچے اڑس کر فوراً میری طرف گھوم گیا اور مسکراتے ہوئے میری بات کا بخوشی جواب دیا:

”آج کل ہمارے نگلوں میں جو ہورہا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے... خدا بچائے اور اپنے حفظ و امان میں رکھے...“

”کیا ہورہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

نوچ کر رکھدیں گی، بدن پر ایک رواں بھی باقی نہ چھوڑینگی۔ ، اس نے میری طرف مغروروں کی طرح دیکھتے ہوئے کہا: 'میرے سر کا ایک ایک بال بھی نوچ ڈالیں تو بھی ان جلسوں میں جانا ہرگز نہیں چھوڑوں گا!'، اتنا سرگرم کارکن نکلا وہ۔ یہ تو میرے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا۔ ''

''اور تم، کیا تم اجتماعی فارم میں شامل ہوگئے؟''، میں نے اس سے معلوم کرنا چاہا۔

''جلدی نہیں ہے''، اس نے کہا ''شادی ہو یا اور کوئی خوشی کا موقع، میں کبھی کوشش نہیں کرتا کہ پہلے کرسی پر ڈٹ کر بیٹھ جاؤں۔ آخر میں بیٹھو تو سرے کی کرسی ملتی ہے۔ اور ضرورت پڑے تو سب سے پہلے اٹھ کر جاسکتے ہیں۔ ''، اگر میں یہ اندازبیان نہ سمجھ پایا ہوں تو مزید سمجھنے کے لئے اس نے کہا: ''ممکن ہے مجھے اس دسترخوان پر بیٹھنا پسند نہ ہو تو کیوں خواہ مخواہ بھیڑ میں بھنچ کر بیچوں بیچ پھنسا بیٹھا رہوں؟''

ہنستے ہوئے میں نے کہا کہ اگر اس نے بہت دیر کردی تو ممکن ہے اس دسترخوان پر جگہ ہی نہ ملے۔

''میرے ساتھ ایسا نہیں ہو سکتا''، اس نے ضدی پن سے سر ہلا کر کہا ''میں اس کا خوب خیال رکھتا ہوں۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ میں مثالی وضع کا ہچکچانےوالا متوسط کسان ہوں مجھے اجتماعی فارم میں شامل ہونے کا بلاوا آیا ہے۔ گھوڑوں کی ایک جوڑی اور ایک گائے بس یہی میرا اثاثہ ہے۔ لیکن چونکہ وہ لوگ جلسوں میں مجھے ہچکچانےوالا کہتے ہیں اس لئے میں ذرا اور ہچکچاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ جو اجتماعی فارم ہے اس کو ذرا اور اچھی طرح سے دیکھ لوں اور لپک کر اس میں جا کر شامل ہوجانا، کیا کہنا چاہئے...''

''ڈراؤنی سی بات معلوم ہوتی ہے؟''، میں نے لقمہ دیا۔

''نہیں، میں یوں آسانی سے ڈرنےوالا نہیں ہوں، مگر احتیاط سے کام لینا چاہتا ہوں۔ کہیں کچھ ہو نہ جائے۔ آپ مجھے یہ بتائیے: بےخطر کیا ہے — اجتماعی کاشتکار ہونا یا انفرادی؟ کس قسم کی زندگی سے مجھے بچکر رہنا چاہئے؟ بات یہ ہے کہ میں غلطی کرنے سے ڈرتا ہوں۔ جوانی میں بڑی ٹھوکریں کھا چکا ہوں۔ اور مجھے معلوم ہے کہ جدھر سے آفت کی توقع کرو ادھر سے تو آتی نہیں دوسری کسی طرف سے نازل ہو جاتی ہے، پھر خدا ہی حافظ ہے! مثال کے

سنائی دے رہی تھی۔ اسی یفروسینیا میلنی‌کووا نے اس سے نہایت نرمی سے کہا کہ وہ چپ ہو جائے، پھر اس نے دوبارہ کہا مگر پھر بھی وہ بھنبھنائے گیا۔ ضلع کے مرکز سے پارٹی کا کوئی آدمی تقریر کرنے آیا تھا۔ وہ ہمیں اجتماعی فارم کے بارے میں سمجھا رہا تھا۔ اور میخیئی فومیچ اپنی تقریر الگ کئے جا رہا تھا۔ سرگوشی کئے جا رہا تھا کہ یہ برا ہوگا، اور یہ تو اور بھی خراب ہوگا... اور پھر اس نے یفروسینیا کو کہنی سے ٹھوکا دیا اور چپکے سے کہا: 'پہلے تو یہ لوگ ساری گایوں کو مشترک ملکیت بنالیں‌گے، اور پھر وہ تم سب عورتوں کو گھیر کر ایک ھی لحاف کے اندر گھسا لیں‌گے کہ مردوں کے ساتھ سو۔ کسی جانکار آدمی سے سنی ھے میں نے یہ بات۔' اور اس نے بھی مذاق اڑاتے ہوئے فوراً ھی جواب دیا: 'ارے، کیا ھے، میں تو غریب بیوہ ہوں، میرا کیا نقصان ھے، مگر الله بچائے، کہیں تمہارے پاس نہ لیٹنا پڑے! تب تو پھر مجھے اجتماعی فارم سے استعفا دینا پڑےگا۔' تو فومیچ کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے زیادہ اونچی آواز میں کہا: 'تیرا کیا مطلب ھے، بےشرم بیسوا کہیں کی؟' اس پر تو یفروسینیا واقعی غصے سے پاگل ہوگئی اور اس نے اتنے زور سے چلا کر کہا کہ سب سن لیں: 'میرا مطلب یہ ھے کہ پرانے کھلیان کی طرح تجھ میں سے چوھوں کی مینگنیوں کی بو ایک میل سے آتی ھے!' خیر تو بات سے بات نکلتی چلی گئی اور دونوں دست و گریباں ہو گئے۔ اس نے اسے بےشرم فلاں فلاں، بےدین، گنہگار وغیرہ وغیرہ کہا اور وہ بولی کہ 'تو تو اجتماعی‌فارم کی مخالفت کرے پر کرے، کولکوں جیسا ھی تو ھے، دو جوڑیاں بیلوں کی ھیں، ایک جوڑی گھوڑوں کی مگر میرے پاس کیا ھے صرف ایک سہمی سسکی گائے۔' اس نے گندی سی گالی دی۔ وہ بھی جس قدر کوسنے دے سکتی تھی دیتی رہی۔ اور پھر ھاتھاپائی کی نوبت آ گئی۔ پرانی حکومت کے زمانے کی طرح فومیچ نے اس کا شال اتار پھینکا اور جھونٹے پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ یفروسینیا بھی کوئی بیوقوف عورت نہیں تھی، اس نے بھی ڈاڑھی پکڑلی۔ وہ نوجوان طاقتور عورت تھی اس لئے بکٹھ بھر کے بال نوچ لائی۔ دونوں کو الگ الگ کرنا واقعی کار دارد تھا۔ میں نے فومیچ کی طرف دیکھا اس کی آدھی ڈاڑھی صاف غائب ہوچکی تھی! میں نے بمشکل ھنسی ضبط کی اور اس سے کہا: 'میخیئی فومیچ، اب ان جلسوں میں مت جانا۔ ورنہ عورتیں چوزے کی طرح تمہارے پر

دل پھر مرجھا گیا۔ اس کے دانت بےحد سفید تھے، جھکا جھک، مضبوط اور تیز، قریب قریب اور سیدھے اور اس کا منہ بھرا ہوا تھا جیسے بھیڑیئے کے بچے کا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا: اب غور کرو۔ ایسے دانتوں سے تو وہ ایک سال کے بچھڑے کو چیر پھاڑ کر رکھ دے۔ اگر اس سے شادی کرلی تو میرا کیا حشر ہوگا؟ اگر کبھی آپس میں کچھ ان بن ہوجائے تو اپنے ہاتھوں سے تو خیر وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ پائیگی — اس کے ہاتھ ہیں ہی بہت چھوٹے چھوٹے — مگر فرض کیجئے دانتوں سے حملہ کر بیٹھی تو پھر خدا ہی بچائے؟ میری کھال کے تو وہ چیتھڑے بکھیر دیگی۔ ارے میرے سنبھلتے سنبھلتے وہ اتنی چمڑی تو نوچ ہی لائیگی کہ گھوڑے کے ساز کی کم از کم دو پیٹیاں بن جائیں۔

''معلوم نہیں یہ خوف تھا یا پتہ نہیں کہ غصہ مگر بہرحال میری زبان کھل گئی اور میں نے کہا: 'ابھی تو تم خوب ہنس لو، مگر یاد رکھنا مجھ سے شادی کے بعد کہیں رونا نہ پڑے۔'، اور اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور بولی: 'دیکھا جائیگا۔ دیکھتے ہیں ہم میں سے کسے رونا پڑتا ہے۔'

''یہ بات ہم نے یہیں ختم کردی۔ اور کیا آپ کا خیال اپنے دانتوں کی مدد سے وہ مجھ پر حاوی ہوئی؟ نہیں، دانتوں سے نہیں۔ جی نہیں، خدا نے ان سے تو مجھے محفوظ رکھا۔ بوڑھی ہو گئی ہے مگر منہ اب بھی دانتوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور بوڑھی کھوسٹ ان سے چیری کی گٹھلیاں اس طرح توڑ لیتی ہے جیسے سورج مکھی کے بیج ہوں۔ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس نے مجھے اپنے بس میں کیا۔ رفتہ رفتہ، سال بہ سال وہ راسیں کھینچتی ہی چلی گئی، اور ممکن ہے میں اب چاہوں تو راس تڑا کر بھاگ نکلوں مگر اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ گھوڑے کے ساز کے اس گلوبند کو پہنے رہنے کا اب میں عادی ہوگیا ہوں۔ اپنی بدبختی کو اب میں اپنا مقسوم تصور کرچکا ہوں جیسے خارشی گھوڑا اپنی پیٹھ کی پپڑی کو۔ جب میں نشے میں ہوتا ہوں تو مجھے سنبھالنا آسان ہوتا ہے اور ہوش میں ہوں تو اس سے بھی زیادہ آسان۔ چنانچہ وہ، چڑیل جس طرح چاہتی ہے مجھے ستاتی ہے۔

''بعض اوقات ہم بوڑھے کاسک چھٹی کے دن کہیں مل بیٹھتے ہیں، ایک ایک مٹکی شراب پی جاتے ہیں، پرانے وقتوں کی باتیں کرتے ہیں کس نے کہاں کہاں نوکری کی، کون کہاں لڑا، اور دو ایک

طور پر میں ایک بات بتاتا ہوں آپ کو۔ کوئی تیس برس ہوئے میرے مرحوم والدین نے ایک اور نگلے میں میری شادی کے لئے لڑکی ڈھونڈی اور ہم اس کو دیکھنے گئے۔ میں بہادر نوجوان تھا مگر اس کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو دل کی دھڑکن جیسے رک گئی اور دوسرے ہی لمحے محسوس ہوا کہ جیسے وہ حلق میں آکر اٹک گیا ہو... میرے سامنے ایک ہٹی کٹی چھوکری کھڑی تھی، بڑی بڑی چمکتی ہوئی آنکھیں اور صورت ایسی سوہنی جیسے حسین ترین پھول! وہ میری طرف دیکھ رہی تھی اور میں باوجود کوشش کرنے کے ایک لفظ نہ کہہ سکا اور سٹی گم، زبان گنگ۔

''خیر تو ہمیں کمرے میں تنہا چھوڑ دیا گیا اور ہم ایک پیٹی پر پاس پاس بیٹھ گئے۔ اور میرے منہ سے اب بھی کوئی لفظ نہ نکلا اور میں بیٹھا بیٹھا اسے آنکھیں مچکا مچکا کر اوپر سے نیچے تک دیکھتا رہا۔ ایک چیز پر میری خاص توجہ گئی: اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ، اتنے چھوٹے جیسے بچے کے ہوں۔ مجھے یاد ہے کہ میں سوچنے لگا تھا کہ ایسے ہاتھوں سے وہ چوشاخہ کیسے اٹھائیگی اور پھر کھیت میں وہ کیا خاک مدد دےگی؟ میرا دماغ تو کام کر رہا تھا مگر زبان تالو سے چپک کر رہ گئی تھی۔ ہم بہت دیر تک یونہی بیٹھے رہے اور آخر صبر کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے جھک کر میرے کان میں کہا: 'کہیں تم گونگے تو نہیں ہو؟، میں نے سر کے اشارے سے انکار کیا مگر بول پھر بھی نہ سکا، میں نے بولنے کی کوشش کی مگر بیکار۔ پھر اس نے گھور کر دیکھا اور تیزی میں آکر بولی: 'زبان دکھاؤ۔ راستے میں گاڑی کے ہچکولوں سے کہیں دانتوں میں آکر کٹ تو نہیں گئی۔ ، بیوقوف کی طرح میں نے زبان نکال کر دکھا دی... غضب ہے، آج بھی جب کبھی یاد آتا ہے تو منہ لال ہو جاتا ہے۔ کتنا احمق لگ رہا ہوں‌گا اس وقت۔ وہ اس زور سے ہنسی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ ہاتھوں سے اپنے کلیجے کو بھینچتے ہوئے اس نے بمشکل آواز دی: 'ماں، یہاں تو آؤ! ذرا اسے دیکھو تو! یہ تو نرا احمق ہے! میں اس سے بھلا کیسے شادی کر سکتی ہوں؟، یوں ستیاناس ہوا۔

''مجھے اس پر بےحد تاؤ آیا لیکن میں بھی ہنسنا چاہتا تھا اور یہاں میں نے اس کے ہنستے ہوئے منہ کی طرف دیکھا اور میرا

اپنی ڈاڑھی کے اندر ھی اندر دانت دکھاتے ہوئے اس نے مجھے انکھ ماری، تیوری پر بل ڈالکر آنکھیں چڑھائیں گویا اپنی عیارانہ نظر سے مجھے بتارھا ھو کہ وہ اتنا سیدھا سادا اور بےضرر نہیں ھے جتنا بظاھر معلوم ھوتا ھے اور جو کچھ اس نے کہا تھا وہ سب میرے اوپر چھوڑ رھا تھا کہ جو چاھوں مطلب پہناؤں — مذاق سمجھوں یا چاھے سچ۔

کئی منٹ تک وہ خاموش رھا اور پھر زیادہ افسردہ لہجے میں بولا، جس میں لاابالی‌پن کی جھلک نہیں تھی: ”میں خدا مارا کیسے جانوں کہ کیا کرنا چاھئے... چلو خیر، جیئیں‌گے تو دیکھینگے۔“

اچانک وہ اپنی گدی سے اٹھ کھڑا ھوا اور غیرمتوقع شدت کے ساتھ گھوڑوں کی پٹائی شروع کردی اور ان پر چلایا: ”کم بخت الگ تھیتی کرنےوالو، تم کن سوئیاں لے رھے تھے، کیوں؟ سکھاتا ھوں تمہیں دم ھلانا!“

برف جو ابھی تک اکادکا گالوں کی شکل میں پڑ رھی تھی اب زور سے پڑنے لگی، ھوا اور بھی زیادہ تیز ھو گئی، سڑک پر برف کے بگولے اڑنے لگے اور تھکے ہوئے گھوڑے، جن کی رانوں پر کہرے کے لچھے جم گئے تھے دلکی چلتے چلتے اب قدم پر آ گئے تھے۔

نیژنے یابلونسکوئے گاؤں پہنچتے پہنچتے ھمیں آدھی رات ھو گئی تھی۔ بڑا سا گاؤں تھا جو اب اندھیرے میں غائب ھو چکا تھا۔ صرف ایک مکان کی برف جمی کھڑکیوں میں سے ھلکی ھلکی روشنی دکھائی دے رھی تھی۔

ھم وھاں پہنچے اور رات گذارنے کی جگہ مانگی۔ میں اندر چلا گیا اور پروکوفیئےوچ گھوڑوں کا ساز کھولنے لگا۔ نیچے سے اور ایک طرف کو جھکے ہوئے اسٹول پر پلنگ کے پاس جس پر پرانے کمبلوں کا ڈھیر لگا ھوا تھا ایک بوڑھا آدمی اداسی کے عالم میں کندھے جھکائے ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس کے قدموں میں بھوسے کی چٹائی پر گٹھڑی بنا ایک کالا میمنہ سو رھا تھا۔ اس کا گھنگھریالا اون مٹی کے تیل کے لیمپ کی روشنی میں چمک رھا تھا۔ بوڑھے نے میرے سلام کا بڑے تامل سے جواب دیا، ایک نگاہ غلط انداز مجھ پر ڈالی اور پھر گردن جھکالی اور اپنی بڑی بڑی، کھردری انگلیاں چمکتے ہوئے سیاہ گھنگھریالے اون پر پیار سے پھیرنے لگا۔

ایک بوڑھی عورت نے جو اس کی بیوی معلوم ھوتی تھی، آتش‌دان

گیت گاتے ہیں... مگر آپ جانتے ہیں گھوڑی کا بچہ چراگاہ میں چاہے جتنی کلیلیں کرے آخر ماں کے پاس گھر لوٹنے کا وقت آن ہی پہنچتا ہے۔ خیر تو میں چاروں ہاتھ پاؤں کے بل رینگتا گھر پہنچتا اور وہاں میری بیوی بندوق کی طرح فرائی پان تانے دروازے پر ہی میرا انتظار کرتی ملتی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ ظاہر ہے میں اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا... ایک بات میں آپ کو ضرور بتاؤں گا: یہ میں ضرور مانوں گا کہ اس نے مجھے گھر کا دروازہ پیٹھ سے کھولنا سکھا دیا۔ میں نے چاہے کتنی ہی کیوں نہ پی رکھی ہو دروازے پر پہنچکر اپنے آپ کو یہ حکم دینا کبھی نہیں بھولتا: 'گھوم جاؤ!'، اور اس طرح سے میں گھر میں داخل ہوتا ہوں، آگے آگے پیٹھ۔ یوں زیادہ محفوظ رہتا ہوں، نقصان کم ہوتا ہے۔ اگلے روز صبح جب اٹھتا ہوں تو پوری کمر میں سخت درد ہوتا ہے جیسے کسی نے اس پر دھان کوٹے ہوں۔ پلنگ کے پاس ایک کٹورے میں بند گوبھی کا کھاری پانی رکھا ہوتا ہے اور بیوی جا چکی ہوتی ہے۔ خمار ختم ہونے سے پہلے ممکن ہے میں بدلہ لوں مگر شام تک اس کا کہیں پتہ ہی نہیں ہوتا اور اپنی لالٹین لیکر اگر شیطان بھی اس کو ڈھونڈنے نکلتا تو نہ ڈھونڈ پاتا۔ قدرتی بات ہے دن چھپنے سے پہلے میرا غصہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے اور جب وہ واپس آتی ہے تو بڑے پیار سے میری طرف دیکھتی ہے اور پوچھتی ہے: 'اور اگنات پروکوفیئےوچ، کیسے مزاج ہیں؟'، اور میں جواب دیتا ہوں: 'میں ٹھیک ہوں، افسوس مگر یہ ہے کہ آج صبح سے ہاتھ نہیں آئیں کمبخت، ورنہ ٹکڑے کرکے ڈالدئے ہوتے'۔"

"وہ مجھ سے ہمیشہ کہتی رہتی ہے کہ فرائی پان کے لئے شاہ بلوط کی لکڑی کا دستہ بنا دوں مگر میں بھی اتنا بھولا نہیں ہوں اس لئے نہایت سڑی سی لکڑی لیکر اتنا پتلا سا دستہ بناتا ہوں کہ فرائی پان اٹھاتے وقت ٹوٹ نہ جائے... بس یوں گزرتی جارہی ہم لوگوں کی۔

"یہ ساری باتیں میں آپ کو کیوں بتا رہا ہوں؟ اس لئے کہ آپ جانیں، جب میں نے شادی کی تو اپنی بیوی کے دانتوں سے خوف آیا لیکن اذیت بھگت رہا ہوں اس کے ہاتھوں کی۔ اب بھی یہی بات ہے: اجتماعی فارم میں شامل ہو جانے سے مجھے خوف آتا ہے، لیکن کون جانے کہیں اپنی کھیتی باڑی الگ کرنے سے مجھے گیدڑ کی طرح اکیلا ہی چیخنا نہ پڑے۔ الگ کاشتکاری کرنے پر جمے رہو مگر پتہ بھی نہ چلے اور زبان باہر لٹک پڑے۔ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

نہ کھانے سے گال سارے بچک گئے ہیں، رنگ مٹیالا ہو گیا ہے اور پھر بھی ہیں کہ سگریٹ پر سگریٹ پئے جاتے ہیں۔ ویسے تندرست ہیں مگر دل کو روگ لگالیا ہے، اور یہ بیماری اندر ہی اندر انہیں کھائے جارہی ہے...،،

''یہ کس قسم کی بیماری ہے؟،، میں نے بیماری کے سبب کا اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

بڑی بی نے میرے خدشات کی فوراً ہی تصدیق کردی۔

''بیماری کیا ہوتی سوائے اس کے کہ پچھلے ہفتے ہم اجتماعی فارم میں شامل ہوگئے؟ وہ خود اپنا گھوڑا وہاں لے گئے، بیلوں کی جوڑی ہانک لے گئے اور گائے کو مشترکہ باڑے میں پہنچا آئے۔ بھیڑیں ابھی تک ہمارے ہی پاس ہیں۔ مویشیوں کے بغیر یہ جگہ قبرستان معلوم ہوتی ہے...،،

آگے کو جھکتے ہوئے اس نے رازداری کے ساتھ سرگوشی کے لہجے میں کہا: ''جانتے ہیں آپ، کل جاکر انہوں نے کیا کیا؟ سیب کا ایک درخت ایندھن کی لکڑی کے لئے کاٹ ڈالا۔ اور اچھا خاصا درخت۔ میں تو دم بخود رہ گئی – میرے بڑے میاں کہیں دیوانے تو نہیں ہو گئے! شروع فصل کے کتنے میٹھے سیب دیا کرتا تھا یہ درخت! مگر اب لگتا ہے ان کو کسی بھی چیز کا غم نہ ہوتا ہو۔ کسی چیز کی ان کو ضرورت نہ ہو۔ اتنے لاپروا ہوگئے ہیں کہ جیسے ان سب چیزوں کا کوئی اور مالک ہو۔ اجتماعی فارم میں شامل ہونے کے لئے ان کو کسی نے مجبور نہیں کیا۔ خود اپنی مرضی سے انہوں نے اپنا نام لکھا۔ مگر پھر بھی دیکھئے انسان کی حالت اس نے کیا سے کیا کردی! اس جلسے سے وہ بڑے خوش خوش واپس آئے اور مجھ سے کہا: 'لے بیوی، اب تو اور میں پنچائتی کاشتکار ہیں۔ آج میں اپنا نام لکھ آیا۔ ہم سب ملکر ساتھ ساتھ ایک انجمن میں کام کریں گے۔ شاید یہ تو نہ ہو کہ اس اجتماعی فارم میں کھانے پینے کی چیزوں کے ڈھیر لگ جائیں مگر کم از کم ہمیں اتنی سخت محنت تو نہ کرنی پڑےگی۔ اور اب ہماری عمر بھی آرام کرنے کی آ گئی ہے۔' میں رونے لگ گئی اور وہ بولے: 'اری پگلی، ہم بوڑھے لوگوں کو آسانی ہو جائیگی۔ چلو، آنسو پونچھ ڈالو۔' مگر جب مویشیوں کو کھول کر لے چلے تو وہ کچھ اور ہو چکے تھے... مانا کہ ہماری

کے اوپر بچھی ہوئی چوکی پر سے آواز لگائی: ''ارے جا کر یہ تو بتا دو کہ اپنے گھوڑے کہاں باندھیں۔''

میرے میزبان نے بھیڑ کی کھال کا کوٹ کندھوں پر ڈالا اور چپ چاپ باہر چلا گیا۔

''آپ لوگ روز اتنی ہی دیر سے سوتے ہیں یا آپ کی کھیتی میں کچھ گڑبڑ ہوگئی آج؟ '' میں نے عورت سے پوچھا۔

کسی اجنبی سے بات کرنے کا موقع ملتے ہی اس نے بخوشی جواب دیا:

''ارے بھیا، کیا کھیتی ہے ہمارے پاس! لگتا ہے ہماری کھیتی باڑی کے دن تو اب پورے ہوگئے۔ اب تو یہاں نحوست کا پہرہ ہے۔ ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے وہ دو بھیڑیں اور یہ چھوٹا سا میمنہ ہے۔ ہمارے خالی خالی آنگن سے گھبرا کر کتا بھی بھاگ گیا۔ رکھوالی کے لئے اب باقی ہی کیا رہا تھا؟''

کراہتے اور خرخراتے ہوئے وہ اٹھ بیٹھی، آتش‌دان کی چوکی پر سے اپنی ٹانگیں لٹکالیں جن پر لمبے موزے چڑھے ہوئے تھے۔ لیمپ کی چمنی کے اندر سے جھلملاتی ہوئی لو کی طرف چندھیا کر دیکھا اور اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا:

''اللہ قسم، میرا بڈھا تو اپنی سدھ گنوا بیٹھا ہے۔ آج چوتھی رات ہے کہ ان کی نیند غائب ہے۔ شام کو پلنگ پر لیٹیں‌گے، تھوڑی دیر پڑے رہیں‌گے اور پھر لیمپ روشن کرلیں‌گے۔ میز کے سامنے جائینگے ایک بڑی موٹی سی سگریٹ بنالینگے اور ساری رات چپ چاپ بیٹھے سگریٹ پیتے رہیں‌گے۔ میں تو ان کی آواز تک بھول گئی ہوں۔ صبح تک سارے گھر میں اتنا دھواں بھر جاتا ہے کہ آپ مانیں یا نہ مانیں، میرا سر چکرا اٹھتا ہے اور گھٹن کے مارے سانس نہیں آتا۔ اور ان سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں پڑتی: وحشیوں کی طرح مجھے گھورتے رہیں‌گے، ایک لفظ بھی زبان سے کہے بغیر کواڑوں کو دھڑا دھڑ بند کرکے گھر سے باہر صحن میں نکل جائیں‌گے۔''

روسی کسان عورتوں کے نہ جانے کب سے چلے آرہے انداز کے مطابق اس نے اپنا گال اپنے ہاتھ پر ٹکایا اور غمگین انداز میں بولی:

''ان چار دنوں میں انہوں نے بمشکل ہی کچھ کھایا ہوگا۔ کھانا کھانے بیٹھیں‌گے، چمچہ اٹھائیں‌گے اور پھر رکھدیں‌گے اور دوسرا ہاتھ بڑھا کر تمباکو کی تھیلی اٹھا لیں‌گے۔ اتنی سگریٹ پینے سے ان کا جی کیوں نہیں متلانے لگتا، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔

نے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اپنی دھنسی ہوئی، غمناک آنکھوں سے بیچ بیچ میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا:

''بوڑھے لوگ کبھی گہری نیند نہیں سو سکتے اور پھر آجکل کے جیسے حالات ھیں تو نیند بالکل ھی غائب ہوجاتی ھے۔ دفتروں کے بابو اور شہروں کے لوگ ھمارے کسانوں کی زندگی کو سہل سمجھتے ھیں، مگر ان کو ایسا نہ سوچنا چاھئے۔ پچھلے دنوں ایک آدمی یہاں سے گذرا، ضلع کے مرکز کا کوئی نمائندہ تھا۔ میں اپنے بیل اور گائے ابھی اجتماعی فارم لیکر پہنچا تھا اور اس نے مجھ سے کہا: 'اب دادا، تم چین کا سانس لوگے۔ دنیا میں اب تمھیں کوئی فکر نہ ہوگی۔ باڑہ صاف نہیں کرنا پڑےگا، چارے کی کوئی فکر نہ کرنی ہوگی۔ جاڑا آئیگا تو تمہارا کام صرف کھانا اور سونا ہوگا۔ بہار کے موسم میں یا فصل کی کٹائی کے زمانے میں جتنا تم سے ہو سکیگا اتنا کام کرکے اجتماعی فارم کی بس مدد چاھے کردیا کرنا۔ '

''غیرسنجیدہ لوگ باتیں بھی لاابالی کرتے ھیں۔ کیا میں نے اجتماعی فارم میں اس لئے شرکت کی تھی کہ میں کاھل بننا چاھتا ہوں؟ میں تو کام ضرور کروںگا، اس وقت تک کہ میرے ھاتھوں میں جان ھے، جب تک میں چلنے پھرنے کے قابل ہوں، تاکہ مارے اکتاھٹ ھی کے نہ مرجاؤں۔ اور اس کے قول کے مطابق معاملہ یوں ھے: مجھے اب اطمینان کا سانس لینا چاھئے کیونکہ مویشیوں سے چھٹکارا مل گیا ھے۔ اس کا خیال ھے کہ چلو پاپ کٹا۔ اور درحقیقت اس نے جو سوچا تھا اس کے مطابق قطعی نہیں ہوا۔ میں نے اپنا گھوڑا، اپنے بیل، اپنی گاڑی، لوھے کے پہیوں‌والی سراون، گھوڑے کے دو گلوبند اور گھوڑے کا سارا ساز جو میرے پاس تھا سب دے دیا اور اب سمجھ میں نہیں آ رھا کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں۔ ایسا لگتا ھے کہ جیسے لمبی چوڑی ساری دنیا میرے لئے اندھیری ہوگئی ہو... دل کو بڑا صدمہ ھے، اور اس کا میرے پاس کوئی علاج بھی نہیں، یہی غم مجھے کھائے جا رھا ھے۔ سوچئے تو، جب میں گھٹنیوں چلتا تھا تب سے گھوڑوں اور بیلوں کے پاس پلا بڑھا، زندگی بھر ان کی بدولت مجھے روٹی میسر ہوئی، ان کے ساتھ ساتھ میں بوڑھا ہوا، اور اب میرے پاس کھیتی باڑی کے کوئی مویشی نہیں ھیں اور مجھے ایسا لگتا ھے کہ جیسے جنگل میں سوکھے ہوئے درخت کا ٹھنٹھ ہوں... باھر صحن میں کوئی میرا منتظر نہیں، صحن خالی پڑا ھے... ارے بھیا سمجھتے ہو

گائیں واپس دے دینے کا وعدہ کیا گیا ہے، مگر کون جانے، دیں، چاہے نہ بھی دیں...،،

مکان کے سامنے کے راستے پر ہمیں برف کی چرسراہٹ اور آدمیوں کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ بڑی بی باتیں کرتے کرتے رک گئیں اور جلدی سے اپنا پھٹا پرانا لحاف اوڑھ، منہ ڈھاک کر پڑ رہیں۔

برف میں جمے اپنے نمدے کے جوتے زور زور سے پٹخ کر چلتے ہوئے پروکوفیئےوچ گھر کے اندر داخل ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے ہمارا میزبان۔

کھانے کے وقت پروکوفیئےوچ نے لاکھ کوشش کی کہ میزبان سے بات‌چیت کا سلسلہ شروع ہو جائے مگر بڑےمیاں غمناک ھی چپ سادھے رہے یا صرف ''ھاں،، یا ''نہیں،، میں جواب دے کر ظاھر کیا کہ اس کا چم‌چچڑ مہمان وبال جان بن رہا ہے۔ کچھ برا سا مان کر پروکوفیئےوچ نے بھیڑ کی کھال کا اپنا کوٹ بینچ پر بچھایا اور سونے کےلئے لیٹ رہا۔ بڑی بی بھی اب پھر سو گئی ہوں‌گی اور صرف ہمارا میزبان اب بھی جاگ رہا تھا۔ وہ باھر صحن میں گیا اور جلانے کی کچھ لکڑیاں لے آیا۔ اپنے بستر کے نیچے اس نے جو آتش‌دان بنا رکھا تھا اس کو جلایا اور ٹانگیں پھیلا کر آگ کے سامنے بیٹھ گیا۔ حرارت محسوس کرکے میمنہ بھی قریب سرک آیا۔ وہ کھڑا ہوا تو کمزور خمیدہ ٹانگیں تھرتھرا رھی تھیں۔ پھر وہ ماں کو بلانے کے لئے آھستہ آھستہ ممیانے لگا اور آخرکار بڑےمیاں کی ٹانگوں کے پاس جا کر پھر لیٹ گیا اور اپنے ابلے ابلے زرد دیدوں سے آگ کو گھورنے لگا۔ اس کی لمبی لمبی ترچھی آنکھوں میں، سچ مچ شیطانی آنکھوں میں شعلوں کے قوس قزح کے سے رنگ کا عکس لہرانے لگا۔

''ذرا اس کیڑے کو دیکھئے، ابھی پیدا ہوا ہے مگر پھر بھی جانتا ہے آرام کہاں ملیگا۔،، بڑےمیاں نے سر کے اشارے سے میمنے کو دکھاتے ہوئے ھلکی سی مسکراھٹ کے ساتھ کہا۔

اب جبکہ طویل خاموشی ٹوٹ چکی تھی تو میں نے ھمت کرکے سوال کیا: ''آپ بستر میں لیٹ کر سو کیوں نہیں جاتے؟،،

''نیند ھی نہیں آرھی، اس لئے۔،،

اپنے دل میں غم کا جو بوجھ لئے بیٹھے تھے وہ بظاھر اب سارے بند توڑ چکا تھا، خاموشی اب برداشت نہیں ہورھی تھی اور انہوں

شام کو تو کچھ غنودگی ہو جاتی ہے، لیکن آدھی رات کے قریب آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر نیند غائب۔ اور میں جاگتا رہتا ہوں۔ کل رات کو بھی تھوڑی دیر کے لئے اونگھ گیا تھا اور پھر چونک کر جاگ اٹھا کیونکہ بیلوں کو چارہ اور ڈالنے کا وقت ہو گیا تھا۔ نمدے کے بوٹ میں نے موزے پہنے بغیر ہی پاؤں میں ڈالے، بھیڑ کی کھال کا کوٹ اوڑھا اور باہر صحن میں نکل گیا۔ غلے کی کوٹھی کے پاس جاکر کہیں یاد آیا کہ مویشی تو مشترک باڑے میں ہیں اور آخرکار مجھے آسائش کی زندگی میسر آگئی ہے... اور آسائش کی اس زندگی سے مجھے دلی رنج ہوا، بدترین بیماری سے بھی خراب تھی یہ!،،

... سوتے میں میری آنکھ باربار کھلی اور دیر تک مجھے بڑے میاں کی غمناک دبی دبی آواز اور خشک کھانسی کی دھسک سنائی دیتی رہی۔ صبح سورج نکلنے سے پہلے پروکوفیئےوچ نے مجھے جگا دیا۔ چھوٹے سے چولہے میں راکھ سے ڈھکے ہوئے کوئلے آھستہ آھستہ سلگ رہے تھے اور چھوٹے چھوٹے نیلگوں شعلے لپک رہے تھے۔ بڑےمیاں اپنی نیچی بینچ پر بیٹھے، بستر کا سہارا لئے سو رہے تھے۔ ان کا ھاتھ پہلے ھی کی طرح میمنے کی پیٹھ پر پڑا تھا اور ان کی بڑی بڑی گٹھیلی لرزتی ہوئی انگلیاں گھنگھریالے اون میں خلال کررہی تھیں۔

پروکوفیئےوچ کے قدموں کی چاپ سے خلل محسوس کرتے ہوئے بڑے میاں نیند میں کلبلائے مگر ھاتھ جہاں تھا وھیں رھا، سوتے میں بھی وہ میمنے کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے، ننھی سی جان جو ان کی آخری ملکیت رہ گئی تھی جس کی زندگی کی حرارت انفرادی کاشتکار کی حیثیت سے ان کے حالیہ ماضی کی آخری کڑی تھی۔

* * *

گذشتہ خزاں میں استالن گراد سے لوٹتے ہوئے مجھے وھی بڑے میاں یاد آئے۔

کلاچ سے تھوڑی ھی دور جو اجتماعی فارم تھے ان میں سے ایک میں ہم آدھی رات کو پہنچے۔ ۱۹۳۰ء ھی کی طرح ہم اس واحد مکان پر پہنچے جس کی کھڑکی سے روشنی نظر آرھی تھی۔ ایک چوڑی سڑک پر جہاں گھاس اگ آئی تھی یہ ایک چھوٹا سا آخری مکان تھا۔

چاندنی رات کے اس منظر میں کچھ عجیب رقت اور پیار امنڈتا معلوم ہوا: نئے سفیدی کئے ہوئے دو رویہ مکانوں اور بلند قامت

تم، صحن میں کوئی میرا منتظر نہیں؟ یا شاید تم سمجھتے ہو کہ اس قسم کا رنج انسان کے دل پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا؟

''مثال کے طور پر بیلوں ہی کو لو - تم حیران ہوگے کہ ان کو کتنی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے - گرمیوں میں اور فصل کی کٹائی کے زمانے میں — رات رات بھر ان کو چرانا پڑتا ہے تاکہ وہ خوب موٹے تازے طاقتور ہو جائیں اور اس خوف کے مارے نیند کی ایک جھپکی بھی نہیں آتی کہ صبح ہوتے ہوتے کہیں وہ ادھر ادھر بھٹک نہ جائیں اور کسی غیر کے گیہوں کے کھیت کا نقصان نہ کردیں - دن میں کام کرنا پڑتا ہے اور جب لگاتار کئی راتوں کی نیند پوری نہ ہوئی ہو تو شرابیوں کی طرح جھومنے لگتے ہیں اور چوشاخہ اتنا بوجھل معلوم ہونے لگتا ہے کہ ہاتھ سے چھوٹ کر گرجاتا ہے - جب خزاں آتی ہے تو ان بیلوں کی وجہ سے کام میں غرق ہو جانا پڑتا ہے اور سارے جاڑے بھی - رات کو دو یا تین بار اٹھ اٹھ کر جانا اور ان کو دیکھنا پڑتا ہے - ناندوں میں گھاس زیادہ ڈالنی پڑتی ہے کیونکہ راتیں لمبی ہوتی ہیں اور شام کو بہت زیادہ نہیں ڈالی جا سکتی — پیروں تلے بہت روندی جاتی ہے اور برباد بہت ہو جاتی ہے - اور گھاس کو موسم بہار تک چلانا پڑتا ہے - سردیوں کے بعد بیل چاہے جتنے بھی تندرست ہوں، بہاروں میں ان کی کھلائی خوب ہی کرنی ہوتی ہے ورنہ گرم ہوائیں چلتے ہی ٹھس ہو جاتے ہیں اور پھر چل کر نہیں دیتے - اس کے بعد تو ان کے ساتھ میں کہتا ہوں بڑی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے -

''یہی بات گھوڑے کی ہے، اس کو بھی ایسی ہی اچھی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے: وقت پر پانی پلانا، کھریرا کرنا، اور رات کو کہیں نکلنے سے پہلے اس کو دانہ دینا یا کٹی کھلانا ضروری ہوتا ہے... اچھا کاشتکار اپنی رات اس طرح گذارا کرتا ہے — دیکھ بھال اور کام کرنے میں - یہی وجہ ہے کہ وہ خرگوش کی طرح سوتا ہے: لگتا ہے کہ جیسے سو رہا ہو مگر اس کے کان ہر وقت کھڑے رہتے ہیں اور صبح مرغ کی بانگ کے ساتھ ساتھ اس کو اٹھ جانا چاہئے، بستر میں لوٹ لگانے کی اسے مہلت نہیں ہوتی -

''پچاس برس سے زیادہ عرصے میں جب سے میں اپنے گھر کا مختار ہوا ہوں، ساری رات سونے کی میری عادت ہی چھوٹ گئی ہے اور اب سرے سے نیند ہی اڑ گئی، رات رات بھر پڑا جاگتا رہتا ہوں -

کھری گھری سلوٹیں ہمیں بتا رہی تھیں کہ اس شخص کی زندگی عیش و آرام سے نہیں گزری۔

پنجوں کے بل چلتا ہوا وہ گیا اور ایک جگ میں دودھ لےآیا اور ہمارے پاس ہی میز کے سامنے بیٹھ گیا۔

''نوش فرمائیے۔ اس وقت تو یہی آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ ،،

''کیا آپ کو صدر بنے بہت دن ہوگئے ہیں؟،، میں نے اس سے سوال کیا۔

''۱۹۴۳ء سے۔ ٹانگ میں زخم کی بنا پر طبی رائے کے مطابق جب مجھے فوج سے چھٹی دی گئی تو میں محاذجنگ سے واپس آ گیا۔ اور مجھے اس فارم کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ ،،

دیکھنے میں وہ کم از کم ساٹھ کے پیٹے میں نظر آتا تھا اور میرے ڈرائیور نے قدرے حیرت سے پوچھا:

''آپ محاذ پر کیسے پہنچے؟ آپ جیسے عمر رسیدہ لوگوں کو تو بھرتی کا بلاوا نہیں آیا تھا۔ ،،

ہمارے میزبان نے رعب جھاڑنے کے انداز میں مذاقاً اپنی کھچڑی سونچھوں کو تاؤ دیا اور دانت نکال دئے۔

''میں ایسے ہی پہنچ گیا جیسے کہ بیٹے تم۔ یہ صحیح ہے کہ میری عمروں کے لوگوں کو لازماً بھرتی نہیں کیا گیا تھا اور میں سن بیالیس کی گرمیوں میں جب مجھ سے برداشت نہ ہو سکا تو رضا کار کی حیثیت سے شامل ہو گیا تھا۔ ہماری ضلع پارٹی کمیٹی کے سیکریٹری مجھ پر ہنسے: 'اس عمر میں بھلا وہاں کس کام آؤ گے؟ ممکن ہے تم کو پیدل فوج میں ڈالدیا جائے اور پھر محاذ پر نوجوانوں کے سامنے تمہاری ہیٹی ہوجائے۔ بہتر یہی ہے کہ تم یہیں جتھے کے لیڈر کی حیثیت سے کام کرو۔ عقب میں بھی ہمیں لوگوں کی ضرورت ہے۔ ' اس کے جواب میں میں نے کہا: 'یہ وقت مذاق کرنے کا نہیں ہے، کامریڈ سیکریٹری، جبکہ جرمنوں نے ایک ٹکڑے کو کاٹ کر الگ کر دیا ہے۔ اگر مجھے اپنی صلاحیت پر اعتماد نہ ہوتا تو خود ہی بھرتی کی درخواست نہ دیتا۔ رہ گیا کام جتھے کی لیڈری کا تو وہ ہماری کوئی بھی ذرا عقلمند عورت کر سکتی ہے۔ دیکھئے نا ہملوگوں پر ہی کیسی حکومت جتاتی ہیں۔ ' چنانچہ میں بھرتی ہوگیا۔ پہلے پہل تو مجھے سفرمینا میں ڈرائیور بنانا چاہتے تھے مگر میں نے درخواست

لومبارڈی درخت حور کی قطاریں گویا ان کی پاسبانی کرتی نظر آ رهی تهیں۔ ڈرائیور نے کار روکی اور قریب کی چراگاہ سے فوراً هی میرے نتهنوں میں افسنتین کی تلخ مہک آئی۔

کار کی روشنی نے سرمئی احاطے کو جب روشن کردیا تو ایک شخص اوورکوٹ کندهوں پر ڈالے پورچ میں نمودار هوا۔ تیز روشنی میں آنکهیں چندهیا کر وہ لنگڑاتا هوا سیڑهیوں پر آیا اور آواز دی:

''تم هو کیا، کولیسنیچینکو؟،، پهاٹک پر پهنچکر اس نے مایوسی کے لہجے میں کہا: ''نہیں یہ تو دوسری کار هے۔ کون هیں آپ؟ کہاں سے آئے هیں؟،،

''لیجئے یہ هیں صاحب خانہ، مزاج کے اتنے سخت،، ڈرائیور نے مذاق میں کہا۔ ''پهاٹک پر آن کر ابهی هم رکے هی هیں اور حضرت نے پوچھ تاچھ شروع کر دی اور ابهی دیکهئے حکم دیں گے شناختی کاغذات پیش کرو۔ کیا یہاں سب اسی طرح مین میخ نکالا کرتے هیں؟،،

اوورکوٹ والا آدمی کار کے دروازے کے قریب آیا اور بهل منساهت سے بولا:

''بهئی ضرورت پڑیگی تو شناختی کاغذات میں ضرور دیکهوں گا، رات گذارنے والے هیں نا آپ؟ یہی تو بات هے۔ دیر هوچکی هے۔ کسی اور جگہ کا میں مشورہ نہیں دے سکتا۔ اس لئے آپ کو میرے هاں هی ٹهہرنا پڑیگا۔ سوالات پر آپ دهیان مت دیجئے۔ یہ محاذ کی عادت هے... ویسے یہاں میری عملداری بهی هے، اجتماعی فارم کا صدر جو هوں۔ ،،

وہ راستہ دکهاتا هوا همیں گهر کے اندر لے گیا۔ چوڑے سے پلنگ پر ایک بزرگ سی عورت دو بچوں کے ساتھ سو رهی تهی۔ ذرا کی ذرا اس نے آنکهیں کهولیں اور فوراً هی پهر بند کرلیں اور ایک ایسے شخص کی نیند میں غائب هوگئی جو حددرجے تکان کے بعد اس کے غلبے میں آگیا هو۔ همارے میزبان نے لیمپ کی بتی ذرا اوپر کی اور هم سے بیٹهنے کو کہا۔

''معاف کیجئے مگر میں بیوی کو جگاؤں گا نہیں،، اس نے دبی دبی آواز میں، قریب قریب سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ''تین راتوں کی جاگی هوئی هیں سرکاری گوداموں میں اناج پهنچا رهی تهیں۔ ،،

سنولائے هوئے چہرے کی کنپٹیوں کے سفید بال اور پیشانی کی

''کبھی کبھی کوئی نوجوان فوجی اسپتال میں لایا جاتا تو اس
ں حالت بہت ھی خراب ھوتی اور وہ بدمعاش چند ھی ھفتوں میں
نرسوں سے اشارہ بازیاں شروع کردیتا، گھوڑے کے ھانپنے کی آواز کی
طرح ٹھنڈی ٹھنڈی آھیں بھرتا اور ایسی ایسی مسخری صورتیں بناتا
لہ میں تو اپنی عمر میں کبھی ھرگز نہ بنا سکتا۔ آپ اس کو دیکھتے
اور عش عش کرتے! بڑی عمروں کا فوجی اس کے مقابلے میں کم
زخمی حالت میں ھر وقت پلنگ پر پڑے پڑے پیٹھ میں زخم ڈال لیتا،
ڈاکٹروں اور نرسوں کو تنگ کرتا اور خود اپنے وجود سے اکتا جاتا،
پھر بھی وھیں پڑا رھتا، کھویا کھویا رھتا اور چھت کو تکے جاتا
اور اس طرح اشد ضرورت کے پلنگ کو گھیرے رھتا جبکہ بہت دنوں
پہلے ھی وہ اٹھ کر گھوم پھر سکتا تھا۔

''لیکن پھر میں جو بات کہنا چاھتا ھوں وہ یہ ھے کہ بڑی
عمر کے لوگ اس جنگ میں جاکر اس لئے شامل ھوئے کہ ھم نے سوویت
عہد حکومت میں جو کچھ حاصل کیا تھا دشمن ھمیں اس سب سے
محروم کر دینا چاھتا تھا۔ ھم شامل ھوئے بغیر تو رہ سکتے ھی نہیں
تھے۔ یہ بھی سمجھ لو...

''خود میری ھڈی گولے کی ایک کرچ لگنے سے ٹوٹ گئی اور وہ
جڑتی ھی نہیں تھی۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا: 'اتنے دن اس میں کیوں
لگ رھے ھیں، کہیں ایسا تو نہیں کہ پلاسٹر ٹھیک طرح سے نہ بندھا
ھو، اور اس نے مجھ سے الٹا سوال کیا تھا کہ 'تمہاری عمر کیا
ھے؟، 'چھپن برس، میں نے کہا۔ پھر اس نے قہقہہ لگایا اور کہا:
'اگر آج سے بیس برس بعد تم پھر زخمی ھوئے تو تمہاری ھڈی کبھی
جڑیگی ھی نہیں۔، میں نے تب اپنے آپ سے پوچھا تھا کہ کیا بیس
برس بعد بھی مجھے لڑنا ھوگا؟ کم بخت، کیا مزیداری ھے۔

''نہیں، شکریہ کامریڈ ڈاکٹر، میں نے اس سے کہا 'مجھے تو
نازیوں کا خاتمہ اس سے پہلے کرنا ھے۔ ایک بات تو یہ کہ ان
کمبختوں نے مجھے یہ زخم لگایا اور دوسرے مجھے اتنی مہلت کہاں
کہ اتنے دنوں تک ان کے پیچھے مارا مارا پھروں۔ پھر یہ کہ بیس
برس بعد میں کس کام کا فوجی رہ جاؤں گا؟ اچھلتا کودتا مذاق بن
چکا ھوں گا، فوجی نہیں۔ اگر میں بغیر رخصت غائب ھوجاؤں گا تو
میری پلٹن کے کمانڈر کی رات کی نیند حرام نہ ھوگی اور اس وقت تک

کی کہ پیدل فوج میں میرا تبادلہ کردیا جائے۔ میری عمر میں یہاں کام، میں آپ کو بتادوں، کچھ سہل نہیں ہوتا۔ لیکن مجھے ہنس ہنس کے سب کچھ برداشت کرنا پڑا کیونکہ یہاں تبادلہ میں نے کہہ کر کرایا تھا۔ میں استالن گراد میں لڑا اور پھر کورسک تک آن پہنچا۔ اور پھر پروخوررووکا پہنچکر میرے لئے لڑائی ختم ہوگئی — مجھے ڈاکٹری رائے کی بنیاد پر فوج سے چھٹی دیدی گئی۔ قسمت ہی خراب ہے کم‌بخت۔ صرف ایک سال ہی فوج میں رہا اور تین بار زخمی ہوا۔ اور میں اتنا جوان بھی نہیں رہا تھا جتنا پہلے تھا۔ ''

جب وہ اپنے قصے کے اس حصے پر پہنچا تو جوش بڑھ چکا تھا اور پہلے سے قدرے اونچی آواز میں بول رہا تھا:

''نوجوانوں کا زخم تو پلک جھپکاتے ٹھیک ہوجاتا ہے، جیسے چھوٹے چھوٹے درختوں میں دیکھا ہوگا آپ نے، لیکن آدمی بوڑھا ہو تو پھر مشکل ہوتی ہے۔ مجھے اپنے تجربے سے یہ معلوم ہے۔ دوسری بار جب میں زخمی ہوا تو مجھے تامبوف کے اسپتال میں لے جایا گیا اور وہاں کچھ لوگ ایسے تھے جن کی ٹانگیں ضائع ہوگئی تھیں۔ زیادہ عمروں والے بستروں میں پڑے رہتے، چہرہ زرد، جھریاں پڑی ہوئیں، رات رات بھر چیختے کراہتے، کروٹیں بدلتے اور اسی فکر میں گھلے جاتے تھے کہ اب اپنے بال بچوں کی پرورش کیسے کر پائیں‌گے اور اپاھجوں کی طرح زندگی کیسے تیر کریں‌گے۔ ان کے پلنگ ساری رات چرچراتے رہتے تھے۔ قدرتی بات ہے کہ ان راتوں میں جب ان کی نیندیں اڑی ہوئی ہوتی تھیں تو ان کے خیالات نہایت مایوسانہ ہوتے تھے۔ یہ بھی سمجھ لو۔ اور نوجوان، وہ ذرا بھی پروا نہیں کرتا۔ وہ رنج بہت سناتا ہے مگر کسی پر ظاھر ہرگز نہیں ہونے دیتا۔ جب وہ صبح کو اٹھتا ہے اور دیکھتا ہے کہ بیساکھیاں غائب ہیں — اسپتال میں سب کے لئے کافی بیساکھیاں نہیں تھیں — تو جہاں جانا چاہے کسی نہ کسی طرح، ایک ہی ٹانگ پر اچھلتا ہوا، پلنگوں کے پائنتیوں کا سہارا لیتے ہوئے یا سہارے کے لئے راستے میں جو چیز بھی ملجائے اس کی مدد سے وہاں پہنچ جاتا ہے۔ ممکن ہے اچھلتے ہوئے وہ محبت کا کوئی گیت بھی گنگنانے لگے۔ یہ ہوتی ہے جوانی! اس کو دیکھ کر آپ کو اس پر ترس آئیگا اور رشک بھی اگر میں بھی بیس تیس برس چھوٹا ہوتا تو دل ہی دل میں یہی سوچتا کیوں نہ چڑیا کی طرح پھدکتا پھروں۔

پرلے سرے پر درختوں کے ایک جھنڈ میں گیا تو کیا دیکھتا ھوں کہ دونوں وھاں موجود ھیں۔ درختوں پر چڑھے پرندوں کے گھونسلوں سے انڈے نکال رھے ھیں۔ دونوں بچے تھے زیادہ سے زیادہ کوئی پندرہ برس کے ھونگے۔ ان سے بھلا اور کیا توقع کی جا سکتی تھی؟ اور پھر بھی سچ پوچھئے تو وہ دو بڑے آدمیوں کا کام کر رھے تھے، سخت محنت کا کام۔ رات کو ٹھنڈ زیادہ پڑ جائے تو ٹریکٹر کے انجن کو چالو کرنا کوئی ھنسی کھیل نہیں۔ اور اکثر ایسا ھوتا کہ ان ڈرائیوروں میں سے کوئی لڑکی دو کلومیٹر دوڑتی، کھیتوں کو پار کرتی، مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلوں سے ٹھوکریں کھاتی اور زور زور سے ھاتھ ھلاتی چلی آ رھی ھے۔ 'کورنئی واسی‌لیوچ، اچھی ذرا، دو چار ھینڈل سار دیجئے، مجھ میں تو ذرا دم نہیں ھے!'، آپ ھی بتائیے لڑکی میں بھلا کہاں دم ھوتا ھے کہ وہ ھینڈل مارے؟ پیٹ پھٹ جائے، آنتیں باھر آ جائیں۔ ھم مرد زیادہ سخت جان ھوتے ھیں پھر بھی اتنا زور پڑتا ھے کہ کمر چٹخ کر رہ جاتی ھے...

''اور عورتیں؟ فارم میں ان کو جو کام کرنا پڑتا اسے دیکھ کر تو قسم ھے خدا کی کلیجہ منہ کو آتا ھے۔ گھر میں بھی اس کو سب کچھ کرنا پڑتا ھے۔ سورج نکلنے سے پہلے کھانا پکانا ھوتا ھے، بچوں کی دیکھ بھال کرنی ھوتی ھے، خانہ‌داری کے سارے کام کرنے ھوتے ھیں اور فوجی شوھر کی ھر وقت فکر الگ لگی رھتی ھے۔ اس کے پاس اتنا کام ھے کہ جو اس کے بس سے باھر ھوتا ھے اور پریشان‌کن خیالات اتنے ھیں کہ سوچ ھی نہیں سکتی...

''ایک بار میں صبح اندھیرے ھی کھیت کی طرف سے گزرا اور اپنی پڑوسن کو گائے کے لئے چارہ کاٹتے ھوئے پایا۔ اس کا شوھر لڑائی میں کام آیا تھا اور اس کو چار بچوں کی پرورش کرنی تھی۔ میں اس کے پاس گیا کہ کچھ ھاتھ ھی بٹا لوں۔ مگر اس نے ایسی تیز نگاھوں سے دیکھا کہ میں واقعی تھرا کر رہ گیا۔ کھیتوں کے پڑاؤ پر پہنچنے کے بعد پہلا جو کام میں نے کیا وہ یہ تھا کہ ایک سگریٹ پی۔ سگریٹ پینا میں ترک کر چکا تھا۔ محاذ جنگ پر میں نے سگریٹ بالکل نہیں پی۔ مگر یہاں تمباکو لیکر بنائی اور پھر بیٹھ کر پی۔ اس نے جن نظروں سے مجھے دیکھا تھا انہوں نے پھر میرے دل میں ایک خنجر سا بھونک دیا تھا۔''

میرا جسم ریزہ ریزہ ہو کر جھڑنے سے راستے میں جو لکیر سی بنتی جائے، اس کو دیکھ دیکھ کر میرا پیچھا کرے اور پکڑ لے۔ '

''ڈاکٹر خوش مزاج تھا وہ ہنس دیا اور بولا: 'تم فکر مت کرو۔ یہ ہم ڈاکٹروں پر چھوڑ دو۔ اگر اب سے بیس برس بعد ضرورت درپیش ہوئی تو ہم اس صفائی سے تمہیں ٹھیک کر دیں گے کہ تمہارے جسم سے ایک ذرہ بھی نہیں جھڑیگا اور مرغ پٹھے کی طرح سینہ تان کر دم پھلا کر اکڑے اکڑے پھروگے!' اس اسپتال میں میں کوئی دو مہینے رہا۔ اور واقعی انہوں نے خوب اچھی طرح پیوند لگا کر مجھے ٹھیک کردیا۔ مگر کورسک میں جو گھائل ہوا تو زخم کاری آیا تھا۔ ''

تھوڑی دیر بعد اس نے ایک طرح سے مدافعتی لہجے میں قصہ پھر سنانا شروع کیا: ''اس جیسے دشمن کے خلاف فوج میں بھرتی ہوئے بغیر میں کیسے رہ سکتا تھا؟ سوچئے تو ان ملعون نازیوں نے کتنی اچھی زندگی کا ڈھانچہ توڑ مروڑ کر رکھ دیا ہے! جنگ سے فوراً پہلے ہمارے اجتماعی فارم کے پاس تین ٹرک تھے، دو اسکول، ایک کلب گھر، آٹے کی چکی، ہر چیز کی افراط تھی، کھانے پینے کی چیزوں کی اور ضرورت کی ہر چیز کی۔ اور پھر جرمن ان علاقوں میں دندناتے چلے آئے اور کھنڈروں کے علاوہ کچھ نہ چھوڑا، موذی کیڑے ہر چیز برباد کر گئے۔

''۱۹۴۳ء میں جب میں گھر واپس آیا تو ھکابکا رہ گیا۔ خونی حرامزادوں نے فارم کی آدھی جائداد جلا کر خاک کر ڈالی تھی۔ باقی مکانات سے فوجیوں کے لئے زمین دوز رھائشی جگہیں بنالی تھیں۔ اسکولوں کو آگ لگا دی تھی۔ ہمارے پاس ایک سو اسی جوڑی بیل تھے جن میں سے صرف دو جوڑی بیل بچے تھے۔ گھوڑا ایک بھی نہیں بچا تھا اور ہمارے پاس جو ٹریکٹر تھے وہ سب توڑ پھوڑ ڈالے گئے تھے۔ تو اس طرح ہمیں سب کچھ بالکل شروع سے شروع کرنا پڑا۔

''کھیتوں میں کام کرنے کےلئے عورتیں اور بچے ہی تھے اور ٹریکٹر چلانے کو لڑکے اور لڑکیاں۔ ایک دفعہ عجیب واقعہ ہوا: بہار کا زمانہ تھا۔ میں جو گھومتا ہوا ایک کھیت میں پہنچا تو دیکھا کہ کھیت میں ایک ٹریکٹر کھڑا ہے انجن چل رہا ہے اور آس پاس کسی کا نام و نشان نہیں۔ ڈرائیور کہاں غائب ہے اور ٹریلر پر کام کرنےوالا کہیں گیا۔ میں یہی سوچتا ہوا کھیت کے

باقی کیسے بچے؟ اور پھر یہ پارسل آگیا... خندقوں میں ھی تھا کہ مجھے لاکر دیا گیا، اور کیا آپ یقین کریں‌گے اس پر میں واقعی رو دیا... میں سگریٹ پیتا نہیں تھا اس لئے تمباکو کی تھیلی میرے کام کی نہیں تھی، لیکن رسک میں نے ضرور کھائے اور اس پر تلخ آنسو بہائے... میں سوچنے لگا، دیکھئے ایک محنت‌کش عورت ھے، جسے ہماری طرح ھی دن رات کام سے فرصت نہیں ملتی، ھم لوگوں کے لئے جو محاذ پر ھیں کام کررھی ھے اور پھر بھی اس کو میرا اتنا خیال رھا۔ ممکن ھے اس نے اپنے حصے سے بچابچا کر یہ رسک میرے لئے جمع کئے ھوں؟ اس کے بارے میں سوچتے ھوئے یہ رسک مجھے اور بھی زیادہ میٹھے معلوم ھوئے...،،

اس نے اپنی کھچڑی مونچھوں پر انگلیاں پھیریں اور دانت نکال کر ھنسنے لگا:

،،ھنسی کی بات بھی تھی۔ جب اس نے پارسل بنایا ھوگا تو شاید وہ کسی نوجوان فوجی کے بارے میں سوچ رھی ھوگی اور ملا یہ مجھ جیسے بڈھے کھوسٹ کو...

،،لڑائی کے دنوں میں ھمارےھاں کی عورتوں نے بڑا بوجھ اٹھایا۔ انھوں نے اپنی ذرا فکر نہ کی، جانتی تھیں کہ سوویت ریاست کو ان کی محنت کی کتنی سخت ضرورت تھی۔ میرا بڈھا اور مختل دماغ تو یہ کہتا ھے کہ انھوں نے وہ کارنامہ انجام دیا ھے کہ یادگار قائم ھونی چاھئے۔،،

... ابھی مجھے سوئے ھوئے ایک گھنٹہ ھی ھوا ھوگا کہ کسی کار کے ھارن سے چونک کر آنکھ کھل گئی۔ میرے میزبان کی آواز باورچی‌خانے سے آئی:

،،کیا مطلب اتنی دیر کیوں کردی کولیسنی‌چینکو تم نے؟ تمھیں یہاں گھنٹوں پہلے پہنچ جانا چاھئے تھا۔ کیا تمھاری تفریح کے مارے ٹریکٹر خالی کھڑا رھے؟ میں دیکھتا ھوں، تمھیں ذمہ‌داری کا ذرا احساس نہیں ھے۔ تمھارے بتائے بغیر، میں اچھی طرح جانتا ھوں کہ ٹائر اچھے نہیں ھیں۔ اچھے ٹائر ھوں تو کار کوئی بھی چلا سکتا ھے۔ لیکن خراب ٹائروں سے اتنا ھی عمدہ کام لے سکو تو یہ ھوئی تمھاری بہادری۔ اچھا اب پھرتی دکھاؤ اور پیٹرول لیکر کھیت میں پہنچاؤ۔ سیمیون سے کہنا اجالا ھوتے ھی میں بھی آرھا ھوں۔ ،،

روشنی کئے بغیر ھی وہ کمرے کے اندر آ گیا، اپنے پلنگ پر بیٹھا اور بوڑھے آدمی کی طرح کانکھتے ھوئے اپنے بوٹ اتارنے لگا۔ میں پھر

ایک لمحے کسی سوچ میں غرق وہ میز پر انگلیوں سے طبلہ بجاتا رہا اور پھر بولا:

''آپ کو معلوم ھے ھمارے ھاں ایک پرانا گیت ھے، عورتیں گایا کرتی ھیں:

''میرے محبوب پر جنگ بہت بھاری ھے
بڑا بوجھ ھے اس کے دماغ پر ایک تو بندوق
ھے نشانہ لگانے کے لئے
اور اس پر میری فکر ھے...''

ایک مسرت خیز پرشباب مسکراھٹ سے اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''اپنے بارے میں بڑی اونچی رائے ھے ان کی، ھماری عورتوں کی، اور ھے بھی درست! یہ صحیح ھے کہ لڑائی میں وہ ھمیں دن رات یاد آتی رھیں۔ جب لڑائی واقعی گھمسان کی ھوتی تو وہ ایک گھنٹے کے لئے سرے سے سب کچھ بھول جاتے اور پھر گھر کی یاد بری طرح ستانے لگتی۔

''جب میں واپس گھر آیا اور دیکھا کہ عورتیں کس طرح کام کر رھی ھیں تو احساس ھوا کہ وہ اپنے کندھوں پر جو بوجھ اٹھائے ھوئے ھیں — تو ان پر بھی ویسا ھی سخت وقت آن پڑا ھے جیسا وھاں ھم پر پڑا تھا۔

''جب میں محاذ پر تھا تو مجھے ایک تحفہ ملا۔ وھی جو عام چیزیں ھوتی ھیں — تمباکو کی کشیدہ کاری کی ھوئی ایک تھیلی، رسک اور ایسی ھی دوسری چیزیں۔ اور ان کے ساتھ ایک خط تھا جو ماسکو کی کسی عورت کا تھا جو فیکٹری میں کام کرتی تھی۔ اس نے لکھا تھا: 'پیارے سپاھی، میں تمہیں ایک پارسل اور پرجوش تسلیمات بھیج رھی ھوں۔ دشمن کی خوب مرمت کرنا۔ یہاں ھم دفاع کے لئے دن اور رات کام کر رھے ھیں اور ھمیں ھر وقت تم لوگوں کا ھی خیال لگا رھتا ھے۔'، خیر تو آگے لوگ عام طور سے اور بھی جو باتیں لکھا کرتے ھیں، صحت اور سلامتی کی دعائیں وغیرہ کی وہ سب خط میں تھیں۔

''ان دنوں ھم کورسک کے معرکے میں تھے اور صورت حال بڑی نازک تھی۔ گھنگھور گھٹا کی طرح جرمن ٹینک بڑھتے چلے آتے تھے اور ھم جی توڑ محنت کرکے ایک لمحے کی مہلت کے بغیر جوابی حملے کئے جا رھے تھے، ھر بار جب زندہ واپس آتے تو حیرت ھوتی کہ

هو سکے اتنی جلدی فارم کو اپنے پیروں پر کھڑا کردیں۔ ہم نہیں چاھتے کہ دوسرے فارموں کے مقابلے میں زیادہ غریب ھوں۔

''اس بات کو سامنے رکھئے کہ حکومت ھمیں کتنی امداد دیتی ھے تو ایسا ھونا ھمارے لئے شرم کی بات ھوگی۔ اسی سال ھمیں دوسری مشینوں کو اگر چھوڑ بھی دیا جائے تو تیس سے زیادہ نئے ٹریکٹر ھی ملے۔ یہ کوئی ھنسی کھیل نہیں ھے! ھم چڑھائی چڑھے جا رھے ھیں، اور بہت تیزرفتاری کے ساتھ۔ امسال فصل اچھی ھوئی تھی۔ پارسال کی بہ‌نسبت ھم نے خزاں میں زیادہ زمین جوتی تھی اور سرمائی فصل ھم نے چار سو ھیکٹر فاضل زمین پر بوئی۔

''یہ دیکھتے ھوئے کہ پارسال کے سخت سوکھے کے باوجود ھم ڈوبے نہیں تھے تو اب ھمیں بڑھنے سے روکنےوالا بھی کوئی نہیں ھے! یہ بھی سمجھ لو۔''

''کیا سوکھے سے نقصان بڑا ھوا تھا؟'' ڈرائیور نے دریافت کیا۔

''ھوا بیٹے، بہت ھوا! مگر ھم ڈٹے رھے۔ میرا خیال ھے کہ ایسا سوکھا اگر پرانے وقتوں میں پڑتا تو آدھی آبادی بھوکوں مرگئی ھوتی۔ پہلے کسانوں کی زندگی کیا ھوتی تھی؟ ایک بھوکوں مر رھا ھوتا تو دوسرے مالدار آدمی کے کھلیان اناج سے بھرے پڑے ھوتے، مگر پھر بھی اپنے پڑوسی کی امداد کےلئے وہ انگلی تک نہ ھلاتا۔ اور حکومت کے افسروں کو بھلا کیا غرض پڑی تھی۔ آج‌کل کی بات ھی بالکل الگ ھے۔ جب سوکھے کی وجہ سے ھماری حالت خراب ھوئی تو ریاست نے ھمیں اناج دے کر، بیج دے کر سہارا دیا۔ ھم نے جس طرح بن پڑا لوگوں کی مدد کی، مشکل کے دن کٹوائے اور سب زندہ سلامت بچ رھے۔

''اف فو، اس بہار میں ھم نے کتنی محنت سے کام کیا! کچھ آدمیوں کی تو ھڈی سے چمڑی لگ گئی تھی اور لگتا تھا کہ جیسے ھوا کا ایک ھی جھونکا ان کو اڑا لےجائیگا۔ مگر پھر بھی وہ سب کے ساتھ کام کرنے آئے اور جتنا بن پڑا کیا۔ ھمارے لوگ، آپ جانتے ھیں، خالص سونا ھیں سونا۔ یہ بھی سمجھ لو۔''

... سورج نکلتے ھی ھم‌لوگ گاؤں سے روانہ ھو گئے۔ باھر سڑک پر آئے تو بھینی بھینی خوشبو نے تازگی بخشی۔ دریائے ڈان کی طرف سے ٹھنڈی ٹھنڈی، سیلی ھوا آرھی تھی۔ بوجھل بادل آسمان میں اتنے نیچے اڑتے پھررھے تھے کہ ڈر تھا کہیں اونچے اونچے حور کے درختوں کی پھننگوں میں اپنے پروں کی گلابی گلابی مغزی سمیت اٹک نہ جائیں۔

سو گیا۔ لیکن تھوڑی ھی دیر بعد کھڑکی کے شیشے پر کسی کی دستک سے پھر آنکھ کھل گئی۔

''سنئے، کورنئی واسی‌لیوچ،، ایک آدمی کی زوردار بھاری آواز سنائی دی۔ ''دوسرے جتھے کی بیل‌گاڑیاں واپس آ گئی ھیں۔ غلہ بھرنا شروع کردیں یا صبح ھونے کا انتظار کریں؟ بیل تھک کر چور ھوگئے ھیں۔ ،،

میرا میزبان اٹھکر کھڑکی کے پاس گیا اور دبی دبی آواز میں احکامات جاری کر دئے:

''کہنا غلہ فوراً لادنا شروع کردیں اور روانہ ھو جائیں۔ ذرا ٹھہرو، ھم ساتھ ھی کھلیان چلتے ھیں۔ ،،

مجھے اس کے واپس آنے کی آھٹ نہیں ھوئی۔ لیکن ابھی اندھیرا ھی تھا کہ اسے پھر کسی نے آن کر جگادیا۔ اسے اٹھ کر مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن ٹیلیفون کرنے کےلئے فارم کے دفتر جانا پڑا کیونکہ ایک ٹریکٹر چلتے چلتے خراب ھوگیا تھا۔ صبح ھونے سے پہلے اسے تین مرتبہ اور جگایا گیا۔

صبح کو ھمارے ڈرائیور غریب نے سوتے میں جس کی آنکھ باربار کھلی تھی، سرد آہ بھرتے ھوئے میزبان سے کہا: ''اف فو، کیا زندگی ھے یہ بھی! یہاں سونا تو جیسے کسی کلب میں سونا ھے جہاں بینڈ باجا زور شور سے بج رھا ھو۔ ،،

''یہاں چین اور سکون کہاں،، ھمارے میزبان نے جو کپڑے پہنکر تیار ھوچکا تھا، پرتکان مسکراھٹ کے ساتھ کہا۔ ''فارم بڑا ھے، کام بہت ھے اور اس لئے ھمیں راتوں کو بھی کام کرنا پڑتا ھے۔ جاؤ جا کر پھر سوجاؤ۔ اب کوئی نہیں آئیگا۔ میں جا رھا ھوں۔ آدھ گھنٹے میں بورڈ کا جلسہ ھونےوالا ھے۔ ،،

میں نے اپنی گھڑی میں دیکھا: ساڑھے چار بجے تھے۔

''صبح پانچ بجے بھی کہیں جلسے ھوا کرتے ھیں؟،، ھمارے ڈرائیور نے ھنستے ھوئے کہا۔

''اس میں ھنسنے کی کوئی بات نہیں ھے، بیٹے۔ دن کے وقت بورڈ میمبروں کو ایک جگہ جمع کرنا ممکن ھی نہیں ھوتا: ایک اناج لاد رھا ھوگا، دوسرا کھیتوں میں ھوگا، تیسرا استالن گراد جارھا ھوگا تا کہ وھاں سے فاضل پرزے لیکر آئے اور مجھے بھی تڑکے سے پہلے کھیتوں میں پہنچنا ھے۔ اسی لئے ھم نے فیصلہ کیا کہ سویرے سویرے جلسہ کرکے جلدی سے مسئلے طے کرلیں۔ ھم سب کے سامنے ایک ھی مقصد ھے: جتنی جلدی

مگر میں تو کہتا ہوں کہ لوگوں کا رہنما اچھا ہو تو کام واقعی بہت ہی اچھا ہوتا ہے۔ یہ بھی سمجھ لو۔ ،، اور اس نے فارم کے صدر کے تکیہ کلام کو ہنستے ہوئے دوہرا کر اپنی بات ختم کر دی۔

* * *

کورسک کے علاقے کے استاری اوسکول ضلع کے ’’نووی میر،، اجتماعی فارم میں جتھے کی سب سے بوڑھی لیڈر پیلاگیئیا واسی‌لیونا مارتی‌نووا نے ۱۹۴۶ء کے سوکھے کا المناک زمانہ یاد کرتے ہوئے کہا جبکہ گیہوں کے کلّے پھوٹے اور دیکھتے ہی دیکھتے مرجھا کر ختم ہو گئے:

’’ساری محنت پر پانی پھرتے دیکھ کر رنج ہوا۔ مگر ہماری محنت کو بھی جانے دیجئے۔ سوکھے سے اجتماعی فارم کو نقصان ہوا، پورے ملک کو! پپڑائے ہوئے چٹخے ہوئے کھیت دیکھ کر ایسا جی کٹتا کہ بن پڑتی تو اپنے آنسوؤں سے اسے سیراب کر دیتی!،،

۱۹۴۷ء میں عمدہ فصل پیدا کرنے کے لئے ہماری حکومت نے کورسک کے علاقے کے اجتماعی کاشتکاروں کے ایک بڑے گروہ کو تمغے دئے ہیں۔ پیلاگیئیا مارتی‌نووا اسی گروہ میں شامل تھیں اور ان کو سوشلسٹ محنت کے ہیرو کا خطاب ملا تھا۔ تقریر میں انہوں نے کہا تھا:

’’آج میں نے اپنی پوری زندگی، ایک ایک دن کرکے یاد کی۔ مجھے اپنا بچپن یاد آیا اور اپنی بیاہتا زندگی۔ کچھ اچھے، پرمسرت دن میرے گذرے ہیں لیکن آج جو خوشی میں محسوس کر رہی ہوں ایسی مسرت کبھی میسر نہیں آئی تھی... اس سے اور بھی زیادہ محنت سے کام کرنے کی امنگ پیدا ہوتی ہے، لیکن کام چاہے جتنا زیادہ کیوں نہ کر لیں مجھ جیسے عام لوگوں کےلئے ریاست جو حیرت انگیز فکر و تردد کرتی ہے اس کے مقابلے میں یہ پھر بھی تھوڑا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ،،

اپنے شاندار وطن کی خدمت کرنے کی آرزو میں ہر میدان میں لاکھوں سوویت لوگ سخت محنت سے کام کر رہے ہیں۔

پیاری، محبوب مادروطن! ہماری ساری بےپناہ فرزندانہ محبت تیرے لئے ہے، ہمارے خیالوں میں تو ہی بسی ہوئی ہے!

۱۹۴۸ء

صبح سویرا ہونے کے باوجود اناج کی کوٹھیوں کے چاروں طرف بھیڑ لگی تھی، شور مچ رہا تھا۔ دو بوڑھے آدمی اناج چھان رہے تھے اور کوئی دس بارہ بیل گاڑیاں جو غلہ پچھوڑنے کے صحن سے ابھی ابھی آئی لگتی تھیں، کونےوالی کوٹھی کے قریب خالی کی جارہی تھیں۔ وہیں ایک چھوٹا ٹرک بھی کھڑا تھا اور ڈرائیور ایک لمبا تڑنگا آدمی تھا۔ روئی کی صدری پہنے جس کے سارے بٹن سامنے سے بالکل کھلے ہوئے تھے اور اونچی سی سموری ٹوپی لگائے، ٹائر میں جوش سے ہوا بھر رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر بےآواز مگر سمجھ میں آ جانےوالی گالیاں تھیں۔

ہم اپنی راہ چپتلے چلے گئے اور ابھی کوئی تین کلومیٹر آئے ہوں گے کہ ایک بالکل نیا ٹریکٹر سڑک سے تھوڑی ہی دور چلتا ملا۔ اتنا نیا تھا کہ ابھی اس کا روغن بھی ہلکا نہیں پڑا تھا۔ ایک آدمی فوجی اوورکوٹ پہنے اس کے پیچھے لنگڑاتا چلا جارہا تھا۔ وہ چند قدم چلتا اور ایک ٹہنی سے جتائی کی گہرائی ناپتا جاتا تھا۔

''ارے یہ تو فارم کے صدر ہیں چڑیوں کی طرح دانا چگتے پھر رہے ہیں!،، ڈرائیور نے خوشی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا اور اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں۔ ''لنگڑا شیطان تو سر پر سوار رہتا ہے! اپنے ٹریکٹر ڈرائیوروں کو کم گہری جتائی تو وہ ہرگز کرنے ہی نہیں دےگا، شرط لگا سکتا ہوں اور لاپروائی سے بھی نہیں۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے راستہ پوچھنے کے بہانے یونہی ذرا کھلیانوں میں جھانک کر دیکھا تھا۔ پھٹے پڑ رہے ہیں اناج سے! یہاں کے لوگ اس سے بہت خوش ہیں۔ کہتے ہیں: 'بڑےمیاں ہیں تو سخت مزاج مگر صدر بہت ہی اچھے ہیں۔ ہر کام انصاف سے کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں کام عمدہ اس لئے ہو رہا ہے کہ وہ ہماری عزت کرتے ہیں اور ہم ان کی۔' میں نے ان لوگوں سے کہا کہ اس کے گھر میں ایک لمحے نیند نہیں آئی۔ فارم کے کام سے وہ رات بھر اٹھتا رہا باہر جاتا اندر آتا رہا۔ وہیں ایک بڑےمیاں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: 'ہمارے صدر آرام کیا ہوتا ہے اس کے معنے جانتے ہی نہیں۔ مگر جو کرے سیوا وہی کھائے میوا۔ اگر ہم نے اس سے کم محنت کی ہوتی تو دو سال میں فارم اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جاتا!'،،

دور چوڑی سبز لہروں کی شکل میں سرمائی کھیت گزر گئے اور ان کا حسن دیکھ کر ڈرائیور ششدر رہ گیا۔

''وہ سرمائی کھیت بھی اس فارم ہی کا ہے۔ دیکھئے کتنی عمدہ فصل ہورہی ہے! کورنئی واسیلیوچ ساری رات لوگوں کی تعریفیں کرتے رہے

کوئی بھی فوجی خود اپنے جیسوں کے خلاف جو اس کے لئے صرف ایک چیز کے— پرمسرت انسانی زندگی کے خواهشمند هیں — جنگ کرنے هرگز نهیں نکلے گا۔
جو لوگ نئی جنگ شروع کرنی چاهتے هیں ان کو یاد رکھنا چاهئے که عوام کا فیصله سب فیصلوں سے زیاده سخت هوتا هے۔
هم مستقبل کی جانب صاف طور سے دیکھ رهے هیں، همیں اپنے مستقبل پر پورا اعتماد هے۔
همارے ملک میں جهاں دماغی اور جسمانی محنت کے درمیان کوئی امتیاز نهیں هے، هم ایک دوسرے سے برابروں کی طرح ملتے هیں۔ آخر میں میں آپ کو اپنی اس گفتگو کے بارے میں بتانا چاهوں گا جو ایک ''عام آدمی،، سے هوئی تھی...
وه ایک معمولی ٹریکٹر ڈرائیور تھا، بیشماروں میں سے ایک۔ وه اعزاز کے ساتھ جنگ میں لڑا تھا اور برلن میں جا کر اس کو ختم کیا۔ وه چار بار زخمی هوا اور هر بار تندرست هوتے هی صفوں میں واپس پهنچ گیا تھا۔ هم نے عام طور پر زندگی کے بارے میں تبادلۂ خیالات کیا، مستقبل کے بارے میں باتیں کیں اور اس نے جو کچھ کها تھا وه یه تھا:
''میرا سینه چوڑا هے اور اسی طرح سوویت یونین کا بھی۔ هم سب کچھ برداشت کرلے جائیں گے !..،،

۱۹۳۹ء

همارے عظیم الشان تعمیراتی پروجیکٹوں میں سب سے پهلا

(ایک مضمون کا اقتباس)

روستوف بر ساحل ڈان سے لیکر تسملیانسکی گاؤں تک راستے کے دونوں طرف اناج کے کھیت بهار کی طغیانی کے بھرے هوئے پانی کی طرح لهریں مار رهے هیں۔ مسرور آنکھیں جهاں تک دیکھ سکتی هیں اس سے بھی آگے تک وه پھیلے هوئے هیں۔ آپ کو بخوبی علم هے که اپنے تین سو کلومیٹر کے اس سفر کے دوران میں آپ نے جو کچھ دیکھا هے وه پورے ملک کی فصل کا محض ایک ذره هے مگر پھر بھی آنکھوں کے سامنے جو کھیت هیں وه بے کنار معلوم هوتے هیں۔ بچپن میں آپ زمین کے جس مختصر سے گوشے میں رهتے تھے وه بھی ایسا هی وسیع اور لامتناهی معلوم هوتا تھا...

حامیان امن کی کل‌یونینی کانفرنس میں تقریر سے اقتباس

کامریڈ ڈیلی گیٹو!

میرے پیارے ہموطنو اور ساتھیو جو نوع انسانی کی تاریخ کے انتہائی نیک مقصد کے زیر قیادت اور زیر عنوان متحد ہیں!

کامریڈ غیرملکی دوستو جو ہمارے دل کے قریب اور دماغ میں بسے ہوئے ہو! آپ سے کوئی شعلہ بیان مقرر نہیں بلکہ ایک مصنف مخاطب ہے جو عام لوگوں سے ہم کلام ہونے کا عادی ہوتا ہے۔

زبان کی سادگی کے لئے میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں مگر یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ وہ شخص بھی جسے خطابت پر قدرت حاصل نہیں ہوتی، اس وقت تقریر کرنے کھڑا ہو جاتا ہے جب زندگی زندگی کے نام پر اپیل کرتی ہے...

ہمارے عظیم ملک، دنیا کے عظیم‌ترین ملک — ہماری مادر وطن نے جس نے مادہ شاہین کی طرح ۱۱۱ قومیتوں کو اپنے طاقتور پروں میں پناہ دی ہے — ہمیں یہاں لا کر جمع کیا ہے تا کہ نئی جنگ شروع کرنے کی خواہش کرنے‌والوں کی ہم عوام کی جانب سے غضبناک اور پرعزم مذمت کریں۔ ہم لوگ جو یہاں جمع ہوئے ہیں ان میں شاید ایک بھی ایسا نہ ہو جسے جنگ نے سوگوار نہ کیا ہو، جو پچھلی جنگ کے لگائے ہوئے زخم اپنے دل میں دبائے نہ بیٹھا ہو... •

سرمایہ‌دار اور ان کے خدمتگار ایک نئی جنگ کی تیاری کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے منافعوں کی خاطر، اپنی حیوانی خیروعافیت کے لئے ہم اپنے بچوں کو، خود اپنے آپ کو قربان کر ڈالیں...

وہ ایسا ہرگز نہ کرپائیں گے!

جو لوگ اپنی دیانت‌دارانہ محنت سے تابناک مسرت حاصل کرنے کا اپنا حق حاصل کر رہے ہیں وہ عزم کے ساتھ کہتے ہیں: ”ہمیں امن چاہئے!“

یہ بات وہ امن کانگرسوں میں کہہ چکے ہیں۔

جو لوگ محنت کش نوع انسانی کے خون سے خوش‌حالی حاصل کرنے کے اب بھی خواب دیکھ رہے ہیں انہیں اس سے خبردار ہوجانا چاہئے۔ بہتر ہے کہ وہ اس کی آس چھوڑ دیں۔

دیانت‌دار برطانوی یا امریکی فوجی، کسی بھی ملک کی وردی پہنے ہوئے

7*

کی پہاڑیاں بھی اور قبرستانوں کی پکی قبریں بھی۔ وہ ڈان کی بلندیوں پر واقع ھیں اور دریا کے پار چراگاھی زمینوں پر پہرہ دیتی ھیں جہاں سے پرانے زمانے میں خوزاروں، پیچینیگوں اور پولوفتسیوں کے حملہآور غول آیا کرتے تھے تاکہ روس میں لوٹمار مچائیں یا اس پر حملہ کریں۔ تانائیس (ڈان کا قدیمی نام) کے بائیں ساحل پر کنارے کنارے حملہآور جنوب مشرق سے آتے تھے اور اپنے راستے پر یہ انمٹ نشانات چھوڑ گئے تھے۔

قدیم خوزاری گڈھی جس کو دسویں صدی کے دوسرے نصف حصے میں سویاتوسلاف اور اس کے فوجی دستے نے فتح کیا تھا اب مصنوعی جھیل میں جو بحیرہ تسملیانسکوئے کہلاتی ھے، غرق ھوگئی ھے۔ کوہ کمشات سے نیچے نظر دوڑا کر جب ھرے بھرے جنگلوں اور چراگاھوں کے درمیان عجیب و غریب انداز میں لہراتے بل کھاتے ڈان کے مانوس تنگ فیتے کی جگہ چوڑاچکلا نیلا سمندر نظر آتا ھے تو دل کو ایک عجیب احساس جکڑ لیتا ھے اور رقت سی طاری ھونے لگتی ھے...

زندہباد میرے وطن کے بحیرہ ڈان، جسے بالشویک پارٹی کے عزم نے تخلیق کیا، اس عزم نے جسے پارٹی نے ھمارے عوام کے دلوں میں جا گزیں کیا اور جس سے اس نے عوام سے بہادری کے عظیم الشان کارنامے انجام دلوائے!

پائندہباد والگا ڈان نہر — جو سوویت عوام کے علم و دانش اور محنت و مشقت کی شاندار تخلیق ھے!

والگا ڈان نہر کو ھماری پارٹی اور ھماری سوویت ریاست کے بانی ولادیمیر ایلیچ لینن کے نام سے موسوم کیا گیا ھے۔ اس نہر سے ان جہازوں کے بیڑے گذرتے ھیں جن پر کوئلہ، عمارتی لکڑی، اناج، مشینیں اور کاغذ — ھمارے ملک کی دولت بار ھوتی ھے جو اس نئے آبی راستے سے لائی لیجائی جاتی ھے۔

* * *

قدرت کو فتح کرنے کے الوالعزمانہ منصوبے کے آغاز کے ھمعصر اور عینی شاھد کی حیثیت سے ھم اس کے علاوہ تو کچھ اور کر نہیں سکتے کہ مختصراً اس کا حال بیان کردیں۔ وقت آئیگا تو کوئی ادیب اس عظیم الشان تعمیر کے شایان کوئی شاھکار تخلیق کرےگا۔

والگا ڈان نہر کی کہانی بہادری، جرأت اور لگن کی کہانی ھے۔ سوچئے تو اس دیوپیکر بند، نہر، اس کے دروازوں اور متعلقہ تمام تنصیبات

جو رنگ جولائی میں عموماً گرم خطوں کی طرح نہایت ھی شوخ ھوتے ھیں اور قدرت انھیں اس قدر فضول خرچی کے ساتھ استعمال کرتی ھے بدلی چھا جانے کے بعد جب کبھی کبھار ھی دھوپ نکل آتی ھے، حسین و نازک نظر آنے لگتے ھیں۔ شمال مشرقی سمت میں پکی قبروں کی قطاروں کے پیچھے آدھے آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا جاتی ھے۔ زمین سے آسمان کی طرف قوس قزح پھیل جاتی ھے مگر بادلوں کی ڈراؤنی دبیز تہ کو چھیدنے کی اس میں سکت نہیں ھوتی اور وہ افق پر دو سیدھے اور مختصر سے ستونوں کی شکل میں پھیکی پھیکی، قریب قریب بےرنگ کھڑی نظر آتی ھے۔

سڑک کے کنارے کنارے افسنتین کا جو پہلے وادی ڈان کے میدانوں کی ملکہ تھی، دودھیا نیلا سا فیتہ چلا گیا ھے۔ اناج نے ھر جگہ اس کو دھکیل کر پیچھے ھٹا دیا ھے جو مالکانہ ٹھسے کے ساتھ قریب قریب سڑک کے کنارے تک آن پہنچا ھے اور غریب تلخ افسنتین کو اجتماعی فارموں کی چراگاھوں، جنگل کے بیچ صاف میدانوں اور نالوں کے ڈھلانوں پر بڑھنے کی مبہم سی آزادی دے رکھی ھے۔ افسنتین کے فیتے کے فوراً بعد پکتے ھوئے جئی کے پودوں کی سبزی مائل نیلی دیوار کھڑی ھوجاتی ھے جو کوئی ایک سو ھیکٹر کے رقبے میں پھیلے ھوئے ھیں اور اس کے پیچھے گہرا زرد کھیت ھے جس پر کہیں ھلکے ھلکے دھبے سے نظر آتے ھیں۔ یہ کھیت شاید یا تو گیہوں کا ھو یا جو کا جسکے پکنے میں تاخیر ھو گئی ھوگی۔ اس کے بعد پھر ایک بڑا قطعہ چمکیلے سورج مکھی کے پھولوں کا آتا ھے اور بہت دور سرمائی گیہوں کے کھیت جنکو تیز ھواؤں نے اپنے قابو میں کر رکھا ھے، بوجھل، پتھرائی ھوئی سونے کی طرح لہروں کی شکل میں لگے دکھائی دیتے ھیں۔ فصل کاٹنے کی دو کمبائنیں کھیتوں میں رینگتی چلی آرھی ھیں اور ان کے گہرے سرمئی پہلوؤں پر سورج کی شعاعیں منعکس ھو رھی ھیں۔

میدان یہاں ناھموار ھے مگر منظر حد نظر تک پھیلا ھوا ھے اور افق کا گھیرا بمشکل دکھائی دیتا ھے...

وسیع وادی کی گہرائیوں میں نیلگوں دھند گہری ھوجاتی ھے اور ڈھلان کے پرلے رخ کی بنفشئی دھند میں حل ھوکر سڑک سے کوئی بیس کلومیٹر کے فاصلے پر آسمان میں بتدریج گھلتی ھوئی معلوم ھوتی ھے۔ افق کے دھندلے سے خط کو نمایاں کرنےوالی صرف ایک ٹھوس بنیادوالی پاسبان پہاڑی ھے۔

وسطی ڈان کے داھنے ساحل پر ایسے بہت سارے ٹیلے ھیں، پاسبانی

''میرے هاں ایک جتھه تھا جس کا لیڈر الیاکین تھا اور اس جتھے میں کوئی بیس آدمی تھے،، ریزچی کوف نے مسکراتے هوئے اور ایک حد تک گھبراهٹ سی محسوس کرتے هوئے مجھے بتایا۔ ''خود الیاکین مولداویا کا رهنےوالا هے اور اسی طرح جتھے کے بیشتر افراد بھی۔ وہ غیرمعمولی طور پر اچھے مزدور تھے مگر اتنا هی نهیں: پچھلی بهار میں جب برف ٹوٹنی شروع هوئی تو ریلوے کے عارضی پل کے پایوں کے حفاظتی ڈھانچے کو خطرہ لاحق هوگیا۔ وہ لوگ تیرتی هوئی برف پر کود گئے اور کلهاڑیوں سے کاٹ کاٹ کر برف توڑ ڈالی تاکه پل محفوظ هو جائے۔ محاذجنگ پر سفرسینا کے فوجیوں کی طرح انهوں نے کام کیا۔

''سردیوں کے شروع میں ایک دن میں صبح بهت سویرے دریائےڈان پر گیا۔ ایک بهت هی بوڑھا کاسک میرے پاس آیا اور پوچھنے لگا:

'' 'اچھا تو بیٹے تم بند تعمیر کر رهے هو؟ کیا خیال هے، ٹھیک بن جائےگا؟،

'' 'یقیناً، ، میں نے جواب دیا۔ 'جب بالشویک کوئی منصوبه بناتے هیں تو وہ ٹھیک هوکر هی رهتا هے۔ ،

'' 'لگے رهو، بیٹے۔ ، بڑے میاں نے متفکر انداز میں گھورتے هوئے کها۔ ' دیکھو، بید سرخ هے — اس کا مطلب هے که سردیوں میں ٹھنڈ زیادہ نهیں هوگی، مگر جب بهار آئے تو خبردار رهنا۔ برف ٹوٹنے کے بعد پانی گرم آئیگا اور اگر هشیار نه رهے تو تمهیں اچھی طرح دھو دیگا۔ ڈان کو صرف کتابوں هی میں پرسکون دریا لکھا جاتا هے لیکن درحقیقت بهاروں میں وہ واقعی نهایت هی غضبناک هوجاتا هے، راستے میں جو چیز آئے اس کو چکناچور کر دیتا هے۔ اس لئے یه دیکھنے کےلئے آنکھیں گاڑے رکھنا که تم جو بند تعمیر کر رهے هو اس کو نه توڑ ڈالے۔ ،

''وہ مڑا اور ٹهلتا هوا چلا گیا۔

''دریا پر جب برف ٹوٹنی شروع هوئی تو اس سے همیں واقعی بڑی دقت اٹھانی پڑی۔ بظاهر ایسا معلوم هوتا تھا که هر چیز کا پهلے هی سے خیال رکھ کے انتظام کر لیا گیا هے۔ لیکن پانی اتنا چڑھا — پچھلے ستر سال میں سب سے زیادہ — که صرف طاقتور مشینوں کے ساتھ ساتھ عوام کی شجاعت هی نے مل کر سب کچھ برباد هونے سے بچایا۔ کئی کئی راتیں لوگ سوئے نهیں، بند اور عارضی پل کو بچانے کےلئے کام کرتے رهے۔ پانی اتنا چڑھا که پل کے فرش تک جا پهنچا۔ پل کے پایوں کے حفاظتی ڈھانچے اس غضبناک طریقے سے چٹخ رهے تھے که آواز سنکر خوف آتا تھا۔

کی تعمیر کے سلسلے میں کتنی راتوں کی نیندیں اڑی ہوں‌گی، کتنا غوروخوض کیا گیا ہوگا اور کتنی توانائی صرف ہوئی ہوگی! والگا ڈان نہر کی تنصیبات اور مشینری کی تیاری میں پورے کثیر قومی ملک نے اپنے اپنے حصے کا کام کیا، اور تعمیر کے کام میں پورے سوویت یونین سے آئے ہوئے لوگوں نے حصہ لیا تھا۔

والگا ڈان نہر کو ہم نے روس کے صدیوں پرانے خواب کی تعبیر کا نام دیدیا ہے۔ پیٹراعظم نے اس کے متعلق سوچا تھا اور اسی طرح روس کی ترقی کے خواہاں دوسرے اعلی دماغوں نے بھی مگر ان کے خواب پورے نہیں ہوئے۔ استراخان کے گورنر شہزادہ گولیتسین کا جسے پیٹر اعظم نے کھدائی کی نگرانی کا فرض سونپا تھا، اس حیرت‌انگیز مہم کی تکمیل کے امکان پر سے اعتقاد اٹھ گیا تھا اور اس نے زار کو لکھاتھا: ''دریاؤں پر صرف خداوند کی حکمرانی ہے اور اس قادر مطلق نے جسے تقسیم کردیا ہے اسے متحد کرنا انسان کی گستاخی ہوگی۔ ،،

کمیونسٹ پارٹی کے عزم سے متحد لوگوں نے وہ کام کر دکھایا ہے جو کبھی گستاخی اور ناممکن تصور کیا جاتا تھا۔

روسیوں کا صدیوں پرانا خواب جو پوری سوویت قوم کا خواب بن گیا تھا، بالشویک پارٹی نے حقیقت میں تبدیل کردیا، اور حب‌الوطنی کی جنگ عظیم کی طرح، یہاں بھی تعمیر کے ہر شعبے میں سیکڑوں کمیونسٹ پیش پیش رہے۔ قدرت کی قوتوں کو قابو میں کرنے اور یہ عظیم‌الشان پروجیکٹ پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں انہوں نے عوام الناس کی قیادت کی۔

* * *

ہمیں کامریڈ استالن کا قول یاد ہے: ''عظیم مقصد سے ہی عظیم توانائی پیدا ہوتی ہے،،۔ کمیونسٹ تعمیر کے عظیم مقاصد کی خدمت انجام دیتے ہوئے عوام نے عظیم توانائی کا مظاہرہ کیا۔

تسملیانسک پن بجلی پروجیکٹ کے چوتھے حلقے کے سربراہ انجینئر فیودور ایوانووچ ریزچی‌کوف گورکی کے رہنے والے ہیں اور چہرے مہرے میں یا شاید محنت‌کش کے جثے میں اپنے اس ہم‌شہر * سے بہت ملتے جلتے ہیں جس کے نام سے اب یہ شہر موسوم ہے۔

---

* یعنی میکسم گورکی۔ (ایڈیٹر)

بنی ہوئی اپنی چوکی میں بیٹھے تھے، پورے منظر کا معائنہ کر رہے تھے تو یہ بتانا مشکل تھا کہ کھدائی مشینوں کی بالٹیاں اس قدر تیز رفتاری سے پتھروں کو ٹرکوں میں لاد رہی تھیں یا ہزاروں انسانی ہاتھ۔ انہیں تو بس وہ چنگاریاں اڑتی نظر آ رہی تھیں جو پتھروں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے سے پیدا ہورہی تھیں۔

عجیب واقعہ دستاویزی فلم بنانےوالوں کے ساتھ پیش آیا جو بند باندھنے کا منظر فلمانے آئے تھے۔ یہ منظر فلمانے سے وہ چوک گئے کیونکہ انہوں نے حساب لگایا تھا کہ ڈان کا بہاؤ روکنے میں ساٹھ گھنٹے لگیں گے اور یہ کام درحقیقت آٹھ ہی گھنٹوں میں مکمل کر لیا گیا۔ صبح سویرے جب وہ لوگ پہنچے تو سارا کام ختم ہوچکا تھا اور وہ حیرت اور ناامیدی کی تصویر بنے پتھروں کے اس پہاڑی سلسلے کو دیکھ رہے تھے جو دریا کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ تعمیر کے سیاسی شعبے کے سربراہ الیکسئی کاوری لووچ چرکاسوف نے مایوسی سے نڈھال کیمرمینوں سے اظہارھمدردی کیا لیکن یہ کہتے وقت ان کی آنکھوں میں خوشی کی ایک چمک تھی: ''واقعی بڑی شرم کی بات ہے! اس کام میں ساٹھ گھنٹے لگنے تھے، مگر معماروں نے اسے آٹھ گھنٹے ہی میں پورا کر لیا، بےشرم کہیں کے۔ آپ کی مدد تو میں بخوشی کروں، مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے کروں۔ اس پہاڑی کو بارود سے اڑوادوں اور سارا کام پھر سے شروع کرنے کو کہوں۔ مگر یہ بنائی اس لئے گئی ہے کہ مدتوں باقی رہے اس لئے افسوس ہوگا۔ آپ کی مایوسی پر مجھے واقعی ھمدردی ہے مگر افسوس مجھے اندیشہ ہے کہ میں آپ کی مدد کچھ نہ کر سکوں گا۔ ،،

دوسرے انجینئروں کے ساتھ ساحل دریا پر اس پروجیکٹ کے ڈائریکٹر واسیلی آرسینتئےوچ بارابانوف بھی کھڑے تھے اور نہایت زبردست قوت ارادی سے کام لیکر اپنی ہیجانی کیفیت پر قابو پائے ہوئے تھے۔ بوڑھے دیہاتی اپنی آنکھوں کے سامنے مصیبت ڈھانےوالے بےقابو طوفان‌خیز ڈان کی جگہ جس سے وہ ہمیشہ سے روشناس تھے، ایک سدھی ہوئی ندی کو دیکھ کر جو اب آئندہ لوگوں کی ضرورتیں پوری کیا کرےگی، آنسو بہا رہے تھے۔

میری ملاقات لینن گراد کے انجینئر سرگیئی گری گوریئےوچ پیتروف سے بھی ہوئی جو بہت ہی اچھے آدمی، پسند آنےوالے شخص ہیں، شگفتہ مزاج، محنت کشوں جیسے صاف گو۔ وہ سولہ پن بجلی گھروں کی تعمیر میں ہاتھ بٹا چکے ہیں اور اس کے لئے دور شمال سے لیکر انتہائی جنوبی علاقے تک کا اور ملک کے مشرقی سرے سے لیکر مغربی سرے تک کا سفر کر چکے

بڑے میاں کو معلوم تھا کہ وہ کیا کہہ رہے ھیں۔ طغیانی کے پانی میں ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے ٹکڑے، لٹھے اور وہ درخت جنھیں دریائے ڈان کی باڑھ کی زمینوں میں کاٹ ڈالا گیا تھا، بہے چلے آرھے تھے اور پل کے ستونوں کے پاس آن کر ان کا ڈھیر لگ گیا تھا اور اب ڈر یہ ھورھا تھا کہ کہیں پل ھی نہ بہہ جائے۔ برف توڑنے کےلئے بارود کا استعمال کیا گیا مگر اس سے ملبے اور درختوں کا ڈھیر تو ختم نہیں ھوا۔ الیاکین کے معماروں کے جتھے کے لوگ اس موقع پر کلہاڑیاں اور آرے لے لےکر پل کے اوپر سے کود گئے اور کمر کمر تک مچلتے بل کھاتے زور لگاتے پانی میں کھڑے ھوکر درختوں کے تنے کاٹے، ملبے کے ڈھیر کو ھٹایا تاکہ پل کے ستونوں کے درمیان پانی گذرنے کا راستہ بن جائے۔ ،،

جائے تعمیر پر اب نہ تو الیاکین تھا نہ ھی اس کے جتھے کے دوسرے افراد لیکن انھوں نے جو کارنامہ انجام دیا تھا اس کو وہ لوگ مدتوں یاد رکھیں گے جن کے ساتھ اور جن کے لئے انھوں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈالکر کام انجام دیا تھا۔

اگرچہ تعمیر کےلئے انتہائی جدید مشینیں اور مشینی کلیں بڑی تعداد میں فراھم تھیں لیکن جسمانی محنت کے بغیر جو اکثر خطرناک ھوتی تھی کام نہیں چلتا تھا۔ اس سے پہلے کے موسم بہار میں جب طغیانی آئی تو بند کی کوٹھریوں اور پن بجلی گھر کی عمارت کی بنیادوں میں پانی گھس آیا، سڑک کی گٹیوں کو بہا لے گیا اور بند کے لئے کیچڑ چوس کر مٹی نکالنے والی مشینوں کی پائپ لائن کو ناس کرکے رکھ دیا تھا۔ ان پائپ لائنوں کو بچانے کے لئے لوگوں نے گردن گردن تک ٹھنڈے یخ پانی میں کھڑے ھوکر کام کیا تھا۔ یہ جان جوکھوں کا کام انھوں نے خود اپنی پیش‌قدمی پر کیا تھا، یہ کسی کے حکم کی تعمیل کی بات نہیں تھی۔ اور انھوں نے بند کے دائیں کنارےوالے حصے کو اور تسملیانسک پن بجلی گھر کی کوٹھی کو آخرکار بچا ھی لیا تھا۔

جب دریائےڈان کی اصل دھار کو پشتے کے اوپر سے بہنے کے لئے موڑا گیا تو اس کے خاص راستے کو جو اب تنگ ھو گیا تھا، باندھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ ھزاروں لوگ اور مٹی ڈھونے کے بیشمار ٹرک کام پر لگائے گئے تھے۔ معماروں کے علاوہ مقامی گاؤں اور نگلوں کے باشندے تھے جو جس طرح کی مدد درکار ھو وہ دینے آئے تھے۔ اندھیری رات تھی اور بیشمار بلب اور فلڈ لائٹیں روشن تھیں۔ فیودور ایوانووچ ریزچی کوف نے جو اس حلقے کے نگران تھے مجھے بتایا کہ جب وہ لکڑی کے تختوں کی

برقی قوت پیدا کرے کہ جو ساٹھ لاکھ مربع کلومیٹر کے علاقے کو صحرائے اعظم کو هرے بھرے باغ میں تبدیل کر دے۔ مجموعی اخراجات پہلی عالمی جنگ کے مجموعی خرچ کے پندرھویں حصے کے برابر ھوتے۔ لیکن سرمایہ‌داری کے حالات میں نوع انسانی کو بے پناہ فائدے پہنچانے والے ایسے پروجیکٹ پایہ تکمیل کو نہیں پہنچائے جا سکتے۔ ترقی‌پسند لوگوں کے سائنس اور انجینئرنگ کے فکری نتائج سرمایہ‌دارانہ ''پروجیکٹوں کے قبرستان،، میں دفن ھیں۔

ولادیمیر ایلیچ لینن نے لکھا تھا: ''چاروں طرف ھر قدم پر ایسے مسئلوں سے دوچار ھونا پڑتا ھے جو انسان فوراً حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ھے، مگر سرمایہ‌داری راستہ روک لیتی ھے۔ اس نے بے‌پناہ دولت اکٹھی کرلی ھے اور لوگوں کو اس دولت کا غلام بنا لیا ھے۔ اس نے انتہائی پیچیدہ ٹکنیکی مسئلے حل کر لئے ھیں — اور کروڑوں لوگوں کی مفلسی اور جہالت کی وجہ سے، مٹھی‌بھر کروڑپتیوں کے احمقانہ لالچ کے باعث ٹکنیکی اصلاحوں کے اطلاق کا راستہ روک دیا ھے۔،،

ھمارے والگا ڈان پروجیکٹ کی تعمیر امن اور لوگوں کی خوش‌حالی کے لئے ھوئی ھے۔ ۲۷ لاکھ ۵۰ ہزار ھیکٹر بے‌آب زمین کی سنچائی ھوگی۔ زوردار طریقے سے نشو و نما حاصل کرتی ھوئی ھماری سوشلسٹ صنعت میں تازہ قوت انڈیلی جائیگی اور سینکڑوں برقی ٹریکٹر کام کرنے لگ جائیں گے۔

* * *

والگا ڈان نہر کی تعمیر کے لئے ضروری ھوا کہ بہت سے کاسک گاؤں اور نگلوں کو جو ان خطوں میں آباد تھے جہاں پانی بھرا جاتا تھا، دوسری جگہ پھر سے بسایا جائے۔ اس ھجرت سے لوگوں کو کوئی نقصان نہ اٹھانا تھا... سوویت حکومت نے کاسک اجتماعی کاشتکاروں سے حقیقی معنوں میں پدرانہ شفقت کا سلوک کیا، ان کی فوری ضرورتوں اور ان کے مستقبل کا پورا پورا انتظام کیا۔

مکانوں، مویشیوں کے باڑوں، کنوؤں، سیب اور چیری کے درختوں کا کاسکوں کو فراخدلی سے نقد معاوضہ ملا۔ ریاست نے ان کے لئے نقل و حمل کی سہولتیں فراھم کیں، دوبارہ بسنے والوں کے لئے عمارتی سامان مہیا کیا، متعدد دوسری مراعات کے ساتھ ساتھ انہیں اس جگہ قطعات‌اراضی دئے جہاں مستقبل کے مصنوعی سمندر کا ساحل ھونا تھا۔

ھیں ۔ وہ ھر دم رواں دواں رھتے ھیں، ایک پروجیکٹ ختم کرکے دوسرے پر چلے جاتے ھیں اور ان پر قدرے ترس بھی آتا ھے ۔ اپنے وطن اور اپنے کنبے کے پاس وہ سال میں صرف ایک بار ھی جاپاتے ھیں ۔ مگر اسی جبری علیحدگی کا کوئی علاج نہیں ۔ ان کے بچے ، جو اب اسکول جانے لگے ھیں باپ کی خانہ‌بدوشوں کی سی زندگی کے باعث ایک اسکول سے دوسرے اسکول میں نہیں جا سکتے ۔ ھر نئے تعمیری پروجیکٹ سے پیتروف کو جیسے عشق ھو جاتا ھے اور ھر ٹربائن کے چالو ھونے کے بعد جسے وہ لگاتے ھیں انہیں ذاتی طور پر ایک سکون قلب حاصل ھوتا ھے ۔ میں انہیں جٹ سے اپنے ھاتھ صاف کرتے غور سے دیکھ رھا تھا اور مجھے خیال ھوا کہ شاید وہ اب اپنے نئے کام کے بارے میں سوچنے لگے ھوں‌گے — تخیہ تاش میں یا کہیں اور ۔

* * *

والگا ڈان پروجیکٹ عوام کی عظیم‌ترین تخلیقات میں سے ھے ۔ دنیا کا عظیم ترین * تیرہ کلومیٹر کا مٹی کا بند پہاڑ کی پشت کی طرح ڈان کی سیلابی زمین پر سر بلند ھے ۔ پن بجلی گھر سے ڈان کی سرزمین کے صنعتی مرکزوں اور گاؤں کو برقی قوت فراھم ھوتی ھے اور پانی ڈان نہر کے ذریعے خشک میدانوں میں دور دور تک پہنچ جاتا ھے ۔

دریائےڈان سے والگا تک بیچ کی زمین میں ایک حیرت‌انگیز زینہ بن گیا ھے اور مال آنے جانے کا تانتا بندھا رھتا ھے ۔

ھم جو کچھ والگا ڈان نہر پر دیکھ رھے ھیں وہ ان عظیم‌الشان بہت سے پروجیکٹوں میں سے صرف ایک ھے جو آجکل ھمارے ملک میں عوام کی بھلائی اور مسرت کےلئے زیر تعمیر ھیں ۔

عوام کی بھلائی کےلئے اس قدر وسیع پیمانے پر تعمیر شروع کرنے کا کوئی سرمایہ‌دار ملک خواب بھی نہیں دیکھ سکتا ۔ ایک زمانے میں غیرملکی انجینئروں نے بحیرۂ روم کے ایک حصے کو بنیادی طور پر بدل ڈالنے کےلئے ایک جلیل القدر منصوبہ مرتب کیا تھا ۔ ان کی تجویز تھی کہ جبل‌الطارق اور درہ دانیال کی آبنایوں پر بند باندھ دئے جائیں، سمندر کی سطح نیچے کی جائے جس سے زرخیز زمین کے وسیع‌وبسیط قطعات اوپر آجائیں‌گے۔ جبل‌الطارق کے بند پر جو بجلی گھر تعمیر ھو وہ اتنی زبردست مقدار میں

---

* بوقت تحریر ۔ (ایڈیٹر)

والگا ڈان سے بھی زیادہ شاندار اور پرشکوہ پروجیکٹ مکمل ہوجائیں گے ۔ لیکن لوگوں کے ذہن میں والگا ڈان کی یاد عظیم تعمیراتی پروجیکٹوں میں سے پہلونٹی کے پروجیکٹ کی حیثیت سے ہمیشہ باقی رہیگی۔ اور مائیں، چاہے وہ تسلیم نہ کریں، اپنے پہلونٹی کے بچے کو ہی سب سے زیادہ چاہتی ہیں ۔

لوگو، میرے ہموطنو جو ہماری دانشمند بالشویک پارٹی کے خیالوں کا مرکز ہو، تمہیں امن اور خوش‌حالی کےلئے تعمیر شدہ اپنی عظیم تخلیقات پر خوشیاں منانی چاہئیں!

روس کو برقیانے کا منصوبہ جو لینن کے اعلی دماغ کی اپج تھا خانۂ‌جنگی، سامراجی مداخلت اور معاشی بدنظمی کے ناقابل یقین مشکل حالات میں شروع کیا گیا تھا ۔ پہلے دو برسوں کے دوران میں محض ۱۲ ہزار کلوواٹ صلاحیت کے بجلی گھر چالو کئے گئے تھے ۔ اب تک جو نتائج حاصل ہوئے تھے وہ نہایت ہی کم تھے ۔ لیکن سوویت عوام سے اپیل کرتے ہوئے کہ وہ اپنا بہادرانہ شہری فرض ادا کریں، ولادیمیر ایلیچ نے کہا تھا :

’’بارہ ہزار کلوواٹ بہت ہی معمولی آغاز ہے ۔ جو غیرملکی لوگ امریکہ، جرمنی یا سویڈن میں برقیانے کے عمل سے روشناس ہیں وہ ممکن ہے کہ اسے مضحکہ‌خیز محسوس کریں ۔ مگر جو ہنستا اٹھے وہی ہنستا بھلا ۔ ‘‘

ہم اپنی عظیم تعمیرات پر خوشیاں ضرور مناتے ہیں اور ضرور مسکراتے ہیں مگر کسی طرح تنگ خیالی سے نہیں : ہماری مسکراہٹ فاتحین کی مسکراہٹ ہوتی ہے ، ان لوگوں کی مسکراہٹ جنہیں نوع انسانی کی آئندہ مسرت پر یقین کامل ہے ۔

۱۹۵۲ء

میں نے دعوت بخوشی منظور کرلی

میں نے جرمن جمہوری ری‌پبلک جانے کی دعوت بخوشی منظور کرلی ۔ کوئی تیس برس سے زیادہ عرصہ ہوا میں ۱۹۳۰ء میں جرمنی گیا تھا ۔ میں سورینتو میں گورکی کے پاس جارہا تھا مگر وہاں تک پہنچ ہی نہ پایا کیونکہ اطالوی ارباب‌اختیار نے مجھے پروانۂ‌راہداری دینے سے انکار کر دیا تھا ۔ اس پروانۂ‌راہداری کا انتظار کرتے ہوئے میں نے جرمنی کی سیر کرلی تھی ۔

بوڑھے لوگوں کے لئے اپنے گھروں کو چھوڑ کر جانا واقعی ایک دلسوز جدائی تھی۔ جب وہ روانہ ہونے کے لئے تیار ہوئے تو اس دھرتی کو چوما جہاں وہ خود اور ان کے آباواجداد پیدا ہوئے تھے۔

پھر بھی اپنے نئے گھروں میں آباد ہونے اور نئے سمندر کا عادی ہوجانے میں انہیں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔

یہی کیفیت سولینوفسکی گاؤں کے باشندوں کی تھی جنہیں مصنوعی سمندر کے عین ساحل پر، پرانے گاؤں کے اصل محل‌وقوع سے کچھ ہی دور اس جگہ پھر سے بسایا گیا ہے جہاں پن بجلی گھر کا بند تعمیر کیا گیا ہے۔

سولینوفسکی گاؤں کی اچھی خاصی ایک تاریخ ہے۔ ۱۹۱۸ء میں وہاں کے تمام کاسک لال چھاپہ‌مار دستے میں شامل ہو گئے تھے اور بعد میں انہوں نے ہی سب سے پہلے اجتماعی فارم قائم کیا اور معرکے میں کام آنےوالے اپنے چھاپہ‌مار کمانڈر چیرنی‌کوف کے نام سے اس کو موسوم کیا تھا۔ سولینوفسکی کے سینکڑوں آدمی حب‌الوطنی کی جنگ‌عظیم میں لڑے اور اب ان میں بہت سارے والگا ڈان تعمیر پر کام کر رہے ہیں۔

انہیں ''تسملیانسکایا دروژینہ،، اجتماعی فارم سے کچھ ہی دور دوبارہ بسایا گیا تھا جہاں کے پرانے کاریگروں — بڑھئیوں، چھت ڈالنےوالوں اور لوہاروں نے اپنے نئے پڑوسیوں کی حقیقی معنوں میں برادرانہ شفقت سے مدد کی تھی۔

سولینوفسکی کے چار ممتاز چھاپہ‌ماروں، الیکسئی چیرنی‌کوف، واسیلی تیرسکوف، سوئسی یرما کوف اور واسیلی فرولوف کے جسد خاکی نئے گاؤں کے مرکز میں لاکر دوبارہ دفن کئے گئے ہیں۔

مشترکہ کوشش سے ایک فوجی کی بیوہ یودوکیا کورباتووا کےلئے اور دو معذوروں تیرینتی کوروچکن اور الکساندر اسکورباتوف کےلئے جو پرانے گاؤں میں خستہ حال مکانوں میں رہتے تھے، لکڑی کے نئے مکانات تعمیر کئے گئے۔

سولینوفسکی اجتماعی‌فارم نے نئی جگہ جڑیں پکڑ لی ہیں۔ پھلوں کے باغات لگا دئے گئے ہیں اور تھوڑے ہی دنوں میں پھل بہ‌افراط آنے لگیں‌گے۔

سیب اور ناشپاتی کے چھوٹے چھوٹے نئے درختوں کی پھننگوں کو مشرق سے آنےوالی ہوائیں جھمانے لگیں‌گی، ڈان کے میدانوں میں سنچائی کے کھیتوں میں گیہوں کی فصل لہلہانے لگےگی اور مادروطن کا دل باغ باغ کرنے کے لئے کمیونسٹ معماروں کی نئی پود پروان چڑھنے لگ جائیگی۔

کسی قوم کےلئے اس کے سپوت جو کوشش کرتے اور جو تصورات ان کی جدوجہد، اپنے مقصد کےلئے وقف ان کی زندگی میں جوش اور ولولہ پیدا کرتے ہیں فکرانسانی ان کی بصد احترام متلاشی ہوتی ہے۔ نوع انسانی کی تاریخ میں ایسی ہی ایک ہستی موہن‌داس کرمچند گاندھی (مہاتما گاندھی) کی تھی۔

ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک کی اس ممتاز ہستی کے صد سالہ جنم دن کے موقع پر شائع کی جانےوالی اس کتاب کے بہت سے مضمون نگاروں میں سے ایک میں سوویت مصنف ہوں۔ قدرتی بات ہے کہ میں ہندوستانی قارئین کو گاندھی کی زندگی اور ان کے بیش بہا ادبی ورثے کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤں‌گا اور نہ ہی کچھ ان کی تلاش‌مسلسل اور ان کے نظریات کے پرپیچ ارتقاء کے بارے میں کچھ کہوں‌گا۔ اس کتاب کے دیگر مضمون نگار حضرات جنہیں اس موضوع پر خاص معلومات حاصل ہیں اس کے بارے میں لکھیں‌گے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں ہندوستانی قارئین سے گاندھی کی، سماجی اور سیاسی رہنما کی حیثیت سے، صرف ان خصوصیات کے بارے میں بات‌چیت کرنا چاہوں‌گا جن سے میں اور اسی طرح بہت سارے سوویت عوام سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں گاندھی کا ایک ہمہ گیر مطالعہ پیش نہیں کررہا، جسکی میں کبھی جرأت بھی نہیں کروں‌گا بلکہ اس کتاب کے قارئین کو ان کی نوع بنوع سرگرمیوں کے بعض پہلوؤں کے بارے میں محض اپنے خیالات سے آگاہ کر رہا ہوں۔

گاندھی اور روس کے عظیم ادیب تالستائی کے درمیان قربت کی حیرت‌انگیز حقیقت کو کیا کوئی نظر انداز کر سکتا ہے؟ یہ ایک نمایاں مثال ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان تواریخی حالات میں زبردست فرق کے باوجود جن میں ہندوستان اور روس کے لوگ زندگی بسر کر رہے تھے، تعلق کا امکان، ترقی کی خاطر تعلق‌باہمی کا امکان ان دنوں بھی پیدا ہو گیا تھا۔ یہاں میں تالستائی کی تصنیف ”ہندوستانی کے نام ایک خط،، کا ہی ذکر کروں‌گا جس کی گاندھی نے بڑی تعریف کی تھی۔ میں گاندھی اور تالستائی کے فلسفیانہ نظریات کے لب لباب اور اہمیت کا ذکر نہیں کررہا، میں صرف اس چیز کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جس نے ان دونوں کو فلسفے میں اور اپنی عملی سرگرمی میں بھی سرگرمی کے طریقے اور ذرائع تلاش کرنے کے لئے اکسایا تھا۔ استبداد کے خلاف احتجاج، خود اپنے اور غیر ممالک کے لوگوں کے دکھ درد اور رنج‌والم کو محسوس کرنے کی صلاحیت — اسی نے ان کی جستجو کو بڑھاوا دیا اور یہی دو عظیم‌الشان ہستیوں — ہندوستان کی

جرمن جمہوری ری پبلک میں میں وہ شہر اور گاؤں دیکھوں گا جو پھر سے جوان ہو گئے ہیں - میں مزدوروں اور کسانوں سے سلوں گا - یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ میں بوڑھے اور نوجوان ادیبوں سے ضرور ہی ملوں گا جن کی تخلیقات کا میں جس قدر ممکن ہے غور سے مطالعہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں - جرمن جمہوری ری پبلک کے شمالی اضلاع میں سے ایک میں ایک امدادباہمی کی انجمن نے میرا نام اختیار کرنے کی مجھے عزت بخشی ہے - امدادباہمی کی اس انجمن کے میمبروں سے میری باقاعدہ خط و کتابت ہوتی ہے، میں ان کے ہاں جانے اور یہ دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ ان کے کیا حال چال ہیں -

مجھے بڑا افسوس ہے کہ یوکرین میں شیوچینکو کے جشن کی تقریبات میں حصہ نہ لےسکوں گا - میں اپنے یوکرینی دوستوں سے التماس کرتا ہوں کہ وہ کامیابی کے لئے، صحت اور خوشیوں کے لئے میری بہترین خواہشات تسلیم کریں -

۱۹٦۴ء

عظمت روح

کرۂارض پر بسنےوالے لوگوں اور ان کی قومی تہذیبوں کے ارتقاء کی تاریخ میں سنگدل، المناک واقعات کے ساتھ ساتھ نیک مقاصد کےلئے لوگوں کے آپس میں متحد ہوجانے کی بعض بیش بہا شہادتیں، انسانی جذبے کے بےپایاں جوش و خروش کی شہادتیں بھی ملتی ہیں - قوموں کے مقسوم کے حقیقت‌افروز روزنامچوں اور ملکوں کی تاریخ کے بہترین صفحات ترقی کی، آزادی کی، بہتر مستقبل کی جدوجہد کےلئے وقف ہوتے ہیں -

ہر قوم کے معاملے میں یہ جدوجہد، مستقبل کی تشکیل اور قومی تہذیب کا ارتقاء نہایت ہی متنوع حالات میں ہوا اور ہورہا ہے - اس لئے نہایت قدرتی بات ہے کہ آج دنیا میں قومیں بہتر اور زیادہ نتیجہ خیز باہمی سفاہمت کی متلاشی ہیں -

ان قوتوں کی سازشوں اور دباؤ کے باوجود جو خود اپنے مطلب کےلئے قوموں میں نفاق پیدا کرنے کی آرزومند ہیں، ہماری تیزرفتار زندگی روزبروز زیادہ وضاحت کے ساتھ اس رجحان کو نمایاں کر رہی ہے جو تمام قوموں میں ان کی مختلف تاریخوں کے باوجود مشترک ہے اور جو ان کی نیک کوششوں کو متحد اور مستحکم کرنے میں مدد دیتا ہے -

اور وہ جدوجہد جو گاندھی نے ہندوستانی عورتوں کی نجات کےلئے کی تھی؟ عورتوں میں جو آبادی کے نصف حصے کی تشکیل کرتی ہیں انہیں نہایت مؤثر مضمر سماجی قوت نظر آئی ۔ انہوں نے ملک کی، قوم کی تمام قوتوں کو آزادی کی جدوجہد کےلئے صف‌آرا کرنے کی کوشش کی تا کہ سوراج کی وہ منزل جہاں تک پہنچنے کی سب کو آرزو تھی، حقیقت بن کر سامنے آجائے ۔

یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ جواہرلال نہرو نے گاندھی کو ''ہندوستان کے عزم جہاد آزادی کی علامت،، قرار دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ ''عوام کے نبض شناس ہیں،، ۔

گاندھی چاہتے تھے کہ ہر ہندوستانی گھر میں چرخہ چلنے کی آواز کا نغمہ گونجنے لگے ۔ ان کے اس رویے میں ہر ایک کو روزگار مہیا کرنے کی کوشش کے علاوہ ممکن ہے کہ ملک کی صنعتی ترقی کی اہمیت کو اصلیت سے کم آنکنے کی بات بھی موجود ہو ۔ لیکن پھر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ان کا عقیدہ تھا کہ اگر لوگوں کے پاس وہ کپڑا کافی ہوگا جو کروڑوں ہاتھوں نے بنا ہوگا تو مل کے کپڑے کے ''حملے،، سے اپنی حکومت مستحکم کرنے کی سامراجیوں کی کوشش کو وہ ناکارہ کر سکیں‌گے۔

اس طرح اپنے قریب قریب ہر فعل سے گاندھی نے واضح کیا کہ وہ نوآبادیاتی نظام کے سخت اور اپنے انداز میں، مستقل مزاج مخالف ہیں اور یہ کہ ان کو اپنے ملک سے جس کی آزادی اور خودمختاری ان کی زندگی کا نصب العین تھا، پرجوش محبت ہے ۔

جی ہاں، گاندھی نے ''پرامن انقلاب،، کی کوشش کی جو عدم‌تشدد کے طریقوں سے حاصل ہو ۔ ہم نے بھی اپنے ملک میں کم از کم نقصانات سے اور بغیر خانہ‌جنگی کے انقلاب کی تکمیل کی کوشش کی تھی ۔ ہمارے انقلاب کے ارتقاء کی غیر امن‌پسندانہ راہ ہمارے محنت‌کش عوام پر اندرونی انقلاب‌دشمنوں اور چودہ سامراجی طاقتوں کی مسلح مداخلت نے تھوپی تھی جن کا مقصد آزادی کو کچلنا اور ہمارے انقلاب کی مشعل کو بجھانا تھا ۔

وہ دو مختلف راستے تھے ۔ لیکن ان الگ راستوں کے باوجود عوام‌الناس کی طاقت میں گاندھی کے ایمان کو ہم سراہے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ بلاشبہ انقلاب ہمیشہ عوام‌الناس کے وسیع حلقوں کی ایک تحریک ہوتا ہے ۔ نہ ہی ہم اس حقیقت کو سراہے بغیر رہ سکتے ہیں کہ جدوجہد کی منطق

آزادی کے عظیم مجاہد اور عظیم روسی انسان‌دوست ادیب کو ایک دوسرے کے قریب لائی۔

مجھے یقین ہے کہ ہندوستانی قارئین مجھے غلط نہیں سمجھیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یہ نہ سوچیں گے کہ لیجئے یہ کمیونسٹ مصنف اپنا نقطۂنظر ہم پر تھوپ رہا ہے اور اپنے مقاصد کی خاطر واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہا ہے۔ میں کسی پر کچھ نہیں تھوپ رہا۔ میں صرف اپنے احساسات، اپنے خیالات میں آپ کو شریک کر رہا ہوں۔

اپنے زمانے کے فوری تقاضے کو محسوس کرتے ہوئے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں گاندھی کی شخصیت کے امتیازی وصف، نسلی امتیاز کو یعنی کسی قوم پر دوسری قوم کی فوقیت کے نسل پرستانہ تصورات کو تسلیم نہ کرنے یا نسلی اور نوآبادیاتی استبداد کو برداشت نہ کرنے جیسے ان کے نیک اوصاف پر سب سے زیادہ غور سے توجہ نہ دوں؟ گاندھی کا یہ بیان کہ وہ اس قسم کی حب‌الوطنی کو تسلیم نہیں کرتے جو دوسری قوموں کی مصیبت یا استحصال کے بدلے فروغ پاتی ہو، احترام اور گہری توجہ کا مستحق ہے۔

برسوں تک گاندھی اس دشمنی اور نااتفاقی کے خلاف جدوجہد کرتے رہے جو مختلف مذہبی عقائد کی پیدا کی ہوئی تھی۔ یہ جدوجہد بھی انہیں اصولوں کے مطابق کی گئی ہوگی جن پر ان کا اخلاقیاتی تصور اور عمومی اخلاقی قوانین کے بارے میں ان کے تصورات مبنی ہیں۔ لیکن عمل میں اس جدوجہد نے ایک نئے، زبردست، فوری طور پر زوردار، وطن‌دوستانہ اور سیاسی معنی اختیار کر لئے۔ اس نے نوآبادکار کی اس خواہش کی تکمیل کا راستہ روکا جو اپنے زمانہ‌قدیم کے پیشواؤں — دوسروں کو غلام بنانے والے قدیم اہل روما — کی نصیحت پر عمل کرنا چاہتے تھے جن کا اصول تھا: ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔''

ان کی زندگی کے خاص مقاصد میں سے ایک مقصد صدیوں پرانی ان کٹر روایات کو یکسر مٹانا تھا جنھوں نے ہندوستان کی زندگی کے اس خوفناک مظہر کو جنم دیا جسے خود گاندھی نے ''چھوت‌چھات کی لعنت'' قرار دیا تھا۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ''اچھوت'' ذاتیں آبادی کے قریب بیس فیصدی حصے پر مشتمل تھیں۔ اگر گاندھی اپنا مدنی کارنامہ انجام دینے میں کامیاب نہ ہوئے ہوتے تو سماج کا ایک بڑا حصہ نوآبادیاتی غلامی کے جوئے سے ہندوستان کی نجات کی قومی جدوجہد سے علیحدہ رہ گیا ہوتا۔ اور وہ نصب‌العین جسے گاندھی نے سوراج کہا تھا کبھی حاصل نہ ہوا ہوتا۔

دوسرا حصہ

ادیب

گاندھی کو اس نعرے تک لے آئی جو سامراجیوں کو کوڑے بنکر لگا:
''ہندوستان چھوڑ دو!''

لوگ کبھی نہیں بھولینگے کہ جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو گاندھی نے فاشزم کی مخالفت کا اور سوویت عوام سے گہری ہمدردی کا اظہار کیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹمی بمباری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی، جنھوں نے ایٹمی ہتھیاروں پر پابندی عائد کرنے، متنازع مسائل کا پرامن تصفیہ کرنے اور عام ترک اسلحہ کا نعرہ بلند کیا تھا۔

گاندھی کی زندگی ایک تلاش مسلسل تھی — سچائی کی، خود اپنے تصور کے اخلاقیات کی، سیاسی جدوجہد کے مخصوص طریقوں کی اور فلسفیانہ اصولوں کی تلاش۔ ان کی تلاش کی پیچیدگی اور تنوع سے ہندوستان کے تواریخی ارتقاء کی پیچیدگی کی عکاسی ہوتی ہے۔

ہندوستان کے عوام گاندھی کو ''مہاتما'' کہتے ہیں۔ یہ ایک خوبصورت لفظ ہے جس کے معنے ہیں ''روح عظیم''۔ عوام کے اس سپوت کی روح، میرے خیال سے، ان مظاہر میں ارفع ترین تھی جہاں وہ ہندوستان کے عوام کی جستجو — آزادی اور خودمختاری کے لئے ان کی وطن دوستانہ کوششوں کو اپنے میں جذب کرتی اور ان کی عکاسی کیا کرتی تھی۔

ایسی روح واقعی عظیم ہوتی ہے۔

۱۹۶۸ء

•

انگریزی قارئین سے

("اور ڈان بہتا رہا..." کے انگریزی
ایڈیشن کےلئے پیش لفظ)

مجھے خوشی ہے کہ میرے ناول "اور ڈان بہتا رہا..." کا انگریزی قارئین اور اخبارات نے پرجوش خیرمقدم کیا ہے۔ مجھے خاص طور پر اس لئے خوشی ہے کہ انگلستان ان عظیم ادیبوں کا وطن ہے جنہوں نے عالمی ادب کے خزانے میں بیش بہا اضافے کئے ہیں اور جن کی لافانی تخلیقات نے انگریزی قارئین میں ادب کا ایک مذاق پیدا کیا ہے۔

مجھے اس بات سے قدرے فکر لاحق ہے کہ انگلستان میں میرے ناول کو ایک "پردیسی" کہانی کی طرح دیکھا گیا ہے۔ ڈان کاسکوں کی زندگی کی تفصیلات کے بیان میں اگر انگریز قاری ان عظیم الشان تبدیلیوں کو دیکھنے کی کوشش کرے جو زندگی میں، روزمرہ کی سرگرمیوں میں اور انسانی نفسیات میں پہلی عالمگیر جنگ کے اور انقلاب کے نتیجے میں رونما ہو گئی ہیں، تو مجھے مسرت ہوگی۔

میں نے جو فریضہ اپنے ذمے لیا ہے وہ محض یہ نہیں ہے کہ پہلی عالمگیر جنگ اور انقلاب کے زمانے کی ان مختلف سماجی پرتوں کو واضح کروں جو وادیٔ ڈان کی آبادی میں موجود تھیں، نہ ہی محض یہ کہ ۱۹۱۴ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان کے واقعات کے زبردست بھنور میں آجانےوالے مردوں اور عورتوں کے المناک مقسوم کا خاکہ پیش کردوں بلکہ یہ بھی ہے کہ انہیں لوگوں کو سوویت عہد حکومت کے تحت پرامن تعمیر کے زمانے میں بھی پیش کروں۔ اپنی پچھلی کتاب "جب زمین جاگی" میں نے اسی فریضے کی تکمیل پر وقف کی ہے۔

آخر میں میں مندرجۂ ذیل بات کہوں گا: انگریزی اخبارات کے تبصروں میں حقیقت کی میری "بیرحمانہ" عکاسی کو جتایا گیا۔ بعض نقادوں نے تو عام طور پر "روسی رسم و رواج کی بیرحمی" تک کا ذکر کیا ہے۔

اول الذکر صورت کو تسلیم کرتے ہوئے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ جو ادیب سچائی پر پردہ ڈالنے کے لئے حقیقت کو بناتا سنوارتا ہے اور

میرا خیال ہے کہ ہماری کتابیں جس بڑھتی ہوئی تعداد میں شائع ہوتی ھیں — اور غیرملکی ادیبوں کو جنھوں نے اس کانگرس میں شرکت کی تھی، یہ اشاعت نہایت ھی حیرت انگیز معلوم ہوئی تھی — صرف وھی ہمارے قارئین کی تہذیبی ترقی کی واحد علامت نہیں ہونی چاھئے۔

قارئین ھم مصنفوں سے روزانہ تعلق میں رہتے ھیں اور ان کی تہذیبی ترقی کا کسی اور چیز کے علاوہ اس سے ھی سب سے زیادہ مؤثر طریقے سے ثبوت فراھم ہوتا ہے۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ خود اپنے تجربے سے مجھے اس کا علم ہے: ھر روز مجھے اپنے قارئین کے کم از کم دس خط ایسے ملتے ھیں جن میں وہ ''جب زمین جاگی،، اور اس کے کرداروں کے متعلق اپنی کسی نہ کسی رائے کا اظہار کرتے ھیں۔ ایک ایسے مصنف کی حیثیت سے جس نے اپنے پیشے پر عبور حاصل کر لیا ہے، میرے لئے ان میں سے کچھ خطوط منجھے ہوئے نقادوں کے مضمونوں سے زیادہ مددگار ثابت ہوتے ھیں۔

جب میں ''اور ڈان بہتا رہا...،، لکھ رہا تھا تو دھات ساز مزدوروں کی لینن گراد علاقائی یونین سے میرا قریبی تعلق قائم تھا اور ان کے تبصروں نے جو مجھے سینکڑوں کی تعداد میں موصول ہوتے تھے، مجھے اپنی وہ غلطیاں سمجھنے اور درست کرنے میں بڑی مدد دی تھی جو اپنی پہلی کتاب لکھتے وقت مجھ سے سرزد ہو رھی تھیں۔ میں نہایت غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سوویت یونین کے مزدور قارئین اور مصنفین کے درمیان تعلق اس بات کی مستحکم ضمانت ہے کہ ہمارا سوویت ادب بدستور دنیا کا سرکردہ ادب رھیگا۔

میں آپ کو صرف یہ بتانے تک اپنی تقریر کو محدود نہیں رکھنا چاھتا کہ مصنفوں کی کانگرس میں کیا ہوا کیونکہ میرا خیال ہے کہ آپ میں سے بہتوں نے — یقیناً اکثریت نے — اس کانگرس کی کارروائی کا بغور مطالعہ کیا ہوگا اور اس کی خاص رپورٹوں سے روشناس ہوں گے۔ میں جس چیز کے بارے میں آپ سے گفتگو کرنا چاھتا ہوں وہ ادب ہے، کیونکہ ادب عام پرولتاری نصب العین کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ لین زاووت اور روستوف ریلوے جنکشن میں بہت سے ایسے لوگ ھیں، میرا خیال ہے کہ کوئی چھہ سو، جو اخبارات میں باقاعدگی سے لکھتے رہتے ھیں۔ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ ان مزدور نامہ نگاروں میں سے جو اپنی تحریر سے بحیثیت مجموعی پوری صنعت کی اور خاص طور پر آپ کے کارخانے اور ریلوے کی مدد کررہے ھیں کہ کوتاھیوں کا خاتمہ ہوجائے، دسیوں ممتاز ادیب اور شاعر

اپنے قارئین کے جذبات مجروح نہ کرنے کےلئے چاہتا ہے کہ خود کو ان کے مطابق کرے، وہ خراب ادیب ہوتا ہے۔ میرا ناول محض ان کتابوں میں سے ایک نہیں ہے جن کا لوگ قیلولہ کرتے ہوئے مطالعہ کیا کرتے ہیں اور جن کا واحد مقصد هاضمے میں مدد کرنا ہوتا ہے۔

جہاں تک روسی رسم و رواج کا تعلق ہے، تو مجھے شک ہے کہ وہ دوسری قوموں کے رواجوں سے زیادہ بیرحمانہ ہیں۔ اور کیا وہ تہذیب یافتہ قومیں زیادہ بیرحم اور انسانیت‌سوز نہیں تھیں جنہوں نے ۱۹۱۸ء — ۱۹۲۰ء میں میری مبتلائے الم مادروطن کے خلاف اپنی فوجیں جھونکدی تھیں اور روسی قوم پر اپنی مرضی بزور شمشیر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی۔

۱۹۳۴ء

عام پرولتاری نصب‌العین کا ادب ایک حصہ ہے

(لینن‌نامی فیکٹری اور روستوف برساحل ڈان کے ریلوے جنکشن کے بہترین کارگزار مزدوروں کے جلسے میں ایک تقریر سے اقتباس)

سب سے پہلے تو ساتھیو میں سوویت مصنفوں کی انجمن کی جانب سے لینن‌نامی فیکٹری اور روستوف ریلوے جنکشن کے پرولتاریوں کو جنہوں نے روس کی نجات کے لئے انقلابی جدوجہد کی تاریخ میں انتہائی شاندار صفحات کا اضافہ کیا ہے، دلی پیغام تہنیت پیش کرنے کی آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

آج، لین‌زاووت کے پرانے مزدوروں سے اس ملاقات کے دوران مجھے کامریڈ لینن کے وہ خیالات یاد آئے جن کا انہوں نے ایک بار اپنی خواهش کی صورت میں اظہار کیا تھا کہ ”ادب کو عام پرولتاری نصب‌العین کا حصہ بن جانا چاہئے۔“ یہ خواهش اب پوری ہورہی ہے۔ اور اس کی سب سے نمایاں مثال وہ نہایت گہری توجہ ہے جس کا مزدور طبقہ زبان پر اس ادبی مباحثے کے سلسلے میں اظہار کررہا ہے جو گورکی کے مضمون پر شروع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے زمانے اور ہمارے عہد میں ادب کا عام پرولتاری نصب‌العین کا ایک جزو بن جانے کی اور بھی زیادہ قائل کن توثیق اس زبردست دلچسپی سے فراہم ہوتی ہے جو مزدور طبقے اور پوری سوویت آبادی نے مصنفوں کی کل یونینی کانگرس کی کارروائی میں لی جو ایک مہینہ قبل منعقد ہوئی تھی۔

سے خارج کر دیا جاتا ہے اور اس سے بری بات یہ کہ ان کو قیدخانوں میں ڈال دیا جاتا ہے اور ان کی زندگی تختہ‌دار پر ختم ہوتی ہے۔

یہ حدبندی جو اس کانگرس میں نمایاں طور پر واضح ہوئی، دو دنیاؤں کو دکھاتی ہے جو فن کے میدان‌عمل میں بھی ایک دوسرے کے سامنے صف‌آرا ہیں۔ اور آج بھی یہ بات قطعی واضح ہے کہ ہمارا سوویت فن دنیا میں ہر جگہ جیت رہا ہے۔ یہ بات مغربی یورپی ادیبوں نے کانگرس میں اپنی تقریروں میں واضح کر دی اور خاص طور پر جرمن کمیونسٹ ادیب فرانز وائزکوپف نے۔ انہوں نے بتایا کہ سوویت ادیبوں کی تخلیقات سے ہی جرمن پرولتاریہ کو جو فاشست اقتدار کے تحت مصیبتیں جھیل رہا ہے، طبقاتی جدوجہد کے معنے معلوم ہوتے ہیں اور اس بات کا علم ہوتا ہے کہ عالمی انقلاب کی اور کرۂارض پر ہر جگہ کمیونزم کے نیک تصورات کی فتح کے لئے دشمنوں کے خلاف کیسے لڑا جائے۔ وائزکوپف نے یہ بھی بتایا کہ جرمن قارئین کو سوویت ادیبوں کی کسانوں کے موضوع پر تصنیفات سے پتہ چلتا ہے کہ ہماری پارٹی نے، ہمارے مزدور طبقے نے اور کسان طبقے کے ترقی‌پسند حلقے نے چھوٹے پیمانے کی نجی کاشتکاری کی جگہ جس میں کتا کتے کو کھائے کی ذہنیت کارفرما ہوتی ہے بڑے پیمانے کی اجتماعی کاشتکاری جاری کرنے کےلئے، کیسی جدوجہد کی تھی۔

اس پہلے جلسے میں، جو میں توقع کرتا ہوں آخری نہ ہوگا، بہتر ہوگا کہ ہم قاری اور مصنف کے درمیان تعلقات قائم کر لیں اور بعض ایسے مسئلے سمجھنے میں ایک دوسرے کی مدد کریں جو آج تک حل نہیں ہوئے ہیں۔

ادبی زبان پر مباحثے نے، جو پانفیروف کی تصنیف ''بروسکی،، سے شروع ہوا تھا، ہماری کمزوریوں کو دکھایا اور واضح کیا کہ مسائل حاضرہ کے متعلق موضوع کی جستجو میں اور اپنی کتابوں میں اپنے حیرت‌انگیز دور کی عکاسی کرنے کی خواہش میں ہم خوبی کو اکثر فراموش کر دیتے اور گھٹیا تخلیقات کرنے لگتے ہیں۔ گورکی نے بالکل صحیح کہا تھا: اگر کسی کارخانے میں کام کرنےوالا مزدور کام خراب کرتا ہے اور مال خراب نکلنے لگ جاتا ہے تو اس کو مجرم تصور کیا جاتا ہے، اخباروں میں اس کو نادم کیا جاتا ہے اور رائے عامہ اسکی مذمت کرتی ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ ایسے ادیب کی صورت میں جو گھٹیا تخلیق تیار کرے ہم محض ہلکی سی تنقیدی سرزنش تک ہی محدود رہیں جو ادیبوں کو بہرحال زیادہ متاثر نہیں کرتی؟ ہم اس ادیب کے معاملے میں زیادہ سخت اقدامات

ابھر کر آئیں گے جو ہمارے ہمسر ہوجائیں گے اور پھر آگے بڑھ کر ہمیں پیچھے چھوڑ جائیں گے۔

اس کانگرس کے شروع ہونے سے پہلے زبان پر جو مباحثہ شروع ہو گیا تھا اس سے پتہ چلا کہ مزدور قارئین نے ۲۷ — ۱۹۲۶ء کی به نسبت یعنی دس برس سے بھی کم عرصہ قبل کی به نسبت، لمبے لمبے ڈگ بھرے ہیں، اندازبیان کے بارے میں زیادہ دھیان دینے لگے ہیں اور ان میں مطالعے کا ایک ایسا مذاق پیدا ہو گیا ہے کہ ہم مصنف اکثر ان کی ضرورتیں پوری کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہاں میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے: اس امر کے پیش نظر کہ مزدور طبقے کی تہذیبی سطح بےپناہ بلند ہوگئی ہے اور اس امر کے پیش نظر کہ ہمارے نام خطوں میں، ان تنقیدی مضامین میں جو وہ رسالوں میں بھیجتے ہیں اور جلسوں میں اپنی تقریروں میں مزدور اہم‌ترین مسئله اعلی قسم کی کتابوں کو قرار دیتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ادبی مباحثے، مجرد قسم کے نہیں، بلکه ان کتابوں پر مباحثے جو فی‌الحال سوویت ادب کی بہترین تخلیقات تصور کی جاتی ہیں، انتہائی کارآمد ہوں گے، خصوصاً بعض مصنفوں اور قارئین، آپ کے لئے۔

سوویت مصنفوں کی کل‌یونینی کانگرس نے جس پر سوویت اور عالمی مزدور طبقے نے غیرمعمولی توجه مرکوز کی تھی، ہماری کارگذاریوں کا اب تک کا نتیجه اخذ کرکے پیش کیا تھا۔ یہاں یه بتانا ضروری ہے کہ عالمی ادب کو تقسیم کرنےوالی حدیں نہایت نمایاں طور پر واضح ہو گئیں۔ ایک ثبوت ہمارے سوویت ادب کے مسلسل اور بتدریج فروغ اور بورژوا ادب کے زوال سے ملتا ہے جس کا مغربی یورپ کے ملکوں سے آئے ہوئے ڈیلی گیٹوں نے ایک زبان ہوکر ذکر کیا تھا۔ مغرب میں فنون کے زوال کی مثالیں میں پیش کرنا نہیں چاہوں گا کیونکه اس کی تمام مثالیں ہمارے روزناموں میں آپ کو مل‌سکتی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ فاشسٹ ملکوں میں کتابیں جلائی جاتی ہیں اور یه کہ ہزاروں کتابیں جن میں سوویت مصنفوں کی وہ تمام کتابیں بھی جن کا ترجمه ہو چکا ہے شامل ہیں، آسٹریائی حکومت کے نئے قانون کے تحت نذر آتش کی جاتی ہیں۔ چینی مصنفه نے کانگرس میں جو کچھ کہا ہے اس سے آپ کو معلوم ہے کہ جو چینی انقلابی ادیب مزدور اور کسان عوام الناس سے ان لوگوں کے خلاف جدوجہد کرنے کی اپیل کرتے ہیں جنھوں نے ان کے وسیع و بسیط قدیم متمدن ملک کو غلام بنایا ہوا ہے، بطور سزا ان کی کتابوں کو لائبریریوں

ایک اچھی کہاوت ہے جسے لوگوں کو واقعی ذہن میں رکھنا چاہئے: حسین ترین لڑکی جیسی ہے اس سے زیادہ خوبصورت تو نہیں ہوسکتی۔ ایک اور کہاوت ہے: منہ سے سیٹی بجانا اور گھونٹ بھرنا بیک‌وقت کوئی نہیں کرسکتا۔ پھر بھی ادیبوں سے لوگ اکثر غیرمعقول مطالبے کرتے رہتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ غالباً دنیا میں ایک بھی ادیب ایسا نہیں ہوگا جو ہمارے ملک میں ہر روز، ہر گھنٹے رونما ہونے‌والے تمام واقعات، تمام تغیرات اور تمام حادثات کا احاطہ کر سکے اور ان کے تمام متنوع پہلو اجاگر کر سکے۔ آج جس فیکٹری کا حال آپ نے بیان کیا ہے وہ ایک سال بعد اتنی تبدیل ہو چکی ہوگی کہ پہچان میں نہیں آئےگی اور لکھنے‌والا ہر شخص اپنے آپ کو اسی مصیبت میں گرفتار پائیگا جس میں آنسینشتیئن نے اپنے آپ کو وہ فلم بناتے ہوئے مبتلا پایا تھا جس کا عنوان ہونا تھا ''عام لائحہ عمل''۔ انہوں نے یہ فلم ۲۹ — ۱۹۲۸ء میں بنانی شروع کی تھی جب پارٹی کی پوری کوشش یہ تھی کہ کسانوں کی چھوٹی چھوٹی کھیتیوں کو ملا کر چھوٹے اجتماعی فارم منظم کئے جائیں۔ اس کام کےلئے پیسہ خرچ کیا گیا، قرضے منظور کئے گئے اور زمین کو مشترکہ طور پر کاشت کرنے‌والی زراعتی انجمنیں قائم کی گئیں جو اس وقت الگ الگ مثال کی حیثیت سے نمودار ہوتی ہیں۔ اس زمانے کا ''عام لائحہ عمل'' یہی تھا۔ ۱۹۳۰ء میں جب آئسینشتیئن ابھی اپنی فلم کی شوٹنگ میں مصروف ہی تھے کہ بڑے پیمانے کی اجتماعیت کا آغاز ہو گیا۔ یہ فلم وقت کے تقاضوں سے پیچھے رہ گئی اور اب اس کے کوئی معنے ہی نہیں رہ گئے تھے۔

یہی کیفیت ہم ادیبوں کی ہوتی ہے۔ میں نے اپنا ناول ''جب زمین جاگی'' ۱۹۳۰ء میں لکھنا شروع کیا، ان واقعات کے فوراً بعد جنہوں نے دیہی دنیا کی کایاپلٹ دی تھی: ایک طبقے کی حیثیت سے کولکوں کا صفایا، بڑے پیمانے کی اجتماعیت اور بڑے پیمانے کے اجتماعی فارموں میں متحد ہونے کےلئے کسانوں کی عام تحریک۔

یہ تاثرات ابھی یادداشت میں تازہ تھے کہ میں اپنا ناول لکھنے بیٹھ گیا۔ پہلا حصہ لکھ لینے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں جو کچھ بتا رہا ہوں وہ اب بنیادی مسئلہ نہیں رہ گیا ہے۔ اب میرے قارئین کے ذہن میں دوسرے مسئلوں کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے، خصوصاً اجتماعی کاشتکار قارئین کے ذہن میں جن کے متعلق میں یہ سب کچھ لکھ رہا ہوں۔ واقعات سے ہمقدم رہنے کی کوشش ہی ہمارے فرض کو مشکل کر دیتی ہے۔

کیوں نہیں کرتے جو اپنے کام میں زیادہ محنت نہیں کرتا حالاں کہ کرسکتا ھے؟

اور یہ سخت اقدامات کیا ھیں؟

سب سے پہلے آپ کی کھری رائے جو ادیب کو مجبور کرےگی کہ وہ ہزار بار ایک ھی مسئلے پر نظر ثانی کرے، فقرے کے ہر پیچ پر غور کرے، اپنے افسانے یا ناول کے پیغام اور اسکی ترتیب و تشکیل پر اچھی طرح سوچ بچار کرے، کوشش کرکے اپنی کتاب میں اس قدر جوش و خروش پیدا کرے جو عوام کو جدوجہد کے لئے ابھارے، اور ان میں شجاعت، شان اور جرأت کے کارنامے انجام دینے کا ولولہ پیدا کرے۔ مجھے یقین ھے کہ یہاں آپ کی آواز، مزدور قارئین کی آواز، فیصلہ کن ہوگی۔

اب جو ھم ادب کے متعلق باتیں کر رھے ھیں تو ایک چیز اور میں آپ سے کہنا چاھتا ھوں۔ ابھی کچھ عرصے سے قارئین میں ایک عجیب رویہ پیدا ھوگیا ھے جو بنیادی طور پر غلط ھے اور ادیبوں میں ذھنی الجھن پیدا کر دیتا ھے۔ فرض کیجئے کہ آپ مثلاً ایلین کوف کا ناول ''خاص محور،، پڑھ رھے ھیں۔ یہ ناول برا نہیں۔ اس میں ریلوے انجن بنانےوالے ایک کارخانے کے بڑے عملے کی زندگی دکھائی گئی ھے۔ یہ صحیح ھے کہ اس ناول میں کچھ خامیاں ھیں جو گورکی نے مصنف کو بتائی تھیں۔ جب یہ شائع ھوا تو ادبی حلقوں میں اس پر گرما گرم بحثیں ھوئیں لیکن مجھے کہنا پڑتا ھے کہ بحیثیت مجموعی سوویت قارئین نے ابھی تک اسے مناسب طریقے سے جانچا نہیں۔ تو گویا یہ ناول آپ کے زیر مطالعہ ھے، اور آپ کہتے ھیں: ''کتنی اچھی بات ھے کہ ایک ادیب تو ایسا نکلا جس نے ھمارے ریلوے انجن بنانے کے کارخانے کے مزدوروں کے بارے میں کچھ لکھنا تو مناسب سمجھا! اس نے پارٹی سیل کا، ایک پرانے مزدور کی خانگی زندگی اور کارخانے کی زندگی کی تفصیلات بیان کی ھیں، مگر اس نے شہر اور دیہات کے تعلقات کے بارے میں کچھ کیوں نہیں کہا؟،، بہت سے قارئین اور نقاد کا رجحان یہ ھے کہ وہ شائع ھونےوالی ہر کتاب سے ایک ھی قسم کی امیدیں وابستہ کریں۔ اگر کہانی کسی اجتماعی فارم کی ھے تو وہ کہیں گے: ''مصنف نے پارٹی سیل، کومسومول اور پارٹی کی سرگرمیوں اور عورتوں کی بڑھتی ھوئی سماجی ساکھ کی ایک سچی تصویر پیش کی ھے مگر اس نے امداد باھمی کو کیسے نظر انداز کردیا اور اس کے بارے میں کیوں ایک لفظ بھی نہیں لکھا؟،،

کر سکتے ھیں، ھم اپنی کتابوں کے تاثر میں کیسے اضافه کر سکتے ھیں که وہ صرف ھمارے ملک ھی میں نہیں بلکه غیرممالک میں بھی قارئین کو خطرے سے آگاھی دیں، که وہ سوویت قارئین کو مزید کوششیں کرنے کا جوش دلائیں اور مغربی یورپ کے پرولتاریوں کو اور نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی ملکوں کے مظلوم لوگوں کو مدد دیں که وہ سرمایهداری کی غلامی کے جوئے سے اپنے آپ کو آزاد کرلیں۔

یه نئے فرائض ایک اور مسئله پیدا کر دیتے ھیں: مزدور طبقے کا ایک نوجوان ادیب ھم میں سے ابھرتا ھے اور ھم اس سے کہتے ھیں که کلاسیکی ادب کا مطالعه کرے اور سیکھے لیکن طرز تحریر وہ ھم سے بھی مستعار لیگا۔ اور یہاں، نئی اور بہتر کتابوں کا ذکر کرتے ھوئے اور خاص طور سے ابھرتے ھوئے نئے ادیبوں کے تعلق سے میں یه کہنا چاھتا ھوں: ھم سب کے، نئے اور تجربےکار ادیبوں کے سامنے پہلا مطالبه یہی ھے که اپنے مواد کا اچھی طرح، پوری طرح مطالعه کریں۔

یه افضل‌ترین اھمیت کا نکته ھے اور میرے خیال سے اس جلسے میں ھمیں اپنی توجه اس پر مرکوز کرنی چاھئے کیونکه آپ، ھمارے مزدور قارئین، ادیبوں کو حقائق کے متعلق غلطیوں سے بچنے میں بڑی مدد دے سکتے ھیں۔

پچھلے دنوں میں نے ایک افسانه پڑھا جو ایک صنعتی مزدور کا لکھا ھوا ھے۔ اور اس میں انہوں نے لکھا ھے که روئی کے پیلے پیلے گالے جیسے بطخ کے چوزے وسط اگست میں پانی میں تیرتے پھر رھے تھے اور اجتماعی کاشتکاروں کو اناج کی شکل میں اجرت اناج بچھوڑنے کا آغاز ھونے سے پہلے ھی مل گئی۔ جس شخص نے یه لکھا ھے اس کو نہیں معلوم که حساب میں اجرت کی ادائیگی اس وقت تک شروع نہیں ھوتی جب تک که رئی، جو سب سے پہلے تیار ھونےوالا اناج ھے، بچھوڑ نه لی گئی ھو اور یه که بطخ کے پیلے چوزے اگست میں تیرتے نہیں پھرتے۔ کوئی اجتماعی کاشتکار اس قسم کی کہانیوں کو پڑھ کر تو یہی سوچیگا: ”واہ، کیسے کیسے لکھنےوالے ھیں! ان کا اعتبار ھی نہیں کیا جا سکتا۔“

ھم جو کتابیں پڑھ چکے ھیں ان کو یاد کریں تو یہاں سب کو ایسی مثالیں یاد آئیں‌گی جہاں کسی ادیب نے پیداوار کے اور مزدوروں کی دنیا کے بارے میں لکھا ھے جس کے بارے میں اس کو سطحی معلومات تو حاصل تھیں مگر تفصیلی معلومات اور باریکیوں کا علم حاصل کرنے کی اس نے تکلیف ھی گوارا نہیں کی تھی۔ اگر مصنف سب سے پہلے اپنے مواد کا

اور اب چند الفاظ ادبی تخلیق کی خوبی کے بارے میں ـ کانگرس کے بعد ہم میں سے ہر ایک کو فوری ضرورت کا یہ مسئلہ درپیش تھا: بہتر کتابیں کیسے لکھی جائیں؟ کانگرس میں ادیبوں کے علاوہ ان لوگوں نے بھی شرکت کی تھی جو عام قارئین کے نمائندے، یعنی اجتماعی کاشتکار، صنعتی مزدور اور لال فوج کے لوگ تھے ـ ایک کے بعد ایک وہ منبر پر آئے اور اپنے اپنے مطالبے پیش کئے، اور کل میزان اتنا ہوگیا کہ سچ پوچھئے تو عنقریب مستقبل میں ہم حساب بےباق نہ کر پائیں‌گے ـ انہوں نے کہا کہ ہم اچھا کام نہیں کر رہے، زبان کے بارے میں ہم زیادہ دقت اٹھانے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے اور یہ کہ مبتدیوں کو جن کی تعداد بہت زیادہ ھے، ہماری کتابوں سے سیکھنے کو اگر کچھ ملتا ھے تو وہ بہت ہی تھوڑا ھے ـ اور یہ حقیقت ھے کہ نوجوان ادیب ہر فیکٹری سے، ہر اجتماعی فارم سے ابھر کر آتے ہیں اور ہماری آرزو یہ ھے کہ وہ اپنے فن کے ماہر بن جائیں کیونکہ یہی وہ لوگ ہیں جو ہماری مدد اور سہارے سے ہماری جگہ لیں‌گے ـ ان کی نشو و نما اور ترقی کی ذمہ‌داری بڑی حد تک ہم پر آتی ھے ـ اور ہم کیا کرتے ہیں؟ ہم نہ صرف یہ کہ ایسی گھٹیا کتابیں تخلیق کرتے ہیں جن میں ادبی خوبیوں کا فقدان ہوتا ھے اور اس طرح نوجوان ادیبوں کی ترقی کی رفتار سست کر دیتے ہیں بلکہ درحقیقت ہم اپنی نئی پود کی تعلیم پر مضر اثر ڈالتے ہیں ـ

قارئین کو بجا طور پر اعتراض ھے کہ ادیب گالیوں کا ضرورت سے زیادہ استعمال کرتے ہیں، جو ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ھے کہ اب مزدوروں میں زیادہ مروج نہیں رہ گئی ہیں اور جو درحقیقت ماضی کی شرمناک باقیات میں سے ہیں ـ اکثر و بیشتر ہم ادیبوں کا (جن میں خود میں بھی شامل ہوں) خیال تھا گالیوں سے مکالمہ اصلیت سے زیادہ قریب ہو جاتا ھے اور یہ بھول جاتے تھے کہ ہماری کتابوں کا مطالعہ صرف بالغ ہی نہیں کرتے جو اس اوچھے پن کو مسکرا کر ٹال جائیں‌گے، بلکہ تیرہ چودہ برس کے لڑکے لڑکیاں بھی کرتے ہیں جو اس دومعنی گفتگو اور گالیوں کو جو کتاب میں ملتی ہیں اپنی زبان پر بھی چڑھا لیتے ہیں ـ پھر یہ گالیاں نوجوانوں کی زندگی میں، اسکول اور خاندان میں گھس جاتی ہیں ـ میرا خیال ھے کہ ہر ادیب کو اس مسئلے پر غور کرنا چاہیئے ـ

ہم سب کو سنجیدگی سے اس مسئلے پر بار بار غور کرنا چاہئے کہ ہم مزدور طبقے کی اور اپنی پارٹی کی بہترین خدمت کیسے انجام دے سکتے ہیں اور وہ کونسے ذرائع ہیں جن سے ہم اپنے عظیم دور کی تصویر پیش

سوویت ادیب کے بارے میں

ہسپانوی وفد کے ایک رکن کپتان اینجل اینتم نے دریافت کیا کہ سوویت ادیبوں کو ان کے کام کا معاوضہ کس حساب سے دیا جاتا ہے۔

مغربی یورپ کے دوروں پر جب بھی میں گیا مجھے بار بار اس سوال کا جواب دینا پڑا۔ اور ہر بار میں نے اس گہرے بنیادی فرق کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا جو سوویت اور بورژوا ادیبوں کے درمیان ہے۔ ضمیر فروش ادیبوں کی ناز برداریاں کرکے سرمایہ‌داری ایماندار ادیبوں کو بھی بگاڑ دیتی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ میری مراد ان فاشست دشمن ادیبوں سے نہیں ہے جنھوں نے اپنا مقدر جمہوریت اور ترقی کی جدوجہد سے وابستہ کر لیا ہے۔

بورژوا ادیب کے گرد و پیش کے حالات اس میں انفرادیت کے رجحانات پیدا کرتے اور ادبی تخلیق کی سماجی اہمیت کو پس منظر میں دھکیل دیتے ہیں۔ اور اس اعتبار سے وہ سوویت ادیب کے برعکس ہوتا ہے۔

سوویت وسیلۂ‌تقویت سے الگ تھلگ کرکے سوویت ادیب کا نقش ذہن میں مرتب نہیں کیا جا سکتا۔ انقلاب سے پہلے کے ہمارے بعض مصنفوں کی آرزوئیں اب ہم کو نہایت سادہ لوحی کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ بحیرۂ‌اسود کے ساحل پر ذاتی مکان ہو، اپنی بڑھیا موٹرکار ہو... واقعی ہمارے خوابوں اور ہمارے مقاصد میں اور اس میں کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔

سوویت ادیب اور سوویت عوام کے درمیان تعلقات کا خاکہ میری اپنی زندگی کے حالات سے مرتب کیا جا سکتا ہے۔

میں بالائی ڈان کے ایک گاؤں ویشنسکایا کا باشندہ سوویت حکومت کی فتح کے لئے خانہ‌جنگی میں لڑا۔ سوویت حکومت اور بالشویک پارٹی نے مجھے جنم دیا، پروان چڑھایا۔ میں سوویت جنتا کا سپوت ہوں۔ اور سوویت حکومت نے جس طرح میری دیکھ بھال کی اس کو اپنے بیٹے کےلئے ماں کی مامتا سے ہی تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔

کپتان اینتم یہ بھی جاننا چاہتے تھے کہ سوویت ادیبوں کی انجمن پین کلب کی میمبر کیوں نہیں ہے۔ جواب سادہ ہے۔ پین کلب کے میمبروں میں فاشست بھی ہیں۔ اور ہم، سوویت ادیب، ایک ایسی ادبی تنظیم میں شامل نہیں ہو سکتے جس میں فاشست آرام سے رہ سکتے ہوں۔

میں اس سلسلے میں فاشزم اور رجعت‌پسندی کے خلاف ہسپانوی

مکمل مطالعہ نہیں کرتا تو اس کی تصنیف حقیقی ادب پارہ نہیں ہوگی۔

آپ کے ہاں کارخانے میں ایک ادبی گروہ ہے اور خوبی معائنہ کرنےوالے انسپکٹروں کے علمی ادارے ہیں جہاں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے مخصوص ہنر میں کمال حاصل کرچکے ہوتے ہین اور جن کو اپنے اوزاروں پر قدرت حاصل ہوتی ہے۔ کسی چیز کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے آپ کے نوجوان ادیبوں کو ان تجربےکار اور نسبتاً معمر لوگوں سے مدد حاصل کرنی چاھئے جو ظاہر ہے کہ شائع ہونےوالی کتابوں کی خوبیوں اور خامیوں کا بھی جائزہ ضرور لیتے ہوں‌گے۔ اپنی جانب سے ہم، مصنف، تجربےکار مزدور سے اپیل کرتے ہیں: برائے مہربانی ہم پر عنایت کیجئے اور اپنے نوجوان مصنفوں کی مدد کیجئے اور ہم بھی اپنی طرف سے ضرور مدد کریں‌گے۔

مجھے یقین‌کامل ہے کہ مزدور قارئین اور سوویت ادیبوں کے درمیان جو تعلق قائم ہوا ہے اس کو ضرور تقویت حاصل ہوگی اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اگر یہ تعلق قائم رہا تو سوویت ادب اور بھی اچھی سے اچھی تصنیفات پیش کر سکیگا۔

۱۹۳۴ء

کروڑوں کےلئے وہ شجاعت کی ایک مثال رہیں‌گے

سوویت ادیبوں کی صفوں میں سے سب سے زیادہ شجاع اور سب سے زیادہ پرعزم مجاھد کو موت نے جھپٹ لیا۔ بیماری اگرچہ ان کو جسمانی اعتبار سے شکست دے چکی تھی اور ان کو بےحد تکلیف برداشت کرنی پڑرھی تھی، لیکن پھر بھی وہ پارٹی کے اعلی مقاصد کی فتح کےلئے کمیونسٹ ادیب کے ھتھیار سے آخر دم تک لڑتے رہے۔ کروڑوں لوگ اوستروفسکی کی مثال سے سیکھیں‌گے کہ کس طرح زندگی بسر کی جائے، کس طرح جدوجہد کی جائے، کس طرح فتح حاصل کی جائے اور کس طرح مادروطن سے محبت کی جائے۔

ھمیں اپنے ملک، اپنی پارٹی اور لیننی کومسومول پر فخر ہے کہ اس نے ایسے حیرت انگیز شخص کو پروان چڑھایا۔ انہیں محبت، احسانمندی اور قدر و منزلت کے ساتھ یاد کیا جایا کریگا۔

ھمیں نقصان عظیم اٹھانا پڑا ہے۔

۲۳ دسمبر ۱۹۳۶ء

کہ مزدور طبقے کے نصب العین سے غداری کرنےوالے تمام لوگوں کو ہم نے بلارو رعایت کچل دیا اور جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔

سوویت یونین میں اپنے قیام کے دوران میں ہسپانوی عوام کا وفد ملک کے خواہ کسی کونے میں بھی کیوں نہ جائے آپ کے بہادر ساتھیوں کو ہر جگہ ہسپانیہ کے واقعات سے گہری دلچسپی اور جمہوریہ کے مجاہدوں سے حقیقی، پرجوش ہمدردی نظر آئےگی۔ میں ویشنسکایا میں رہتا ہوں اور کاسک مرد اور عورتوں کو اپنے سیدھے سادے پرخلوص انداز میں کہتے سنتا ہوں کہ اپنی خودمختاری کےلئے ہسپانوی عوام کی نیک جدوجہد انہیں دل سے عزیز ہے۔

فاشستوں، عصر حاضرہ کے آدم‌خوروں سے ہمارے عوام بےحد نفرت کرتے ہیں۔

ہمارے عوام کو اپنے ان بھائیوں کی شفقت‌آمیز فکر لگی رہتی ہے جو ہتھیار اٹھا کر فاشست رجعت‌پسندی کے خلاف محاذ جنگ پر لڑ رہے ہیں۔ ساتھیو، ہمیں تمہاری فتح پر گہرا یقین ہے! ہمارے دل اور ہماری ہمدردیاں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں!

۱۹۳۷ء

عوام کا ترجمان

سلیمان استالسکی صحیح معنوں میں عوامی شاعروں کے اس زمرے میں سے تھے جنہیں عوام نے پروان چڑھایا لیکن جنہیں سوویت حکومت کے قائم ہوجانے کے بعد ہی شرف قبولیت حاصل ہوا۔ ان کے ہموطنوں کے خیالات، ان کی خوشیوں اور ان کے غموں کو استالسکی کے گیتوں کی شکل میں نغمگی اور مسحورکن تازگی حاصل ہوئی۔ شاعر کی مہارت اور چابکدستی سے مالامال ہوکر وہ پھر عوام میں واپس پہنچ گئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان میں اپنا مقام بنا لیا۔ مگر استالسکی کی شاعری کی مقبولیت ان کے کوھستانی وطن ھی تک محدود نہیں رہی۔ ان کے اشعار، جن کا حسن ترجمے میں یقیناً کسی نہ کسی حد تک ضرور ماند پڑ گیا ہوگا، جب ہم پڑھا کرتے تو کون تھا جو ان کی حیرت انگیز خوبصورتی اور قادرکلامی پر محوحیرت نہ رہ جاتا تھا؟ یہی وجہ ہے کہ ان کی وفات کی خبر اس قدر کربناک ہے۔

عوام کی بہادرانہ جدوجہد کے بارے میں سوویت عوام کے رویے کے متعلق چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔

مجھے یاد ہے کہ دارالعوام میں کسی میمبر نے عدم‌مداخلتی کمیٹی کے بدنام کن رویے کا ذکر کرتے ہوئے افسوس کے ساتھ کہا تھا کہ اس کمیٹی کی سرگرمی پر اس کو مایوسی ہوئی ہے۔

''مایوسی ہونا،، ایک ایسا فعل ہے جو ہمارے کانوں کو عجیب معلوم ہوتا ہے اور موجودہ سیاق و سباق میں ہمارے ہاں قطعی غیرمستعمل ہے۔

لندن کی کمیٹی کی پالیسی پر ہمیں غم‌وغصہ ہے۔ اس کمیٹی نے عدم‌مداخلت کو درحقیقت جمہوریائی ہسپانیہ کی ناکہ‌بندی کرنے کی آڑ بنا لیا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ''انسان دوستانہ،، قراردادوں کے پردے میں مداخلت‌پسندوں کو بےحساب سراعات دی جارہی ہیں تو ہمارے دلوں میں غم و غصے کا ایک طوفان امنڈنے لگتا ہے۔

جمہوریائی ہسپانیہ کی بہادرانہ جدوجہد کو ہم نہایت توجہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اور ہم ایسے واقعات سے سخت بےچین ہو جاتے ہیں جیسا کہ پچھلے دنوں کاتالونیا میں ہوا جہاں تروتسکیائی * فاشست عناصر نے بعض نراجی گروہوں کو کارروائیاں کرنے پر اکسا کر جمہوریائی محاذ کے عقب میں غدر کرانے کی کوشش کی جس کا مقصد عوامی محاذ کی جڑیں اکھاڑنا تھا۔

یہاں خود ہمارے انقلاب کے دنوں کی یاد تازہ ہوئے بغیر نہیں رہتی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ سوویت حکومت نے محنت کشوں کے دشمنوں کے خلاف غیرمصالحانہ جدوجہد کی اور ہماری جیت اس لئے ہوئی

---

* تروتسکی (برونشٹیئن) ل۔ د۔ (۱۸۷۹ء — ۱۹۴۰ء) ۱۹۱۷ء میں بالشویک پارٹی میں لیا گیا۔ ۱۹۲۳ء سے تروتسکی نے پارٹی کی جنرل لائن کے خلاف سخت گروہ‌بند جدوجہد کی۔ لینن‌ازم کا سخت دشمن ہو گیا۔ ۱۹۲۷ء میں اسے پارٹی سے نکال دیا گیا۔ ۱۹۲۹ء میں سوویت دشمن سرگرمیوں کے لئے اس کو جلاوطن کردیا گیا اور ۱۹۳۲ء میں سوویت شہریت کے حقوق سے محروم کر دیا گیا۔ بیرون ملک میں اس‌نے سوویت ریاست، کمیونسٹ پارٹی اور بین‌الاقوامی کمیونسٹ تحریک کے خلاف جدوجہد جاری رکھی۔ (ایڈیٹر)

پانچ برس ہوئے پارٹی، حکومت اور سوویت عوامی تنظیموں نے سیرافیمووچ کی سترویں سالگرہ منائی تھی۔ سیرافیمووچ نے ہم سب کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کرنا چاہا کہ جب آدمی بوڑھا ہوتا ہے تو یہ افسوس کی بات ہوتی ہے ، بڑھاپا کوئی ایسی چیز نہیں جس کا جشن منایا جائے۔ میرا خیال ہے کہ ہم سوویت ادیبوں کو یہاں سیرافیمووچ سے اختلاف ہوگا خواہ وجہ صرف یہی کیوں نہ ہو کہ ان کا ''آہنی سیلاب،، خانہ‌جنگی کے متعلق پہلا بڑا ناول تھا۔ ان دنوں ہمارے پاس اور کچھ نہ تھا۔ اور ان کا ''آہنی سیلاب،، سوویت ادب کی بہترین تخلیقات میں شامل رہا ہے۔

مگر سیرافیمووچ ہمیں نہ صرف اپنی کلاسکی تصنیف ''آہنی سیلاب،، کے باعث پیارے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ وہ پرانی نسل کے ان بالشویک ادیبوں میں سے ہیں جنہوں نے رجعت‌پسندی کی تاریکی میں بھی اپنے عقیدے کی پاکیزہ شمع روشن رکھی، اس دشوار ترین زمانے میں بھی جبکہ بہت سے لوگ پرولتاریہ کو دغا دے گئے تھے، انقلاب اور مزدور طبقے کے وفادار رہے۔ کیا ان کے ناول ''میدانوں کا ایک قصبہ،، اور بیشمار افسانوں نے پرانے روس کی سچی تصویر ہمارے سامنے پیش نہیں کی؟

سیرافیمووچ نے طویل، بڑی زندگی پائی ہے۔ وہ زارشاہی کے قیدخانوں میں اور جلاوطنی میں رہ چکے ہیں۔ وہ لینن کے برادر بزرگ سے واقف تھے جنہوں نے الکساندر سوئم کو قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ''پراودا،، کے نامہ‌نگار کی حیثیت سے سیرافیمووچ خانہ‌جنگی کے تمام محاذوں پر گئے۔

اپنے سن کے باوجود وہ اب بھی اتنے ہی پرجوش اور چاق چوبند ہیں جتنے کہ پانچ یا دس برس پہلے تھے۔ کچھ تو ہے ایسی چیز جو اس انتھک بوڑھے آدمی کو نوجوانوں جیسا جوشیلا رکھتی اور وقت کی دستبرد سے محفوظ رکھتی ہے۔

ویشنسکایا میں سیرافیمووچ کی آمد مجھے یاد ہے۔ انہوں نے کئی روز میرے ہاں قیام کیا۔ دریائے ڈان کا پانی خواہ کتنا ہی ٹھنڈا کیوں نہ ہوتا انہوں نے پیراکی کی کبھی ناغہ نہیں کی۔ ان کی انتھک، لازوال توانائی پر میں عش عش کرتا جو خط بنانے اور غسل کرنے کے بعد ہمیشہ تروتازہ نظر آتے۔

کیسی جواں سال روح ہے!

۱۹۳۸ء

باقی تمام سوویت مصنفوں اور سلیمان استالسکی کے بیشمار قارئین کے ساتھ میں بھی اس انتہائی دانشمند شاعر کے ، جو عوام کا سچا ترجمان تھا، جسد خاکی کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔

۱۹۳۷ء

بالشویک ادیب

انیسویں جنوری کو ہم الکساندر سیرافیمووچ کی پچھترویں سالگرہ منانےوالے ہیں۔ سوچئے تو سیرافیمووچ پچھتر برس کے ہو گئے! کتنی دلکش، جوانمردی کا بڑھاپا ہے یہ! جب ان کے پاس ہوتے ہیں تو کسی طرح کوئی یقین ہی نہیں کر سکتا کہ یہ پچھتر کے کہیں آس پاس بھی ہوں‌گے، اتنے خوش و خرم، زندہ‌دل اور ملنسار ہیں وہ! ان کی صحبت میں ہمیشہ ایسا لگتا ہے جیسے کہ آپ کی اور ان کی عمر ایک ہی ہو۔

میں ان مرد بزرگ کو بہت چاہتا ہوں۔ وہ حقیقی معنوں میں فنکار اور ایک بڑی شخصیت ہیں جن کی تخلیقات سے ہم سب واقف ہیں اور بہت ہی پسند کرتے ہیں۔ سیرافیمووچ اس نسل کے ادیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن سے ہم نوجوانوں نے سیکھا ہے۔ میں ذاتی طور پر ان کا بڑا ہی مقروض ہوں کیونکہ مجھے ایک مصنف کی حیثیت سے انہوں نے میری ادبی زندگی کے آغاز میں سب سے پہلے سہارا دیا تھا اور سب سے پہلے میری ہمت‌افزائی اور قدرشناسی کی تھی۔ ظاہر ہے کہ ہمارے تعلقات اس سے اثرانداز ہوتے ہیں۔

میں ۱۹۲۵ء کبھی فراموش نہ کر سکوں‌گا جبکہ سیرافیمووچ نے میرے افسانوں کا پہلا مجموعہ پڑھنے کے بعد اس کےلئے نہایت گرمجوشی سے پیش لفظ لکھا تھا اور اس سے زیادہ یہ کہ کہا تھا مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ان سے میری سب سے پہلی ملاقات سوویتوں کے پہلے گھر میں ہوئی۔ سیرافیمووچ نے مجھے اطمینان دلایا کہ مجھ میں مصنف بننے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ انہوں نے مجھے نصیحت کی کہ میں لکھتا رہوں اور جو کچھ لکھوں اس کے ہر حصے پر نہایت سنجیدگی سے کام کرنا سیکھوں اور کبھی عجلت نہ کروں۔

میں نے ان کی نصیحت پر ہمیشہ عمل کرنے کی کوشش کی۔

9*

ہم اب بھی بہت تھوڑا لکھتے ہیں۔ کانگرس میں کتابوں کی جو دکانیں کھلی ہیں ان میں افسانوی ادب کی تخلیقات کی کمی زبان‌حال سے سب کچھ کہہ رہی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے دوسرے مصنف بھائی جو اس کانگرس کے ڈیلی گیٹ ہیں، کیا محسوس کرتے ہیں مگر میری حالت تو یہ ہے کہ ان دکانوں سے بچکر دور ہی دور سے نکل جانا چاہتا ہوں اور اگر بچکر نکلنے کی کوئی صورت نہ ہو تو جلدی سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرتا ہوں کہ کہیں کوئی ڈیلی گیٹ میرا دامن نہ تھام لے اور یہ نہ پوچھنے لگے: ''یہاں کتابیں کیوں نہیں ہیں؟ کیا ادیبوں کے قلم خشک ہو گئے؟،،

آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اس قسم کی باتیں سننا کسی مصنف کےلئے کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ ساتھیو، بدقسمتی سے ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا کہ ہم اچھا لکھتے ہوں۔ یہ کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ سوویت ادب کے وجود کے بیس برس کے عرصے میں ہم نے کچھ تو حاصل کر لیا ہے۔ ان کامیابیوں کو شرف قبولیت بخشتے ہوئے حکومت نے ہمارے بہت سے ادیبوں کو تمغے انعام دئے ہیں۔

ہماری برادر قومی جمہوریاؤں کے شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقات جن کے بارے میں روسی عوام کو اب تک بہت تھوڑی معلومات تھیں، اب ملک گیر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ ان ادیبوں کی تازہ دم آوازیں روسی ادب کی آواز میں ہم‌آہنگ ہوکر شامل ہوگئی ہیں، اس کو مالامال کر دیا ہے اور اس کو حقیقی معنوں میں بین‌الاقوامی ادب بنا دیا ہے۔

کیا ہم میں کوئی بھی جمبول کے رزمیہ گیتوں سے جو اپنی سادگی کے باوجود پرکار ہوتے ہیں، متاثر ہوئے بغیر رہ‌سکتا ہے؟ کیا جارجیائی نظموں کی مسحورکن شیریں بیانی نے ہمارے دل نہیں موہ لئے؟ کیا سلیمان استالسکی کے انوکھے، نغمہ‌ریز دلفریب اشعار ہمیں مغلوب نہیں کر لیتے؟ اگرچہ ترجمے میں اصل کے حسن کا ایک حصہ ضرور ضائع ہو جاتا ہے، مگر ان مصنفوں کی تخلیقات نے براہ‌راست ہمارے دل کو متاثر کیا...

ساتھیو، آپ کو معلوم ہی ہے کہ سوویت مصنفین اور قارئین کے درمیان تعلقات ان سے قطعی مختلف ہوتے ہیں جو سرمایہ‌دار ملکوں میں ملتے ہیں۔ اپنے فن سے جن لوگوں کی ہم خدمت کرتے ہیں وہ ہمارے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے۔

پارٹی کی اٹھارویں کانگرس میں تقریر

(اقتباس)

ساتھیو،

اس منبر پر چڑھتے ہوئے میں کچھ گھبراھٹ سی محسوس کر رھا تھا - میری گھبراھٹ کی وجہ یہ ھے کہ میں ضخیم اور، افسوس کہ ناتمام ناولوں کے مصنف کی حیثیت سے بدنام ھوں - اور اس لئے میں سوچ رھا تھا کہ جیسے صدرجلسہ نے میرا نام اگلے مقرر کی حیثیت سے پکارا تو آپ نے دل ھی دل میں کہا ھوگا: ''اچھا، تو یہی شولوخوف ھے جو طول طویل کتابیں لکھتا ھے مگر پوری کبھی نہیں کرتا - وہ شاید بولتا ھی رھیگا حتی کہ صاحب‌صدر اسکو وقت ختم ھوجانے کی یاددھانی کرائیں - ،، اور یہ سوچتے ھی آپ چپ چاپ ایک ایک کرکے کھسکنے لگیں‌گے - خیر تو اس سے پہلے کہ آپ اپنی نشستیں چھوڑ کر جائیں میں جلدی سے یقین دلانا چاھتا ھوں کہ تقریر مختصر کروں‌گا اور گھنٹی بجنے سے پہلے ھی ختم کردوں‌گا - اگر میری یہ مختصر تقریر بھی آپ کو طویل معلوم ھو تو برائے مہربانی بس ذرا ھلنا جلنا شروع کیجئے اور میں جلدی سے ختم کر دوں‌گا...

میں ادب کے بارے میں اور کچھ تھوڑا سا کاغذ کے بارے میں یعنی فن اور صنعت کے دو باھم متعلق شعبوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاھتا ھوں -

مجھ سے پہلے جو تقریر کر رھے تھے انہیں سن سن کر مجھے رشک ھو رھا تھا - خواہ کسی چیز کا ذکر ھو، کوئلے کا یا اناج کا، تیل یا چقندر کا انھوں نے اعداد و شمار اور فی‌صد تناسبات کا حوالہ دیا اور اس سے سب پر بخوبی عیاں ھو جاتا کہ کام کتنا ھوا ھے - اس کے برعکس ادب کا معاملہ ایسا ھے کہ اعداد و شمار اور فی‌صد تناسب سے اس کا محض دور پرے کا ھی تعلق ھے - اور یہاں میں آپ کے سامنے خالی ھاتھ کھڑا ھوں اور کوئی ایسی چیز نظر بھی نہیں آرھی کہ جس کا سہارا لوں...

ساتھیو، میرا خیال ھے کہ یہاں ھمیں اپنی پیداوار کا — پچھلے پانچ سال کے دوران میں جو کتابیں شائع ھوئیں ان کا — ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ھے - ضرورت اس لئے نہیں ھے کہ اچھی کتابیں آپ سب پڑھ چکے ھیں اور جو خراب ھیں ان کا ذکر نہ کرنا ھی اچھا ھے -

ہوگی۔ کلاسکی ادب کا ہم احترام کرتے اور اس سے محبت کرتے ہیں اور اب، سوویت اقتدار کے تحت ہی اس کی کتابیں عام قارئین کی دسترس میں پہنچی ہیں۔ یہ کتابیں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوئی ہیں اور اب بھی وہ کافی نہیں ہیں۔ افسانوی ادب کی اشاعت کے لئے اور بھی کاغذ دینا چاہیئے۔ انتظام اس طرح کرنا چاہیئے کہ کاغذ ذخیرے میں رہے اور اچھی کتابوں کا منتظر رہے۔ اس کے برعکس صورت نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ حالت ناقابل برداشت ہے کہ قارئین کے پاس سے پوشکن کے لئے دس لاکھ کی فرمائشیں آئی ہوئی ہیں، شیوچنکو کے لئے پانچ لاکھ کی، مگر ہم امسال صرف چند درجن ہزار جلدیں ہی شائع کریں۔

ایک زمانے میں جب نئی کتابوں کی کمی کے باعث گوس‌لیتیزدات کو محض پرانی کتابوں کو دوبارہ شائع کرنے پر ہی اکتفا کرنا پڑتا تھا تو مذاق میں مصنفین اس کو طبع ثانی کا ریاستی اشاعت گھر کہتے تھے۔ مجھے خوف ہے کہ کاغذ کی اگر ایسی ہی حالت رہی تو گوس‌لیتیزدات کو لوگ کہیں ریاستی بےاشاعت‌گھر نہ کہنے لگ جائیں۔ پھر بھی مصنفین افسانوی ادب کے لئے کاغذ کا کوٹا بڑھانے کے متعلق پرامید ہیں کہ معاملہ انہیں کے حق میں فیصل ہوگا۔

چند الفاظ، ساتھیو، اس جنگ کے متعلق سوویت ادیبوں کے رویے کے بارے میں جو فاشست ہمارے سر منڈھ رہے ہیں۔ یہ توقع کرتے ہوئے کہ آئندہ چل کر ہم پیداوار کی بعض شاخوں پر مقدار اور خوبی دونوں کے اعتبار سے سبقت حاصل کرلیں‌گے، لیکن ایک شاخ ایسی ہے جس پر ہم مصنفین سبقت حاصل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے — میری مراد دفاعی صنعت سے ہے، اول تو اس لئے کہ کسی طرح سبقت حاصل کرنے کی بہرحال کوئی صورت نہیں ہے، دوسرے اس لئے کہ یہ اتنی اچھی، انتہائی اہم شاخ ہے کہ اس پر سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرنا صاف ناشائستگی ہوگی۔ ہم سب کی بھلائی اور ہمارے دشمنوں کے خاتمے کے لئے اس کو فروغ حاصل ہو اس کی ترقی ہو۔

سوویت مصنفین مغربی یورپی صلح پسندوں کی جذباتی نسل سے تعلق نہیں رکھتے۔ اگر دشمن ہمارے ملک پر حملہ کرتا ہے تو ہم سوویت ادیب اپنے قلم رکھ دیں‌گے اور پارٹی اور حکومت کی للکار پر دوسرا ہتھیار اٹھا لیں‌گے اور جس رائفل رجمنٹ کا کامریڈ

ہماری تنقید کی جاتی ہے، جب ضرورت ہو تو سرزنش کی جاتی ہے، جب ہمیں ناکامی ہوتی ہے تو سہارا دیا جاتا ہے، جب کام قابل‌تعریف ہو تو تعریف کی جاتی ہے، اور ہم میں سے ہر ایک کو عوام کے رہبرانہ دست‌شفقت کا ہر وقت احساس رہتا ہے۔ اور اس لئے جب لوگ مصنف سے کہتے ہیں کہ وہ بہت ہی کم لکھتا ہے یا یہ کہ اس کی تخلیقات گھٹیا قسم کی ہیں تو مصنف اپنی صفائی میں بھلا کیا کہہ سکتا ہے؟ وہ تو منہ لٹکا کر کھڑا ہو جاتا ہے، بےربط باتیں بڑبڑانے لگتا ہے کہ وہ سنبھلنے کی کوشش کرےگا۔ کبھی وہ سنبھل بھی جاتا ہے لیکن ہمیشہ ہی ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی وہ چاہتا تو ہے کہ بہتر کتاب لکھے مگر ہزار کوشش کے باوجود نہیں لکھ پاتا، اس کے پاس وہ چیز ہی باقی نہیں بچتی جو چاہئے ہوتی ہے، اس کی صلاحیت سلب ہوکر رہ جاتی ہے۔

اس مسئلے کا ایک رخ اور بھی ہے، اور اس کے بارے میں ہمیں صاف صاف اور واضح طور پر بات کرنی ہے — یہ ہے کاغذ کا مسئلہ۔ افسانوی ادب کے لئے جو کاغذ دینا طے پایا ہے اس کا فی‌صد تناسب بہت تھوڑا ہے، اس قدر تھوڑا کہ دل دکھتا ہے۔ گوس‌لیتیزدات* والے کہتے ہیں کہ اگر امسال وہ ہر انعام‌یافتہ مصنف کی، جن کی تعداد ۱۷۲ ہے، صرف ایک کتاب شائع کریں تو ان کے حصے میں جو کاغذ آیا ہے وہ ذرا نہ بچے لیکن بہرحال صرف ان لوگوں کی ہی تصانیف تو نہیں چھپنی چاہئیں جن کو انعام مل چکا ہے، بلکہ ان ادیبوں کی بھی جن کو آئندہ انعام ملنے ہیں۔

اور پھر ان ادیبوں کا زمرہ ہے جنہیں بعید ماضی میں اپنے علم و دانش کا ثمرہ سائبیریا میں قیدبامشقت کی اور جلاوطنی کی شکل میں ملا تھا، ان کو ذلیل اور رسوا کیا گیا تھا، ان کو معمولی فوجی کی طرح فوج میں جبریہ بھرتی کیا گیا، ریاست کے ادارے اور کلیسا کی زبردست طاقت سے ان کو کچل دیا گیا یا ان کو بےسہار افسروں نے نہایت تابعداری کے ساتھ موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس ذلت، اس پرلے درجے کی بےشرمی کی ذمہ‌داری اس ملعون حکومت کے سر ہے جس کا ہمارے عوام اور ہماری پارٹی نے ۱۹۱۷ء کے اکتوبر میں ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیا۔ وہ حکومت تاریخ کے سامنے اس کی جوابدہ

---

*ریاستی ادبی اشاعت گھر۔ (ایڈیٹر)

حب الوطنی کی جنگ عظیم کے زمانے میں لکھے ہوئے اپنے مضمونوں میں تالستائی، جو اپنی مادروطن سے بے حد پیار کرتے تھے اور فاشزم سے تہ‌دل سے نفرت کرتے تھے، وکیل جمہور کی غضبناک زبان میں بولے اور ان کی بات محاذ جنگ پر فوجی سپاھی بڑی توجہ سے سنتے تھے اور وہ بھی جو عقب میں کام کرکے لال فوج کو اس معرکۂ عظیم میں فتح حاصل کرنے میں مدد دے رہے تھے۔

اس پرآشوب زمانے میں جبکہ جرمن ماسکو پر بڑھے چلے آ رہے تھے، تالستائی نے روس کے سچے بیٹے کی حیثیت سے جسے اپنے ہموطنوں پر بےپناہ عقیدہ ہو، سوویت عوام کے روبرو روس کے ماضی کی تاریخی عظمت کے زندہ جاوید پیکر پیش کئے اور ہمارے جلیل القدر بزرگوں کے پند و نصائح ان کو یاد دلائے۔ ان کے مضامین کا بنیادی خیال یہ ہوتا کہ ''ہم قدم جمائے کھڑے رہیں‌گے!،، ان کے عنوان ہی للکار تھے: ''کارھائے نمایاں کےلئے، عظمت و شان کے لئے اٹھ کھڑے ہو!،،' ''ثابت قدمی،،' ''نذر،،، ''اعتقاد فتح،،' ''روس جسے غصہ دلایا گیا،،' ''ناقابل تسخیر قلعہ،،' ''اپنی سوویت مادروطن کے لئے!،،' ''دشمن سے نفرت کرو!،،۔

مضمون بعنوان '' ہم کس کی مدافعت کررہے ھیں؟،، میں جو ۲۷ جون ۱۹۴۱ء کو لکھا گیا تھا، تالستائی نے سوویت وطن سے اپنی محبت کا اظہار ان الفاظ میں کیا جو سادہ اور بہ اعتبار خلوص ولولہ‌انگیز تھے۔ انہوں نے کہا تھا:

''میرے ملک، میری سرزمین، میری مادروطن، کوئی جذبہ زندگی میں اتنا پرجوش، گہرا اور مقدس نہیں جتنا تیرے لئے میرا جذبۂ محبت ھے...،،

ایک اور مضمون میں انہوں نے سوویت انسان کے متعلق یہ ولولہ انگیز الفاظ لکھے تھے: ''سوویت اور سب سے پہلے روسی انسان کی ذہنیت یہ ھے کہ اس مشروب کے بڑے بڑے گھونٹ پینے کے بعد جس کا نام آزادی ھے، اس کا یہ احساس اجاگر ہو جاتا ھے کہ جرمن سامراجیت کے اعداد مردم کشی کے علاوہ بھی آفتاب حیات بخش کے زیر سایہ اعلی و ارفع انصاف موجود ھے... سوویت یونین، ان کے آبا و اجداد کی سرزمین، ان کے بیٹوں اور پوتوں کے لئے مسرت کی ارض‌موعودہ موجود ھے۔،،

محبت اور یقین کے یہ الفاظ جو صبر آزما دنوں میں کہے گئے تھے عوام کی احسانمند یادداشت سے کبھی بھی محو نہ ہو سکیں‌گے۔

وروشلوف نے ذکر کیا ہے، اس کی جب گولیاں داغی جائینگی تو ان میں ہمارا سیسہ بھی شامل ہوگا، اتنا ہی وزنی اور گرم جتنی فاشزم سے ہماری نفرت، جو دشمن کو مار کاٹ کر ڈھیر کر دیگا۔

لال فوج کی صفوں میں، اس کے شاندار لال جھنڈوں کے زیر سایہ ہم دشمن کو ایسے مار گرائیں گے جیسے پہلے کبھی کسی نے نہ کیا ہوگا، اور میں آپ کو، کامریڈ ڈیلی گیٹو ، یقین دلاتا ہوں کہ ہم اپنے نقشوں کے خول چھوڑ کر نہیں بھاگیں گے — یہ جاپانی رواج ہماری شان کے خلاف ہے۔ اس کے برعکس ہم اوروں کے نقشوں کے خول اٹھا لیں گے کیونکہ ان میں سے ہمیں جو کچھ ملیگا وہ بعد میں ہماری ادبی سرگرمیوں میں کام آئیگا۔ دشمن کا صفایا کرکے ہم کتابیں لکھیں گے اور تفصیل بیان کریں گے کہ کیسے کیا۔ یہ کتابیں ہمارے عوام کے کام آئیں گی اور کوئی حملہ‌آور اگر بچ رہا تو اس کے لئے تنبیہہ کا کام دیں گی۔

ساتھیو، آپ میں سے بہتوں کی طرح میں بھی پارٹی کانگرس میں اپنی زندگی میں پہلی بار شامل ہوا ہوں۔ ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم سوویت دانشوروں کی پہلی کونپلیں ہیں جنہیں پارٹی نے پروان چڑھایا ہے۔ ہمارے بعد کروڑوں لوگ آئیں گے، کلچر جن کی زندگی کا ایک جزو بن چکا ہوگا۔

۱۹۳۹ء

ایک عظیم الشان فن کار

الیکسئی تالستائی ایک ایسے ادیب تھے جن کے سینے میں ایک عظیم روسی روح تھی اور جو متنوع جوہرخداداد کے مالک تھے۔ لاکھوں قارئین میں ان کی مقبولیت جو انہوں نے برسہا برس کے انتھک کام سے، اور تحریر کے معاملے میں نہایت سخت گیری سے حاصل کی تھی، حقیقی معنوں میں عظیم تھی اور وہ اس کے مستحق تھے۔

بچوں کی کہانی ہو، تواریخی ناول یا جنگ کی کہانی، ہر چیز تالستائی کے مضبوط اور سخت گیر ہاتھوں میں پہنچکر ایسے رنگ میں رنگ جاتی جس میں زندگی کی آب و تاب ہوتی تھی، اور سنگ تراشی کے ایک فنپارے کا حیرت انگیز تجسیمی لمس جسے پیدا کرنے میں سچا فنکار ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔

الیکسئی تالستائی ایک ایسے ادیب تھے جن میں فیاض روسی روح جاگزیں تھی اور جن کی خداداد صلاحیتیں آشکارا اور متنوع تھیں۔ اپنے سوویت وطن کے لئے، سوویت عوام کے لئے، ہر اس چیز کے لئے جو کسی روسی کو دل سے عزیز ہوتی ہے، اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لئے انہیں سادہ اور پرکار الفاظ ملجاتے تھے۔ فاشست درندوں کو جنہوں نے روسی کو، سوویت عوام کو غلامی کے جوئے میں جوتنے کی کوشش کی تھی، داغنے کے لئے انہوں نے چن چن کر زوردار اور غضبناک الفاظ استعمال کئے۔

ان صبر آزما دنوں میں جو ہمارے ملک کو دیکھنے پڑے تھے، تالستائی نے محبت اور یقین کی جو باتیں کی تھیں وہ عوام کی ممنون احسان یادداشت سے کبھی بھی نہ مٹ سکیں گی...

۱۹۴۵ء

ادب کا مربیٔ اعظم

میخائل ایوانووچ کالینن کی وفات سے، جن کا اب کل سوویت عوام دلی سوگ منا رہے ہیں، ہمارا ادب اپنے عظیم‌ترین مربی، ادیب کی کاوشوں کے ایک قابل اور باریک بیں مبصر سے محروم ہو گیا۔

میخائل ایوانووچ جنہوں نے روسی کلاسکی ادب کی فضا میں پرورش پائی تھی جس پر انہیں عبور حاصل تھا اور جس سے وہ ساری زندگی پاکیزہ اور پرشباب محبت کرتے رہے، ہم‌عصر ادیبوں کے کام میں نہایت سرگرمی کے ساتھ ہمیشہ دلچسپی لیا کرتے تھے۔

ابھی کوئی دو مہینے سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ میری ان سے گفتگو ہوئی تھی۔ میخائل ایوانووچ نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں کیا لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں اور میرا ناول ''وطن کے مجاہد'' کی کیا پیش رفت ہے، اور پھر کہنے لگے:

''بہت دنوں سے میں چاہتا تھا کہ تم سے ملوں اور تمہاری کتاب کے بارے میں بات چیت کروں۔ سچ پوچھو تو مجھے تشویش تھی کہ حب‌الوطنی کی جنگ عظیم کے متعلق ناول لکھتے ہوئے ممکن ہے کہ تم یہ بات نظر انداز کر جاؤ جو میرے خیال میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے'' اور پھر میخائل ایوانووچ نے بتانا شروع کیا کہ میری آئندہ تصنیف میں وہ کن باتوں کی جھلک پائی جانی لازمی تصور کرتے ہیں۔

تالستائی نے روسی ادب کی بہترین روایات جاری رکھیں اور وہ روسی زبان کی پاکیزگی کے پرجوش محافظ تھے۔ سوویت ادیبوں کی نوجوان نسل جس نے تالستائی کو اپنا سچا دوست پایا، ان کی ممنون احسان ہے۔

جنگ کے زمانے میں تالستائی اپنی انشائیہ تحریروں کے علاوہ اپنے شہپارے ''پیٹر اول،، اور اپنی ڈرامائی کہانی ''ہولناک ایوان،، کی تصنیف کے سلسلے میں بھی سخت محنت سے کام کرتے رہے۔

ہم سب کو اس احساس سے اطمینان‌بخش سکون رہتا تھا کہ زندگی سے پیار کرنےوالے تالستائی جن کی روسی دانائی اور صلاحیتیں ضوفشاں رہتی تھیں، ہمارے پاس ہی رہتے اور کام کیا کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقات کا ہم پیار اور امید کے ساتھ مطالعہ کیا کرتے اور یہ دیکھنے کے لئے رسالوں کی ورق گردانی بڑے اشتیاق سے کیا کرتے کہ ان کی کہیں کوئی چیز چھپی ہو۔ اب ان کی کمی ہمارے لئے اسی سبب سے اور بھی زیادہ سخت، اور بھی زیادہ تلخ ہے۔

جنگ کے بالکل شروع کے دنوں میں تالستائی نے لکھا تھا:
''تیسری رائخ،، کی فوجوں کا صفایا کرنے کےلئے تمام ''نازیوں،، کو ان کی تمام وحشیانہ خونی سازشوں سمیت صفحۂ‌ہستی سے مٹا دو اور ہماری مادروطن کو امن، سکون، دائمی آزادی، افراط اور افضل‌ترین انسانی آزادی کی شاہراہ پر مزید پیشقدمی کے لئے ہر موقع فراہم کرو — یہ ہے وہ اعلی اور باعزت فریضہ جو ہمیں روسیوں کو اور ہماری یونین کی تمام برادر قوموں کو انجام دینا چاہئے۔،،

اور کس قدر رنج ہے اس بات کا کہ وہ ہماری فتح کو جو اس قدر قریب آن پہنچی ہے، دیکھنے کےلئے زندہ نہ رہے۔

۱۹۴۵ء

الیکسئی تالستائی کے جنازے پر تعزیتی تقریر
(اقتباس)

...ہمارے عوام کو صدمۂ عظیم پہنچا ہے۔ سوگ کی تلخی تکلیف‌دہ ہے۔ ایک بڑے ادیب نے جس نے اپنی پوری زندگی، اپنی پرزور صلاحیت عوام کے لئے وقف کر دی تھی، وفات پائی ہے۔

میں مصنف نے شکایت کی تھی کہ مصنفین کی انجمن نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی کیونکہ اس نے استالن انعام کے لئے اسکی کتاب نامزد نہیں کی تھی حالانکہ، بقول اس کے، یہ اس لائق تھی کہ نامزد کی جاتی۔ میری نگاہ کمزور ہے مگر پھر بھی میں نے یہ موٹی سی کتاب شروع سے آخر تک پڑھی۔ کتاب تو میں نے پڑھ لی مگر مصنف کو کوئی جواب نہیں دیا۔،، میخائل ایوانووچ نے اشارے سے مایوسی کا اظہار کیا اور مسکرانے لگے۔ ''میں جانتا ہوں یہ میری بےمہری تھی، لیکن بھلا میں کیا کرتا؟ کتاب اس لائق بھی نہ تھی کہ شائع کی جاتی، استالن انعام کا تو ذکر ہی کیا۔ ایسے مصنف کو میں کیا جواب دیتا جس میں صلاحیت نام کو نہیں اور تکبر ڈھیروں؟ میرا خیال ہے وہ میری بات کا بھی یقین نہ کرتا۔ لیکن میں نے ایک پرانے ذہین ادیب کو جواب دینے میں ذرا پس و پیش نہیں کیا جس نے تھوڑے ہی دن ہوئے اپنی نئی کتاب مجھے بھیجی تھی۔ میں نے جواب دیا تھا کہ یہ کتاب خراب ہے اور دلچسپ نہیں ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ کتاب خراب ہے!،،

میخائل ایوانووچ خاموش ہوگئے اور انگلیوں سے میز کو بجاتے ہوئے اپنے ہی کسی خیال پر مسکرانے لگے۔

انہوں نے سلسلۂ کلام جاری کیا: ''کوئی پچاس برس ہوئے جب میں طفلس کے ایک قیدخانے میں تھا تو ایک مشہور مصنف کی کتاب ہاتھ لگ گئی۔ کوٹھری میں میں تنہا تھا اور صرف یہی کتاب میرے پاس تھی۔ میں نے اسے پڑھا اور بےشمار مرتبہ بار بار پڑھا۔ وہ تو مجھے ساری عمر یاد رہنی چاہئے تھی، یا نہیں؟ لیکن جیسے ہی میں رہا ہوا، اس کو قطعی بھول گیا اور تب سے اب تک کبھی جی نہ چاہا کہ اس کو اٹھاکر پھر پڑھ لوں۔ وجہ یہ کہ وہ حقیقی ادب نہیں تھا... جب تالستائی یا چیخوف ہو تو ایک مرتبہ پڑھنے سے ہی ہمیشہ کے لئے یاد ہو جاتا ہے، ذہن کے پردے پر اس کا نقش قائم رہتا ہے۔ اور جب اس کو دوبارہ پڑھنا شروع کرتے ہیں تو وہ اتنی اچھی طرح یاد ہوتا ہے جیسے چالیس سال پہلے نہیں بلکہ کل ہی پڑھا ہو... حقیقت تو یہ ہے کہ ''لافانی،، مصنفوں کی بھی ایسی کتابیں ہوتی ہیں جو اگرچہ ہیئت کے اعتبار سے کامل ہوتی ہیں مگر اس قدر بےاعتنائی کے ساتھ لکھی گئی ہوتی ہیں کہ ان

جب میں نے جواب دیا کہ یہ صورت حال میرے ذہن میں موجود تھی اور یہ کہ میں اس کو پیش کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کروں‌گا تو میخائل ایوانووچ نے جو اس وقت کاغذ میں تمباکو لپیٹ کر اپنے لئے سگریٹ بنا رہے تھے اپنی چمکدار عینک کے تالوں کے نیچے سے جھانک کر مسکراتی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور مرد بزرگ کی میٹھی مسکراھٹ سے ان کا پورا چہرہ دمکنے لگا۔

''تو پھر ٹھیک ہے! بہت اچھا۔ پھر مجھے فکرمند نہ ہونا چاھئے تھا،، انہوں نے کہا اور زیادہ سنجیدگی کے ساتھ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے: ''جانتے ہو، ہم پڑھنےوالے، تم لکھنےوالوں سے صرف یہی نہیں چاھتے کہ محض کتابیں مہیا ہوجائیں، ہم چاھتے ھیں اچھی کتابیں جو ھماری زندگی کی مکمل تصویر پیش کریں۔ یہی وجہ ہے کہ میں تمھارے منصوبوں میں گویا کہ ''دخل اندازی،، کر رہا ہوں۔ اور خاص طور سے جبکہ موضوع ایسا زبردست واقعہ ہو جیسا کہ پچھلی جنگ جو ھمارے عوام نے عزت اور فتح عظیم کے ساتھ انجام کو پہنچائی، تو ہم چاھتے ھیں کہ اصل کتابیں پڑھیں، اس قسم کی کتابیں جو زیادہ نہیں تو قرنوں تو زندہ رھیں۔ تم تو جانتے ہو کہ بعض مصنفین کیا کرتے ھیں: وہ پلاٹ کو ذہن میں ٹھیک طرح مرتب ہونے کی مہلت نہیں دیتے، اس پر اپنی راتوں کی نیندیں حرام نہیں کرتے، اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ ان کی کتاب شائع ہو جاتی ہے، اور اس سے بھی بدتر یہ کہ سال میں دو کتابیں، جن میں سے ہر ایک کا عرصہ حیات ایک دن سے زیادہ نہیں ہوتا۔ آج پڑھی اور کل آپ اس کے خاص خاص کرداروں، کسی کپتان یا شاید لفٹنٹ اور لڑکی، کا نام تک، اور سارا قصہ کیا تھا یہ بھی بھول جائیں‌گے۔ اس میں لوگ حقیقی نہیں ہوتے، غیرمادی مٹیالے مٹیالے سے سائے ہوتے ھیں، تو پھر بھلا کسی سے کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ انہیں یاد رکھ سکے؟ اور اگر اس میں مصنف کی خام زبان اور ناول کے دوسرے جھول بھی شامل کر لئے جائیں تو پھر یاد رکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چھاپنےوالوں کی اور شائع کرنےوالے عملے کی محنت، کاغذ اور روپیہ سب ضائع ہوتا ہے۔ اور اسی طرح پڑھنےوالے کا وقت بھی۔

''پچھلے دنوں مجھے کسی مصنف کا خط اور ایک موٹی سی کتاب ملی جو کسی علاقائی اشاعت گھر نے شائع کی ہے۔ اپنے خط

''ایک مرتبہ جب میں سنہ بیس کی دھائی میں تمھارے ھی علاقے میں تھا تو راستے میں ایک باغ پڑا جہاں شہد کی مکھیاں پالی جاتی تھیں۔ خانہ‌جنگی ابھی حال ھی میں ختم ھوئی تھی۔ شہد کی مکھیاں پالنے کے اس مرکز کو برباد کر ڈالا گیا تھا کیونکہ وائٹوں اور خود ھمارے لوگوں دونوں کو مٹھاس بہت پسند ھوگی... شہد کی مکھیاں پالنےوالا ھنس‌مکھ بوڑھا مجھ سے ملنے باھر آیا۔ 'کیا حال ھے؟'، میں نے اس سے پوچھا اور اس نے جواب دیا: 'بہت اچھا ھے، میخائل ایوانووچ!'، میں نے پوچھا 'بہت اچھے کی کیا بات ھے جنگ نے تم کو کیا تباہ و برباد کرکے نہیں رکھ دیا؟'، اور اس نے جواب دیا: 'برباد تو کیا مگر بالکل نہیں۔ شہد کی مکھیوں کے چالیس چھتوں میں سے ایک باقی بچ رھا ھے اور اس پر خدا کا شکر ھے۔ اس چھتے میں شہد کی مکھیوں کا کنبہ خاصا طاقتور ھے اور میں اپنے عزیز مہمان کو کچھ شہد ابھی پیش کرسکتا ھوں! تین سال بعد آئیے پھر آپ اس باغ کو پہچان بھی نہ پائیں‌گے!'،،

رخصت ھوتے وقت میخائل ایوانووچ نے مجھ سے پوچھا کہ میرے خیال میں میرے ناول کا پہلا حصہ کب مکمل ھوجائیگا اور میں نے انہیں اندازاً تاریخ بتا دی۔

''تو پھر اسے پڑھنے تک میں زندہ رھوں‌گا،، انہوں نے کہا۔ ''لیکن تم عجلت سے کام نہ لینا اور ھم پڑھنےوالے جو کہتے ھیں اس پر حد سے زیادہ دھیان نہ دینا۔ ھمارا کام تو یہ ھے کہ مصنف کو اکسائیں تاکہ اس کی کتاب جلدی سے نکل آئے اور تمہارا کام یہ ھے کہ ایسی کتاب تیار ھو جو ان لوگوں کی توجہ کے قابل ھو جن کے لئے تم لکھ رھے ھو۔ بہرحال کتاب کے لئے جواب‌دہ تم ھوگے پڑھنےوالا نہیں۔ یہ کبھی ھرگز نہ بھولنا!،،

آج سوگواری کی تلخی اور دکھ اپنے دل میں تازہ تازہ لئے میرے دماغ میں کالینن کی وہ آخری گفتگو صاف طور سے گونج رھی ھے۔ شہد کی مکھیاں پالنےوالے بڑے میاں سے ان کی ملاقات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا: ھمارا ملک شہد کی مکھیوں کے ایک بہت بڑے چھتے کی طرح ھے پرمسرت، پرامن سرگرمیوں کی گہما گہمی کا گہوارہ، جہاں جنگ کی تباہ کی ھوئی معیشت کو بحال کرنے میں سب مصروف ھیں... برسوں گذر جائیں‌گے اور ھماری اولاد در اولاد جب لال چوک میں آیا کرےگی اور ھمارے عہد کی عظیم‌ترین ھستی کے مقبرے

سے روح سرد ہوکر رہ جاتی ہے، جیسے سنگ‌مرمر کی ٹھنڈی سل پر ہاتھ رکھ دیا ہو...،،

میخائل ایوانووچ نے اپنا چھوٹا سا دبلا پتلا ہاتھ میز پر رکھ دیا اور اپنے خیال کی وضاحت کچھ اس طرح ہاتھ کے اشارے سے کی جو اتنا واضح اور اتنا دلنشین تھا کہ جو لوگ وہاں موجود تھے ان سب کو بےجان سنگ‌مرمر کے یخ بستہ تنفس کا سا احساس ہوا۔

''اچھی کتاب میں اسے کہتا ہوں جسکی جلد کے اندر زندگی کی گویا نبض چل رہی ہو، جیسے آپ کی رگوں میں خون چلتا رہتا ہے، اور جسے آپ اگر ہمیشہ نہیں تو عرصہ دراز تک یاد رکھیں اور آپ کی خواہش ہو کہ کبھی پھر بیٹھ کر پڑھیں۔ تم کو چیخوف کا افسانہ ''سیدان،، یاد ہے؟،، میخائل ایوانووچ نے پوچھا اور پھر بڑے جوش و خروش کے ساتھ چیخوف، تالستائی اور گورکی کے متعلق باتیں شروع کردیں۔

بعد میں انہوں نے ڈان کے اجتماعی کاشتکاروں کی زندگی سے گہری دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے سوالات پوچھے اور خانہ جنگی کے محاذوں پر اپنے دورے کی پرانی یادوں میں کھوتے ہوئے کہا:

''وہاں لوگ بہت ہی اچھے ہیں، جیسے کہ ملک میں اور ہر جگہ میں۔ ہمارے ہاں جیسے لوگ ہیں ان کو ساتھ لیکر جنگ حفاظت سے لڑی جا سکتی ہے یا تعمیر شروع کی جا سکتی ہے۔ مجھے تمہارے ڈان کے علاقے کی عورتیں خاص طور سے پسند آئیں، وہ جفاکش ہوتی ہیں اور ان کی اپنی ایک خصوصیت ہوتی ہے۔ مجھ سے جب باتیں ہوئیں تو وہ شکایتی لہجے میں بڑبڑائی بھنبھنائی نہیں کہ کپڑا نہیں ہے، صابن نہیں ہے، اور صرف کبھی کبھار ہی، جب قلت سے وہ واقعی بےحد پریشان ہوتیں تو مجھے یاد ہے کہ بس کوسنے دینے لگتیں... دراصل کوسنے وہ جی بھر کے دیتی ہیں...،، دبی دبی ہنسی ہنستے ہوئے اور کسان کی معنے خیز چالاکی سے اپنی آنکھیں چندھیاتے ہوئے انہوں نے کہا: ''خیر، میرا خیال ہے کہ کوسنوں سے اپنے سینے کا بوجھ ہلکا کرلینا بڑبڑانے، بھنبھنانے سے زیادہ اچھا ہوتا ہے، ہے نا؟،،

ہمارے عوام کی ناقابل تسخیر قوت حیات کا ذکر کرتے ہوئے میخائل ایوانووچ نے مجھ سے یہ کہا:

اس واقعه سے ظاهر هوتا ہے کہ همارا سوویت ادب کرۂارض کے دور درازترین گوشوں میں پهنچ گیا ہے۔
بهرحال صرف سوویت یونین هی تو ایک ایسا ملک ہے جهاں هم ادیبوں کو تخلیقی کام کے لئے تمام ضروری سهولتیں فراهم هیں۔ اور اس لئے هم کو بس اچها هی لکهنا چاهئے۔
میں نے ساری عمر سوویت عوام کی خدمت انجام دی ہے اور میں عوام کی خدمت همیشه دل و جان سے کرتا رهوں گا۔

ستمبر ۱۹۴۸ء

ایک نشری تقریر

سوویت مصنفین کو اپنے قارئین کا ایک قرض چکانا ہے۔ مجهے بڑا افسوس ہے اور دل هی دل میں گهبرایا هوا هوں که میں بهی — دو نامکمل ناولوں کا مصنف — مقروضوں میں سے هوں، مگر نادهندوں میں نهیں، کسی طرح بهی نهیں۔
همارے پاس جو فنکارانه ذرائع هیں ان سے هم زندگی کے همقدم نهیں چل پا رہے۔ همارا واحد حیله اور باعث اطمینان صرف ایک یه امر ہے که کمیونزم کی جانب اپنی پیش رفت میں همارے ملک نے وہ حیرت انگیز رفتار پکڑلی ہے اور دیوزادوں جیسے ایسے ڈگ بهر رها ہے که هم ادیب اپنے پرکوفت اور پرتکلف کام میں پیچهے هی رہ جاتے هیں اور کچھ نهیں کرپاتے۔
جس قدر ممکن هو سکتا ہے هم جلدی کر رہے هیں، لیکن یه هم نهیں کرسکتے که حد آخر تک پهنچتے پهنچتے بےدم هو کر گرپڑیں۔
چنانچه هوتا یه ہے که ادیب ابهی مارچ میں درخت کی بےبرگ ٹهنیوں اور موسم بهار کے لئے پهٹاؤ آنے کی کیفیت بیان کرنے میں سر کهپا رها هوتا ہے که اس وقت تک درخت میں پهلی چپچپاتی هوئی ننهی ننهی پتیاں نکل آئیں گی۔ اس منظر پر حیران اور خود اپنی سست رفتاری پر پریشان ادیب بعجلت کوشش شروع کرتا ہے که ان پتیوں کی پربهار کیفیت بیان کرے اور ابهی وہ اپنا بیان ختم بهی نهیں کرپائیگا که درخت موسم بهار کے اپنے پهول جهاڑ چکا هوگا اور ان کی جگه پهل آنے بهی شروع هو گئے هوں گے...

کے سامنے عزت سے سر جھکائیگی تو میخائل ایوانووچ کالینن کی قبر کے سامنے بھی جنھوں نے اپنی پوری زندگی اپنے وطن کی خدمت کے لئے وقف کردی تھی اور جو کرۂارض پر لوگوں کی مسرت کے لئے لینن کی جدوجہد میں ان کے باوفا ساتھی تھے، محبت اور احسان مندی کے جذبے کے ساتھ ایک لمحے کے لئے رک جایا کرےگی۔

۱۹۴۶ء

ادبی زندگی کے پچیس سال

(اس تقریب میں منعقدہ جلسے میں تقریر)

سوویت ادب میں دو رجحان ھیں۔ بعض مصنف روز کے واقعات کا بڑی سرعت سے ردعمل ظاھر کر دیتے ھیں، جبکہ کچھ اور ایسے ھیں جو اپنی کتابوں پر نسبتاً زیادہ وقت صرف کرتے ھیں اور ان کی کوشش یہ ھوتی ھے کہ دیرپا قدروقیمت کی تخلیقات پیش کریں۔

حب الوطنی کی جنگ عظیم کے دوران ھم سب نے واقعات کے ردعمل کا بڑی سرعت سے اظہار کیا۔ زندگی کا ھم سے یہی مطالبہ تھا۔ میں بھی ان دنوں بہت جلدی لکھا کرتا تھا۔ پھر بھی میں قارئین کی توقع سے زیادہ سست رفتاری سے لکھنے کا اپنا حق محفوظ رکھنا چاھوں‌گا، اس یقین کے ساتھ کہ خوبی میں اضافہ سست رفتاری کی کمی کو پورا کر دیگا۔

یہ حقیقت کہ میری کتابوں کے کئی کئی ایڈیشن شائع ھوتے ھیں ثابت کرتی ھے کہ اھم سماجی عوامل کی عکاسی ''سست رفتار،، کام میں بھی ھو سکتی ھے۔

جلدی جلدی لکھ کر خراب کتابیں پیش ھو سکتی ھیں اور سست رفتاری سے لکھ کر — اچھی۔

سوویت ادب کے بتدریج بڑھتے ھوئے اثر اور مقبولیت کا اندازہ اس ایک مثال سے ھی لگایا جاسکتا ھے: حال ھی میں پولینڈ کے شہر وروکلو میں تہذیبی کارکنوں کی عالمی امن کانگرس منعقد ھوئی تھی۔ اس کے ایک ڈیلی‌گیٹ نے جو جزائر اینٹی‌لیس سے آئے تھے مجھ سے کہا کہ ایک مرتبہ ان کے پاس جو آخری دو پاؤنڈ بچے تھے وہ خرچ کرکے انھوں نے میری کتاب ''اور ڈان بہتا رھا...،، کا ترجمہ خرید لیا تھا۔

جب ہمارے دور اور نزدیک کے قارئین سوویت ادب اور اس کے ارتقاء پر غور و خوض کریں تو انہیں یہ ہرگز فراموش نہ کرنا چاہئے کہ سوویت مصنفین کے پیش نظر صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے: اپنے عظیم عوام اور اپنی عظیم پارٹی کے مفادات کی خدمت کرنا۔

۱۹۵۲ء

یوکرینی عوام، خوش رہو!

قدیم کیئف، اس کی یادگاروں، باغات و چمن، اس کی حسین عمارتوں، خوبصورت سڑکوں کے حسن اور شان و شوکت نے مجھ پر جادو سا کر دیا ہے۔ شہر کی شاہراہ کرشچاتیک جہاں موٹرکاروں اور لوگوں کی آمد و رفت کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری رہتا ہے، بےحد حسین ہے۔ نووارد کے دیدۂ حیرت کو دو کیئف نظر آتے ہیں — سلافی قوموں کا گہوارہ قدیم کیئف اور نیا سوویت شہر، جدید کیئف جو ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے شان اعجازی کے ساتھ پھیلتا چلا جا رہا ہے۔

اس شہر کے عشق میں مبتلا ہوئے بغیر کیسے رہا جا سکتا ہے جس کی رعنائی دل کی انتہائی گہرائیوں تک ہیجان پیدا کر دیتی ہے!

دریائے دنیپر پہنچنےوالی ڈھلانوں، دریا کے گھاٹ اور پرلے کنارے دور بہت دور حد نظر پر جنگل کے تاریک سے خدوخال کے حسن کے بھلا کیا کہنے! زورآور دریائے دنیپر مجھے اتنا ہی عزیز ہے جتنا میرا اپنا پرسکون دریائے ڈان۔

خداداد صلاحیتوں کے مالک اور عظیم جفاکش یوکرینی عوام سے، جو تمام سوویت برادر قوموں کے دوستدار کنبے میں اپنے مقدر کی تشکیل کررہے ہیں اور کرۂزمین پر زندگی، امن اور مسرت کی خاطر کام کر رہے ہیں، میرا پیار اب اور بھی زیادہ گہرا ہوگیا ہے۔

یوکرینی لوگ شفیق اور گرمجوش ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ توانا اور جری بھی۔ یوکرین سے میرا لگاؤ اس وجہ سے اور بھی زیادہ مستحکم ہے کیونکہ میری ماں یوکرینی تھیں، چیرنی گوف علاقے کی کسان۔

یوکرینی ادب نے جو اپنی وضع کا نرالا اور متنوع ادب ہے، بڑی بڑی ارتقائی منزلیں طے کی ہیں اور صرف ہمارے ملک میں ہی نہیں بلکہ اس کی سرحدوں سے باہر بھی دور دور تک شہرت اور

ظاهر ہے کہ یہ حال ہم میں سے ان کا ہوتا ہے جو بڑے بڑے ناول لکھتے ہیں، افسانے نہیں جن میں قدرتی طور پر کم محنت لگتی ہے اور وقت بھی اتنا کم کہ کوئی مقابلہ نہیں۔

جہاں تک میرا تعلق ہے میں آج کل ''جب زمین جاگی،، کی دوسری اور آخری جلد اور ''وطن کے مجاہد،، کے پہلے حصے پر بیک‌وقت کام کر رہا ہوں۔

آپ کی اجازت سے میں مدت کا کوئی وعدہ نہیں کرونگا۔ مجھے اپنے تلخ تجربے سے بخوبی علم ہے کہ اپنے لئے کوئی حدآخر مقرر نہیں کی جاسکتی، بشرطیکہ احساس ذمہ‌داری کہ کیا اور کیسے لکھ رہے ہیں، دغا نہیں دے جاتا۔

ناول لکھنے کے کام کو تعمیر سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ لیکن جہاں تعمیر میں ہر معمار کے کام اور فرائض کی ٹھیک ٹھیک وضاحت کردی جاتی ہے وہاں ادیب کے ساتھ یہ ہوتا ہے کہ اسے صرف خود اپنے اوپر ہی بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ وہی سامان‌تعمیر فراہم کرنےوالا ہوتا ہے، وہی میر تعمیر بھی، راج مزدور اور انجینئر بھی۔ اور بدقسمتی سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تعمیر کے دوران میں کسی نہ کسی وجہ سے میر تعمیر کو منصوبے تبدیل کرنے پڑجاتے ہیں اور راج مزدور جو کچھ بنا چکتا ہے اس کو ڈھانا پڑتا ہے۔ تو پھر ایسے کام میں کوئی حدآخر کیسے مقرر کر سکتا ہے؟

ممکن ہے میں غلطی کر رہا ہوں، مگر جب کبھی میں مصنف کی اس محنت کے بارے میں غور کرتا ہوں جو کسی طرح بھی سہل نہیں ہے تو سوچتا ہوں: ''تعمیر،، میں تاخیر ہونے دو بشرطیکہ جو ''عمارت،، تمہارے ذہن اور تمہارے ہاتھوں سے تخلیق ہو قابل اعتماد، ٹھوس اور دیرپا ہو۔

اور اگر ہمارا ذہین قاری تمہاری کتاب پڑھنے کے بعد دوسرے ہی دن اس کو فراموش نہیں کردیتا (ایسا بھی ہوتا ہے کہ فراموش کردے)، اگر بعد میں پھر کبھی اس کتاب کو دوبارہ پڑھنے کو اس کا جی چاہے اور اس کے بارے میں کچھ مزید غوروفکر کے بعد اگر وہ مصنف کے بارے میں کہتا ہے: ''واللہ اس شخص نے تو خوب کام کیا ہے، اچھی کتاب ہے!،، — تو یہ مصنف کے لئے باعث اطمینان ہوگا اور اعلی‌ترین اخلاقی صلہ، کیونکہ اس کے لئے قاری کا فیصلہ افضل ترین اہمیت رکھتا ہے۔

مجھے بڑا افسوس ہے کہ اس سفر میں دوسرے یوکرینی شہروں اور گاؤں کے دورے پر میں نہ جا سکا اور محض کیئف اور مضافات کی سیر کی۔ لیکن کیئف بہرحال، یوکرین کا محور ہے اور اس میں آئینے کی طرح یوکرینی عوام کی خوش‌حال زندگی اور تہذیب و تمدن اور اس شاندار سفر کا عکس نظر آتا ہے جو اکتوبر انقلاب عظیم کی فتح کے بعد سینتیس برس میں انہوں نے طے کیا ہے۔

یوکرین کو میرا سلام‌احترام۔ یوکرینی عوام خوش رہو۔

۱۹۵۴ء

رسالہ ''انوسترانایا لتیراتورا،، کے ایڈیٹر کے نام ایک خط

پیارے ساتھی ایڈیٹر!

میں نے ابھی ابھی آپ کے رسالے کا پہلا شمارہ پڑھا اور میرا خیال ہے کہ اس نے اپنے پیش نظر جو مقاصد رکھے ہیں وہ کارآمد ہیں۔ اس رسالے کے ذمے یہ فرض عائد ہوا ہے کہ وہ سوویت قارئین کو دوسری قوموں کے ادبوں کے متعلق بہتر معلومات بہم پہنچائے اور ان کو سمجھنے میں مدد دے۔

اس سلسلے میں میں بعض مسئلے اٹھانا چاہتا ہوں جو مجھے ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

میرے ذہن میں ہمارے بین‌الاقوامی تہذیبی تعلقات اور سوویت اور غیرملکی ادیبوں کے درمیان تجربے کا وسیع تبادلہ ہے۔

ہر قوم کی، چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، خود اپنی تہذیبی قدریں ہوتی ہیں۔ انسان کی عظیم روحانی دولت ان قدروں پر ہی مشتمل ہوتی ہے۔

ہماری قوم نے عالمی تہذیب کے خزانے میں اپنا خاصا بڑا حصہ جمع کیا ہے۔ ہماری قوم اپنی اس خواہش میں فیاض اور بے لوث رہی ہے کہ اپنی قومی تہذیب کو بحیثیت مجموعی کل نوع انسانی کی دسترس میں پہنچا دے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم نے دوسری قوموں کے تہذیبی کارناموں کی بڑی قدر کی ہے۔ اس کا قائل‌کن ثبوت ہمارے تہذیبی کارکنوں کے غیرممالک کے متعدد اور بارہا دوروں سے ملتا ہے اور

ناموری حاصل کرلی ہے۔ یوکرینی مصنفین کی تیسری کانگرس جس میں ایک سہمان کی حیثیت سے میں شرکت کر رہا ہوں اس کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے۔

کیئف میں جن یوکرینی ادیبوں سے میری ملاقات ہوئی ان سے میں بہت ہی متاثر ہوا۔ خاص طور سے نسبتاً نوجوانوں میں بہت سے ہونہار ادیب خداداد صلاحیتوں اور اپنے انوکھے انداز بیان کے مالک ھیں۔ میں بہت سے مصنفین کے نام گنوا سکتا ہوں: اولیس گونچار جو واقعی اچھے ناول نگار ھیں، وادم سوبکو، خداداد صلاحیت رکھنے والے ڈرامہ‌نویس واسیلی منکو، جواں‌سال شاعر دمیتری پاولچکو اور پرزور مزاح‌نگار اوستاپ وشنیا۔

جہاں تک یوکرینی ادبی تنقید کا تعلق ہے، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں کوتاھیاں ھیں۔ یوکرینی نقاد انہیں خامیوں میں مبتلا ھیں جن میں ان کے روسی رفقائے کار۔ مجھے اس کا جو سبب نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے نقاد سطحی تبصرہ‌نگاروں کا رویہ اپنا لیتے ھیں اور بس اس سے آگے نہیں جاتے۔

ہونہار نقادوں کا باریک‌بینی کے ساتھ انتخاب کرکے ان کو تربیت دینی چاھئے اور ان کے کام کے لئے تمام لوازمات فراہم ہونے چاھئیں۔ مثلاً سب جانتے ھیں کہ تعمیرات کی ہر سوویت تنظیم کو مختلف کاموں سے متعلق تمام سہولتیں فراہم ہوتی ھیں۔ تو کیوں نہ سوویت ادبی نقادوں کے لئے ایسے حالات فراہم کئے جائیں کہ وہ حقیقی معنوں میں کارآمد، سنجیدہ کام انجام دے سکیں؟ میرا خیال ہے کہ یہ مسئلہ عرصہ دراز سے معرض التوا میں پڑا ہوا ہے اور اس کو حل کرنے میں اب زیادہ دیر نہ کرنی چاھئے۔ میرا خیال ہے کہ ڈرامہ نگاروں کو جو معاوضہ دیا جاتا ہے اس کو گھٹا دیں اور اس طرح جو رقم بچے اس سے نقادوں کے لئے بڑی رقم اکٹھی کی جائے۔

روسی میں اور سوویت یونین کی قوموں کی دوسری زبانوں میں یوکرینی ادب کے ترجموں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ جو ترجمے ہمیں سہیا ہوتے ھیں ان میں سے یوکرینی گفتگو کی نغمگی غائب ہوچکی ہوتی ہے۔

آپ سب کی طرح مجھے یقین ہے کہ عنقریب یوکرینی مصنفین ہمارے ملک اور کل ترقی‌پسند نوع انسانی کو بہت سی شاندار تصنیفات پیش کرینگے۔

ہماری کوششیں، اگر قطعی نہیں تو، عملاً ضرور ناکام ہو گئیں۔
یہ درست ہے کہ ہر سال سیاحوں یا مہمانوں کی طرح سوویت یونین آنے والے ہزاروں لوگوں میں امریکی کچھ کم نہیں ہوتے تھے۔ لیکن ابھی تھوڑے ہی دنوں تک جواباً تواضع کی پیش کش نہیں کی جاتی تھی۔
لیکن میں پھر عرض کرتا ہوں کہ آج میں مستقبل کی بات کرنا چاہتا ہوں ماضی کی نہیں۔
میرا یقین محکم ہے کہ اگر ''جذبۂ جنیوا،، بین الاقوامی معاملات کے تمام شعبوں میں کارفرما ہو جائے تو تہذیبی تعلقات کو فروغ دینے کے اچھے امکانات پیدا ہو جائیں گے۔
دنیا کے مصنفین کی اپنی گول میز کانفرنس ہونی چاہئے۔ ہمارے نظریات چاہے مختلف ہوں لیکن عوام کے لئے کارآمد ہونے کی خواہش ہمکو متحد کرے گی۔
سوویت ادیبوں کی بات یہ ہے کہ ہماری پرخلوص خواہش دنیا کے تمام ادیبوں سے اپنے دوستانہ تعلقات اتنے ہی قریبی اور پرزور کرنے کی ہے جتنے مغرب اور مشرق کے بہت سے ملکوں کے مصنفوں سے سال بسال بڑھتے ہوئے تعلقات ہیں۔
مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوگی کہ میرے امریکی، انگریزی، مغربی جرمن اور جاپانی رفقائے کار کی اس سلسلے میں کیا رائے ہے۔
ان ادیبوں کا ذکر میں سب سے پہلے تو اس لئے کر رہا ہوں کہ ان کے ہی ملکوں سے ہمارے جنگ کے بعد کے تہذیبی تعلقات کے سلسلے میں بہت کچھ کرنا باقی رہ گیا ہے۔
یہ تھی وہ پہلی بات جو میں اپنے اس خط میں کہنی چاہتا تھا۔
دوسری بات بعض ان مشوروں کے متعلق ہے جو آپ کے اس نئے رسالے کی آئندہ سرگرمیوں کے متعلق پیش کرنے کی میں اجازت چاہتا ہوں۔
میں جو سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ آپ کا رسالہ وہ سب کچھ شائع کیا کرے گا جس پر سچی صلاحیت کی چھاپ ہوگی، وہ سب کچھ جس سے لوگوں کو ایسی زندگی بسر کرنے میں مدد ملے جو انسان کے شایان شان ہو۔
مجھے یقین ہے کہ میری طرح دوسروں کو بھی اس بات سے خوشی ہوگی کہ آپ کا رسالہ ایک ایسا منبر بن جائے جہاں سے وہ لوگ جنہیں جدید ادب کے مفادات دل سے عزیز ہوں، ایک دوسرے سے ہم کلام ہو سکیں۔ اگر آپ کا رسالہ سوویت قارئین (نیز مصنفین) اور

اس خیرمقدم سے جو ہم اپنے غیرملکی مہمانوں کا ہمیشہ کیا کرتے ہیں۔

میں اعدادوشمار کا حوالہ دینا نہیں چاہتا کیونکہ ان کا سب کو بخوبی علم ہے۔ میں قارئین کو صرف اتنا ہی یاد دلانے کی اجازت چاہتا ہوں کہ صرف پچھلے سال، یعنی ۱۹۵۴ء ہی میں ہم نے دس ہزار کے قریب غیرملکی مہمانوں کی آؤبھگت کی۔

دوسری قوموں کے کلچر کے احترام کا بین ثبوت اس حقیقت سے بھی ملیگا کہ غیرملکی مصنفوں کی جو صرف کلاسکی ادب کے خالقوں تک ہی محدود نہیں ہیں، کتابیں سوویت یونین میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

سوویت عوام اپنے غیرملکی تہذیبی تعلقات کو وسیع ترین پیمانے پر نشوونما دینا چاہتے تھے۔ اس خواہش کے پیش نظر ہی سوویت یونین کی اعلی سوویت نے اپنے دوسرے اجلاس میں امسال ۹ فروری کو اپنا وہ مشہور اعلان منظور کیا جس میں بین الاقوامی صورت حال کو معمول پر لانےوالے ایک اہم عنصر کی حیثیت سے بین الاقوامی تعلقات کو تقویت پہنچانے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

میں بھی اعلی سوویت کے میمبروں میں تھا اور میں نے بخوشی اس اعلان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔

اب جبکہ جنیوا کانفرنس* ایک تاریخی حقیقت بن چکی ہے تو یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں رہ گئی کہ وہ کیا چیز تھی جس نے سوویت عوام کو بیرونی ممالک سے تہذیبی تعلقات کو قابل لحاظ توسیع دینے سے باز رکھا۔

نہ ہی یہ کہنے کی چنداں ضرورت ہے کہ ''سرد جنگ،، تہذیبی تعاون سے لگا نہیں کھاتی۔

ایک زمانہ تھا جب ہمارے تہذیبی تعلقات ریاستہائے متحدہ امریکہ جیسے ملک سے بڑھنے اور مضبوط ہونے شروع ہوئے تھے۔ امریکی اور سوویت عوام کے درمیان فوجی تعاون نے جنگ کے بعد ہمارے دوستانہ تعلقات کی توسیع کے تمام لوازمات فراہم کردئے تھے۔

افسوس جو ہوا وہ یہ نہ تھا۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ سے تہذیبی تعلقات کو فروغ دینے کی

---

*چار ریاستوں کی حکومتوں کے سربراہوں کی کانفرنس جو ۱۹۵۵ء میں ہوئی۔ (ایڈیٹر)

کوئی مقررہ نشانہ نہیں ہے۔ میں اس میں صرف اتنا اضافہ کر سکتا ہوں کہ اگر ہمارا کوئی منصوبہ ہوتا بھی تو وہ کسی صورت سے پورا نہ ہوتا کیونکہ ہمارے کام کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے اور کیونکہ، سچی بات تو یہ ہے کہ ادیب ہمارے ملک میں سب سے زیادہ غیرمنظم لوگ ہیں۔

سوویت انجمن مصنفین کے ۳۲۴۷ میمبر ہیں اور ۵۲۶ امیدوار میمبر یعنی مجموعی طور پر ۳۷۷۳ افراد ایسے ہیں جن کا اوزارقلم ہے اور جن میں کم و بیش ادبی صلاحیت موجود ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں یہ تعداد اچھی خاصی قوت ہے مگر اس تعداد سے آپ کو مرعوب ہونے یا باغ باغ ہو جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ بارعب محض معلوم ہوتی ہے، کیونکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ادیبوں کی یہ فہرست بڑی حد تک ''مردہ روحوں،، پر مشتمل ہے۔

افسوس کہ ہمارے زمانے میں چیچی کوف* کے قبیل کے لوگ موجود نہیں ہیں، ورنہ سورکوف نے تاجرانہ ہوشیاری کے اپنے سارے فقدان کے باوجود صرف ایک ہی بڑے سودے میں سوویت انجمن مصنفین کے لئے وارے نیارے کر دئے ہوتے۔

خود اپنی ہی پارٹی سے براہ‌راست گفتگو کرتے ہوئے مجھے ادب کے متعلق حقیقت بیانی سے کام لینا ہے خواہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔ میرا پارٹی فرض مجھے مجبور کرتا ہے میں ایسا ہی کروں، اسی طرح ایک ادیب کا میرا ضمیر اور میرا ایمان بھی مجھے مجبور کررہا ہے۔

کامریڈ سورکوف نے، قدرے بےربط انداز میں بتایا ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں سوویت ادب میں کیا کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں، اور صورت حال کی وضاحت کرنے کے لئے کتابوں کی اس بڑھتی ہوئی تعداد کا ذکر کیا ہے جس میں ''سوویتسکی پیساتل،، نے ۱۹۵۳ء، ۱۹۵۴ء اور ۱۹۵۵ء میں کتابیں شائع کی ہیں۔ سیدھی سادی زبان میں اس کو اشک شوئی کہتے ہیں۔

ادب میں ترقی کا پیمانہ یقیناً کتابوں کی وہ تعداد نہیں ہوتی جس میں کتابیں سال بھر میں شائع ہوتی ہیں۔ ان کو کہنا چاہئے

---

*چیچی کوف — گوگول کے مشہور افسانے ''مردہ روحیں،، کا مرکزی کردار۔ (ایڈیٹر)

ان ناولوں اور افسانوں کے مصنفین کے درمیان جن کی تخلیقات آپ شائع کرتے ہوں، خط و کتابت کا انتظام کردے تو ہم ممنون احسان ہوں گے۔

عین ممکن ہے کہ ان تخلیقات کا مطالعہ کرنے اور ان سے مختلف قوموں کی داخلی دنیا، جدوجہد اور امیدوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے بعد سوویت قارئین کے ذہن میں ایسی باتیں آئیں جو بیرونی ادیبوں کے لئے باعث دلچسپی ہوں۔ دنیا کا کوئی بھی ادیب اپنے قارئین کی رائے سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ ''اور ڈان بہتا رہا...'' کے متعلق غیرملکی قارئین کی، جن میں امریکی بھی شامل ہوتے تھے، رائے پوری پڑھ لینے کے لئے میں کتنا بیچین رہا کرتا تھا۔ رائیں متضاد ہوا کرتی تھیں۔ ان کی سب ہی باتیں ایسی نہیں ہوتی تھیں جنہیں میں تسلیم کرلیا کرتا۔ لیکن پھربھی وہ بڑی کارآمد ہوتی تھیں۔

مجھے یقین ہے کہ جس قسم کی خط و کتابت کا میں نے مشورہ دیا ان سے ہماری تہذیبیں مالامال ہو جائیں‌گی اور ان میں باہمی مفاہمت کو بڑھاوا ملیگا۔

یہ خط میں اس احساس کے ساتھ لکھ رہا ہوں کہ اگر نیک خواہش اور باہمی احترام موجود ہو، تو اب وہ وقت آگیا ہے جبکہ نہایت وسیع پیمانے پر تہذیبی تعلقات بڑھانے کا کام شروع کیا جاسکتا ہے — بشرطیکہ کوششیں باہمی ہوں۔

قدرتاً میں یہ تمام باتیں نہایت عمومی طور پر کر رہا ہوں کیونکہ میری رائے یہ ہے کہ خاص بات اصولی طور پر متفق ہونے کی ہے اور باقی ساری باتیں اپنے آپ طے ہوتی رہینگی۔

اپنے غیرملکی رفقائےکار کی رائے معلوم کرکے مجھے بڑی مسرت ہوگی۔

مجھے پورا پورا یقین ہے کہ ہم ایک مشترک زبان تلاش کر ہی لیں گے۔

۱۹۵۵ء

سوویت کمیونسٹ پارٹی کی بیسویں کانگرس میں تقریر
(اقتباس)

ڈیلی گیٹ ساتھیو!

جیساکہ آپ کو ہمارے سیکریٹری کامریڈ سورکوف پہلے ہی مطلع کرچکے ہیں، چھٹے پنجسالہ منصوبے کے لئے سوویت ادب کا

کی عظیم‌ترین امیدوں کے مرکز یعنی کمیونزم کے فتح یاب تصورات کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ یہی ہماری کامیابی کا راز ہے۔ اگر کوئی بھی ادیب آج کے دور میں کمیونزم سے دشمنی کے نظریے سے لکھنے کی کوشش کرےگا تو اس کا نام فوراً ہی حقارت کی گمنامی میں دفن ہوکر رہ جائیگا اور الماریوں میں پڑے پڑے اس کی کتاب کی جلدوں میں پھپھوندی لگ جائیگی، اس کو کوئی اٹھاکر بھی نہ دیکھےگا۔ تو آپ نے دیکھا کہ کامیابی کا سہرا اتنا ان کے سر نہیں جنھوں نے لکھا بلکہ ہماری اپنی کمیونسٹ پارٹی کے سر ہے جو اس کوشش کا سرچشمۂ فیضان ہے۔ اور ہم ادیب، قلبی خلوص کے ساتھ اس پر مسرور و مگن ہیں اور دم واپسیں تک لینن کی پارٹی کے نصب‌العین کی اپنی تحریروں سے خدمت کرنے کو اور زندگی اور ادب دونوں میں اس کے نیک مقاصد کی وفاداری سے علمبرداری کرنے کو تیار ہیں۔

پچھلے چند برسوں سے اگر ہماری نثر میں المناک جمود آیا ہوا ہے تو تمثیل نگاری کی کیفیت بھی کچھ امیدافزا نہیں ہے۔ اچھے ڈرامے بہت ہی کم لکھے گئے ہیں اور کورنئی‌چوک اور چند دوسرے تمثیل نگاروں کی سرفروشانہ کوششیں بھی ہمارے تھیٹروں کو ڈراموں کے قحط سے نہیں بچا سکتیں۔ کورنئی‌چوک جفاکش ہیں، مگر کسی بھی یوکرینی کو یہاں تک کہ خود تاراس بولبا* کو اگر بیس آدمیوں کا کام کرنا پڑتا تو دوھرا ہو جاتا۔

گڑبڑ کیا ہے؟ ہمارا ادب پچھڑ کیوں جاتا ہے؟

سب جانتے ہیں کہ لیو تالستائی روسی کسان کی روح سے اس قدر اچھی طرح واقف تھے کہ ہم زمانہ حال کے مصنفوں میں سے کسی کو اتنی واقفیت نہیں ہے۔ گورکی نے سارے روس کا پاپیادہ سفر کیا ہے۔ لیسکوف نے گھوڑا گاڑی سے اور چیخوف نے، اگرچہ وہ شدید بیماری میں مبتلا تھے، انسان سے محبت اور ادیب کے پیشہ‌ورانہ تجسس کی بنا پر ہمت کرکے ساخالین کا سفر کیا۔ مگر آج کے بہت سے ادیب، خصوصاً وہ جو ماسکو میں رہتے ہیں، ایک طرح کے ساحرانہ مثلث میں مقید ہیں: ماسکو — داچا** — ساحلی صحت گاہ اور پھر اسی ترتیب سے

---

*گوگول کی شہرہ آفاق کہانی ”تاراس بولبا“ کا مرکزی کردار۔ (ایڈیٹر)

**داچا — ماسکو کے مضافات میں بنگلہ۔ (ایڈیٹر)

تھا کہ پچھلے بیس برس کے عرصے میں جو اچھی، دانشمندانہ کتابیں شائع ہوئی ہیں ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے اور جو معمولی درجے کی ہیں وہ ان گنت ہیں۔ ایک ہزار ادیبوں کے قلم سے کوئی دس کتابیں بیس برس کے عرصے میں لکھی گئیں۔ کوئی اچھے کام کا تو مظاہرہ نہیں، کیا خیال ہے آپ کا؟ کامریڈ سورکوف کو یہی کہنا چاہئے تھا، حالانکہ یہ آپ سب کو خود معلوم ہے۔

اگر آج بھی جبکہ سوویت عوام دنیا کے سب سے بڑے پن بجلی گھر تعمیر کررہے ہیں، ہمارے مبلغ ایک ایک سے یہی کہتے پھریں، خواہ کوئی کچھ کہے، ہم نے تو ۱۹۳۲ء میں دنیپر پن بجلی گھر تعمیر کیا تھا، تو یہ حیرت کی بات ہوگی۔

اور ہم ادیبوں نے بالکل یہی کیا ہے: بیس تیس برس ہوئے جو کتابیں لکھی تھیں ان سے اپنے لئے ایک ادبی ''دنیپر پن بجلی گھر،، بند تعمیر کرلیا ہے اور جب بھی کبھی کوئی ہم پر زور ڈالتا ہے تو فوراً اس بند کے پیچھے چھپ جاتے ہیں اور وہیں سے اکڑکر کہتے ہیں: ''کوئی کتابیں نہیں ہیں، چہ معنے؟ ہم لکھتے نہیں، یہ کہنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟ ''کلیم سامگین کی زندگی،، کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اور سیرگیئیف — تسینسکی کے ناول؟ اور سیرافیمووچ کا ''آھنی سیلاب،،؟ اور گلادکوف کا ''سیمنٹ،، اور فادیئف کا ''صفایا،،؟ اور لیونوف اور فیدین کے ناول؟ اور فورمانوف کا ''چاپائیف،،؟ اور پانفیروف کا ناول ''بروسکی،،؟ ،، اور ہم مزید ایک درجن ناولوں کے نام گنوا دیتے ہیں جنہیں قارئین نے پسند کیا اور جو زمانے کی دستبرد سے بچے رہے۔ ہر درد کے درمان اس بند کے سایۂ عاطفت میں ہم اور کتنے عرصے پناہ لیتے رہیں گے؟

سنہ تیس کی دھائیوں کے بعد سے اب تک جو عرصہ گذرا اس میں ہمارے کثیرقومی سوویت ادب کی صفوں میں نثر، نظم اور تمثیل نگاری کے نئے اور حیرت انگیز باکمال فنکار آن کر شامل ہوئے۔ یہ کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ اپنے وجود کے پورے عرصے میں ہمارے ادب نے متعدد بیش قیمت تخلیقات ضرور پیش کیں جو دنیائے ادب کی بہترین تخلیقات کی صفوں میں شامل ہو گئیں۔ لیکن پوری دیانت کے ساتھ ہمیں یہ ضرور کہنا چاہیئے کہ ان کے بہترین ادب میں شمار ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ فنی کمال کی وہ کوئی اچھوتی بلندیوں پر پہنچ گئی ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم سب نوع انسانی

پہنچ جایا کرتے ھیں اور ھمارے لئے بڑی شرم کی بات ھے کہ برسر عام پیش ھونے کےلئے مزدوروں کے خزانچی سے جاکر اس کا معاوضہ بھی بےشرمی کے ساتھ وصول کر لیتے ھیں۔ عوامی سرگرمی بااجرت کام کب سے ھوگئی؟ بعض ادیب فوجی اکادمیوں میں حاضر ھونے تک کا معاوضہ لے لیتے ھیں۔ اب وقت آگیا ھے کہ ھم اس شرمناک کیفیت کا خاتمہ کریں۔ وقت آگیا ھے کہ ادب کے تاجروں کو یہ بات سمجھا دی جائے کہ مصنف اور مغنی میں جو اپنی آواز سے روزی حاصل کرتا ھے کچھ فرق ھوتا ھے۔ یہ اصولاً ناقابل برداشت ھے اور اس صورت میں تو اور بھی زیادہ جبکہ کسی کمیونسٹ مصنف کا ھاتھ کسی فیکٹری یا کسی دوسرے کارخانے سے معاوضہ وصول کرنے کے لئے پھیلتا ھے۔

تو پھر یہ ۱۲۰۰ مصنف ماسکو میں کیوں رھتے ھیں؟ یہ لوگ ماسکو سے اتنے کیوں چمٹے رھتے ھیں کہ ٹریکٹر تک ان کو کھینچ کر الگ نہیں کرسکتے؟ ان سوالوں کا جواب مجھ سے تو بن نہیں پڑتا۔ شاید آپ خود اس پہیلی کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ میں تو ایک چیز جانتا ھوں اور وہ یہ کہ تخلیقی قوتوں کی اس قسم کی تقسیم غلط بھی ھے اور نامناسب بھی۔ افسوس کہ یہی حال لینن گراد، کیئف، مینسک، الماآتا اور تمام بڑے بڑے شہروں کا ھے۔ ھر جگہ مصنفین شہروں میں رھتے ھیں اور شاید ھی کوئی ایسا ملے جس کا گھر مزدوروں کی بستی یا کسی گاؤں میں ھو۔

آپ تو کامریڈ نئی کتابوں کی توقع کررھے ھیں مگر میں پوچھنا چاھتا ھوں کس سے؟ ان مصنفوں سے جو کسی اجتماعی کاشتکار یا مزدور کو ٹھیک طرح سے نہیں جانتے؟ ان مصنفوں سے جو اپنی بھٹوں میں یا اپنے گھونگوں میں دبکے بیٹھے ھیں؟ مگر یہ مقولہ تو سب کو مدتوں سے معلوم ھے کہ جو کچھ تلاش نہیں کرتا وہ کچھ نہیں پاتا۔ اگر دنیائے ادب میں صورت حال عنقریب مستقبل میں بنیادی طور پر تبدیل نہیں ھوتی تو کوئی کام کی، اچھی کتاب شائع نہیں ھوگی اور یہ تبدیلی صرف پارٹی ھی لا سکتی ھے۔ اس پر میں بعد میں روشنی ڈالوں گا۔

میں چند الفاظ کامریڈ غفوروف کی تقریر کے یا یوں کہنا چاھیئے ان کی تقریر کے اس حصے کے جواب میں کہنا چاھونگا جس میں انہوں نے ادب کا ذکر کیا ھے۔ کامریڈ غفوروف نے بالکل درست کہا ھے

واپسی: ساحلی صحت‌گاہ — داچا — ماسکو ۔ کیا ان کو اپنی زندگی اور اپنا جوہر اس طرح برباد کرنے پر شرم نہیں آئی؟

تقریباً ۱۲۰۰ مصنفین ماسکو میں رہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ قدرتی بات ہے ۔ ماسکو راجدھانی ہے، ملک کا سب سے بڑا تہذیبی اور صنعتی مرکز ۔ غیرفطری بات یہ ہے کہ راجدھانی میں رہتے ہوئے بھی ادیب اپنے آپ کو زندگی سے کسی نہ کسی طرح الگ تھلگ کرلیتے ہیں ۔ اپنی سادہ لوحی کے باعث میرا خیال تھا کہ میرے مصنف رفقائے کار جو ماسکو میں رہتے ہیں بڑے بڑے صنعتی کارخانوں سے اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح وابستہ رکھتے ہوں گے، کسی نہ کسی فیکٹری کی پیداوار میں اور مزدوروں کی ضرورتوں اور منصوبوں سے بھی عملی دلچسپی لیتے ہوں گے ۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں نکلی ۔ وہ جنگل میں تو رہتے ہیں مگر درخت ان کو نہیں دکھائی دیتے ۔

کتنے مصنفین ہیں جنھوں نے کسی صنعتی مزدور سے، کسی انجینئر سے، پیداوار میں کسی جدت پیدا کرنےوالے سے یا کسی فیکٹری کے پارٹی کارکن سے دوستی کی اور اس کے بال بچوں میں گھل مل کر رہے؟ معدودے چند ۔ ورنہ تو ژوربین* کنبے کے افراد کو ماسکو میں اس سے بہت پہلے تلاش کرلیا گیا ہوتا جبکہ کوچیتوف نے لینن گراد میں ڈھونڈ نکالا ۔ میرے مصنف بھائیوں میں سے ہر ایک اپنے آپ میں مگن رہتا ہے، غیروں کی طرح، یکا و تنہا بوڑھوں کی طرح ۔ مجھے یہ جان کر افسوس ہوا کہ ماسکو کے بڑے بڑے کارخانوں میں سے کسی کا کوئی ادیب دوست نہیں ہے — نہ ''سیرپ ی مولوت،، کے مزدوروں کا، نہ استالن سے موسوم موٹرکار کارخانے کا**، نہ ''دینامو،، یا ''کراسنی پرولتاری،، کارخانوں کے مزدوروں کا ۔ کاش میری بھول ہو مگر مجھے اندیشہ ہے کہ یہی بات ''فریزر،، پر، ''تریخگورنایا سنوفکتورا،، ' ''کالیبر،، ' بال بیرنگ کارخانے اور ماسکو کے دوسرے کارخانوں پر بھی صادق آتی ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ وقتاً فوقتاً مہمانوں کی حیثیت سے یا یوں کہنا چاہیئے کہ مہمان اداکاروں کی حیثیت سے بڑے بڑے کارخانوں میں

---

*لینن گراد کے مشہور مصنف کوچیتوف کے ناول ''ژوربین کنبے،، کا حوالہ ۔ (ایڈیٹر)

**اب لیخاچیف نامی کارخانہ ۔ (ایڈیٹر)

پیچھے گھسٹنے کا نہیں بلکہ گرماگرم بحث کرنے کا عادی ہوں۔ آپ نے تخلیقی حرارت کا ذکر کیا ہے۔ تو آپ جانتے ہی ہیں یہ ایک ایسی چیز ہے جس کی تھرمامیٹر سے پیمائش نہیں کی جاسکتی لیکن جب معاملہ بحث کا ہوتا ہے تو آپ کا اور میرا ایک ہی درجۂحرارت ہوجاتا ہے اس کے باوجود کہ آپ ہیں تاجک اور میں روسی۔ آپ قاری ہیں اور میں مصنف اور ہم مظاہرہ کرچکے ہیں کہ آپ کس قدر گرمجوشی سے مجھ سے محبت کرتے ہیں اور کس قدر پرجوش طریقے سے میں آپ کے جذبات کا جواب دیتا ہوں۔ اور آپ پھر بھی کہیں گے کہ ادیب اپنے قارئین کی محبت کا جواب محبت سے دینے میں کوتاہی کرتے ہیں! جی کوتاہی، جبکہ ہمیں بلڈوزیر کھینچ کر ایک دوسرے سے علحدہ کریں! تو پھر، میں امید کرتا ہوں کہ اب، کامریڈ غفوروف، ہم برابر سرابر ہو گئے؟ تو پھر ٹھیک ہے۔

پچھلے کچھ عرصے سے کتابیں شائع نہیں ہوئیں، میرا مطلب ہے کہ ایسی کتابیں جو پڑھنےوالے عوام الناس کے دل و دماغ پر چھا جائیں۔ قصور کس کا ہے؟ یقینی بات ہے کہ سب سے پہلے تو خود ادیبوں کا، لیکن تہذیبی مسائل سے متعلق پارٹی تنظیمیں اور قارئین بھی اس کے قصوروار ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قارئین ایک کنارے تماشائی بنے کھڑے رہیں۔ ادب کی موجودہ صورت حال کے ایک حد تک وہ بھی ذمہ‌دار ہیں، کیونکہ ادب، جیساکہ سب جانتے ہیں، خود ادیبوں کا ذاتی کاروبار نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کا معاملہ ہے اور سب سے پہلے تو پارٹی کا معاملہ ہے۔

ادبی جدوجہد کے مختلف مرحلوں میں جب نظریاتی غلطیاں کی جارہی تھیں تو پارٹی نے انجمن مصنفین کو بارہا سدھارا اور ہمیں اس کے قوی اور راہبر ہاتھ کا ہمیشہ سہارا رہا ہے جس کے لئے ہمیں پرخلوص اظہار ممنونیت کرنا چاہیئے۔

لیکن جو چیز واقعی میری سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ ہم سب نے اس حقیقت کو کیسے نظر انداز کر دیا کہ ادیبوں کی خاصی بڑی تعداد عرصہ‌دراز سے زندگی سے الگ تھلگ رہ رہی ہے اور ادب میں اپنا کوئی حصہ ادا نہیں کر رہی! یاد ہے اس وقت کیا ہوا تھا جبکہ ہمارے کچھ اجتماعی فارموں کے صدر اور مشین اور ٹریکٹر اسٹیشنوں کے ڈائریکٹر — ان تیس ہزار میں سے جنہیں پارٹی نے دیہات میں بھیجا تھا — ان شہروں ہی میں جہاں وہ پہلے کام کرتے

که ادب پچھڑ گیا ہے۔ لیکن کامریڈ غفوروف کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس کی وجہ تخلیقی سرگرمی میں کمی آنا ہے۔ وجہ یہ نہیں ہے۔

ادب کا زندگی سے تھوڑا پچھڑنا لازمی ہوتا ہے کیونکہ سنجیدہ ادب، بقول لیو تالستائی خبرنامہ نہیں ہوتا۔ ایک بڑی تصویر بنانے میں سخت محنت درکار ہوتی ہے اور بہت سارا وقت بھی چاہیئے ہوتا ہے۔

کیا کامریڈ غفوروف کو معلوم ہے کہ الیکسئی تالستائی نے اپنے ناول ''آزمائش،، پر بائیس برس کام کیا تھا اور اپنے ناول ''پیٹر اول،، پر پندرہ برس کام کرتے رہے اور آخر ناتمام چھوڑا؟

ایسی بہت ساری مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور ان سب کا، مجھے یقین ہے کہ کامریڈ غفوروف کو علم ہے۔ مگر مجھے یقین ہے انہیں اس دلچسپ یوکرینی کہاوت کا علم نہیں ہے: ''جلدی کا بچہ اندھا پیدا ہوتا ہے،،۔ اس کہاوت کی دانشمندی کی تصدیق متعدد مثالوں سے کی جاسکتی ہے جبکہ عجلت میں لکھی ہوئی کتابیں اندھی یا کانی کھدری پیدا ہوئیں اور انہیں قارئین کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

ہمارے سوویت قارئین سست رفتاری پر تو ہمیں معاف کردیں گے مگر ہماری خراب، بےلطف کتابوں کو ہرگز نہیں بخشیں گے۔

آپ کی طرح، کامریڈ غفوروف، میں بھی بیل گاڑی کی جگہ ہوائی جہاز سے سفر کرنے کو ترجیح دوں گا، یعنی روزمرہ کی زندگی میں۔ لیکن ادب میں، وہ بھاری بھرکم بوجھ لیکر جس کی لوگوں کو بہت ضرورت ہوتی ہے، میں بیل گاڑی سے سفر کرنا پسند کروں گا۔ بہ نسبت اس کے کہ ناخون کاٹنے سنوارنے کی مختلف ریتیوں اور طرح طرح کے چھوٹے چھوٹے برشوں اور سنگھار کے اسی قسم کے سامان کا ہلکا پھلکا سا تھیلا لیکر ہوائی جہاز سے پرواز کروں۔ ابھی جب ہم اسی موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں تو میں یہ بھی کہتا چلوں کہ جب ہم ادبی موضوعات کا ذکر کر رہے ہوں تو بعض اوقات بہتر یہی ہوتا ہے کہ لاابالی تتلی کی طرح اڑنے پھرنے کے بجائے دھیمی چال سے ایک ایک قدم بمشکل اٹھاتے ہوئے آگے بڑھیں۔

پیارے کامریڈ غفوروف، مجھے غلط مت سمجھئیگا اور میری حد سے زیادہ مناظراتی جذباتیت کو معاف کر دیجئیگا۔ مگر میں بھی، آپ ہی کی طرح جنوبی باشندہ ہوں اور میں بھی مخالف کے پیچھے

جبکه اس کی پوری زندگی ایک تخلیقی سفر ہونی چاہیئے؟ یا اس سے بھی مزیدار یہ کہ: ''انجمن مصنفین کے سیکریٹری کی ایک سال کی تخلیقی رخصت منظور کی گئی ہے۔ ،، اگر یہ اس بات کا صاف صاف اعتراف نہیں تو کیا ہے کہ ''تخلیقی رخصت،، سے قبل موصوف مصنف نے کچھ لکھا نہیں کیونکہ وہ کسی اور کام میں مصروف تھے! چنانچہ بات سے بات پیدا ہوتی چلی گئی۔ فادیئف خاصے جاہ طلب جنرل سیکریٹری ثابت ہوئے اور اجتماعی قیادت کے اصول کو تسلیم کرنے سے انہوں نے کنی کاٹی۔ دوسرے سیکریٹری ان کے ساتھ مل کر کام نہ کرسکے۔ یہ معاملہ پندرہ برس تک گھسٹتا رہا۔ مشترک کوشش سے ہم نے فادیئف کو اپنی تخلیقی زندگی کے پندرہ بہترین برسوں سے محروم کردیا اور نتیجے میں ہمیں نہ جنرل سیکریٹری ملا اور نہ مصنف۔ کیا ہم وقت رہتے فادیئف کو خبردار کرکے یہ نہ کہہ سکتے تھے: ''تصنیف کے کاروبار میں جاہ طلبی کسی کام کی نہیں۔ انجمن مصنفین فوج کی کوئی ٹکڑی نہیں ہے، اور تادیبی بٹالین تو کسی طرح بھی نہیں ہے اور کامریڈ فادیئف ادیبوں میں سے کوئی بھی آپ کے سامنے آکر اٹین‌شن کھڑا نہیں ہوگا۔ آپ ذہین اور خداداد صلاحیتوں کے مالک ایک مصنف ہیں، آپ کو صنعتی موضوع سے دل‌چسپی ہے۔ تو پھر کیوں آپ ماگنی‌توگورسک، سویردلوفسک، چیلیابنسک یا زاپوروژیئے میں جاکر تین چار سال نہیں رہتے اور مزدور طبقے کے بارے میں ایک اچھا ناول کیوں نہیں لکھتے؟،،

کیا ہوا جو اس طرح ہم جنرل سیکریٹری فادیئف سے محروم ہوگئے ہوتے، کیونکہ پھر ہمیں ادیب فادیئف تو مل گیا ہوتا اور ہم نے اس کا ایک نئی کتاب کے ساتھ استقبال کیا ہوتا جو ممکن ہے ان کے ناول ''صفایا،، سے برابر ہوتی۔

ان پچھلے پندرہ برسوں میں فادیئف نے کیا کیا؟ کیا انہوں نے نظریاتی اور سیاسی اعتبار سے انجمن مصنفین کی رہبری کی؟ نہیں، ہمارا ہمیشہ عقیدہ رہا ہے اور اس کا معقول جواز موجود ہے کہ ہماری رہبری پارٹی کرتی ہے۔ برسوں تک فادیئف ادبی مباحثوں میں حصہ لینے میں، رپورٹیں پیش کرنے میں، رہائشی مکانات ادیبوں میں تقسیم کرنے میں مصروف رہے اور کبھی ایک لفظ نہیں لکھا۔ ان کے پاس کتابیں تصنیف کرنے جیسی ''مہمل باتوں،، کے لئے وقت ہی نہیں تھا۔ لیکن جب چند برس کے لئے، ۱۹۴۴ء کے شروع سے، ان کو

تھے اپنے پرانے گھروں میں رہے جانے کی کوشش کی تھی اور کبھی کبھار اجتماعی فارم یا مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن میں آ کر اپنی صورت دکھا جایا کرتے تھے۔ ملک گیر پیمانے پر پوری ایک تحریک شروع کردی گئی تھی! ''پراودا،، نے اس کے متعلق بار بار لکھا اور تمام اخبارات کو چوکنا کردیا گیا۔ رائے عامہ نے ان لوگوں کی سخت مذمت کی جو ان اداروں سے دور رہنا چاہتے تھے جن کا انہیں انتظام کرنا تھا۔ اور ادھر ھمارے مصنفین ھیں جو برسہا برس سے اپنے ادبی سرچشموں سے دور رہتے ھیں اور انہیں کوئی ایک لفظ تک نہیں کہتا، جیسے یہ بالکل ٹھیک بات ھو، جیسے کہ مجاھدوں کی دوسری صف ایک عارضی مقام نہ ھو بلکہ مستقل جائے رھائش ھو۔

انجمن مصنفین کے سارے کام کو پرعزم طریقے سے دوبارہ منظم کرنا چاھئے۔ کیا آپ پر یہ چیز عیاں نہیں ھے کہ گورکی کی وفات کے بعد سے اب تک ادیبوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ان کے کندھوں کے برابر بھی پہنچ سکتا ھو؟ ھم میں کوئی بھی ایسا نہیں ھوا ھے اور نہ غالباً کبھی ھوگا جو اس بے پناہ محبت میں گورکی کی ھمسری کر سکے جو ھمارے ملک کے اندر اور بیرونی ممالک کے مزدور طبقے میں ان کو حاصل تھی، وہ محبت جو ان کو خود اپنی زندگی کی وجہ سے اور اپنی تحریروں کے باعث حاصل ھوئی تھی۔

گورکی کی وفات کے بعد ھم نے کیا کرنے کا فیصلہ کیا تھا؟ ھم نے فیصلہ کیا تھا کہ انجمنِ مصنفین کی ایک اجتماعی قیادت قائم کی جائے جس کے سربراہ کامریڈ فادیئف ھوں۔ مگر اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ھوا۔ اس دوران میں یہ ایک تخلیقی انجمن سے جو اس کو دراصل ھونا چاھئے تھا رفتہ رفتہ بدل کر ایک انتظامیہ تنظیم بن گئی اور اس حقیقت کے باوجود کہ سیکریٹریٹ اور نثر، نظم، تمثیل نگاری اور تنقید کے شعبے اپنے اپنے جلسے باقاعدہ منظم کرتے رہے، ٹکنیکی عملہ کل وقتی کام انجام دیتا رھا، اور پیغام رساں ادھر سے ادھر دوڑ دھوپ کرتے رہے — کتابیں کوئی بھی نہ نکلیں۔ ھمارے جیسے ملک کے لئے سال بھر میں چند اچھی کتابوں کی اشاعت مایوس کن حد تک قلیل ھے۔

ایسے جملے جو میری سماعت کو قدرے عجیب لگتے ھیں ادیبوں کے زبان زد ھوگئے ھیں مثلاً: ''فلاں فلاں صاحب تخلیقی دورے پر گئے ھیں،،۔ کوئی مصنف ''تخلیقی دورے،، پر کیوں جائے

کے سربراہ ہوگئے تو حالات مختلف ہو جائیں گے؟ قطعی نہیں۔ سب کچھ وہ کا وہی رہیگا۔

نہایت ضروری چیز یہ ہے کہ ادیبوں کو حد سے زیادہ جلسوں، ہر اس چیز کے ہنگاموں اور شورغوغے سے محفوظ رکھا جائے جو اپنے خاص کام یعنی کتابیں لکھنے سے ان کا دھیان ہٹائے۔ ویسے ہی ہم اس حقیقت کے باعث بہت سی چیزوں سے محروم رہ گئے کہ لیونوف، تیخونوف، فیدین اور انہیں جیسے دوسرے بڑے بڑوں نے اپنا بیش قیمت وقت ہر طرح کی نشستوں پر ضائع کیا جس کے بجائے زندگی کا مطالعہ کرنے اور لکھنے کے لئے ان کے پاس خالی وقت ہونا چاہئے تھا۔ وقت آگیا ہے کہ اس چیز کا خاتمہ کریں۔ قارئین چاہتے ہیں کہ ہم انہیں کتابیں پیش کریں، جلسوں کی تقریریں نہیں۔ انتہائی ضرورت اس بات کی ہے کہ ادیبوں کو زندگی سے براہ راست تعلق میں لایا جائے۔ ان کو زندگی کا پوری طرح سامنا کرنا چاہیئے۔ یہ کرنے کے لئے خاص قراردادیں منظور کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔

میرا خیال ہے کہ زیادہ آسان یہ ہوگا کہ انجمن سے یہ کہا جائے کہ وہ انفرادی طور پر ہر ایک سے دریافت کرکے ادیبوں کی خواہش واضح کرے۔ بہرحال یہ تو ہو نہیں سکتا کہ سب ہی بڑے بڑے شہروں میں رہنا چاہتے ہوں اور تبدیلی کی خاطر باہر جانے کی جرأت ہی نہ کریں۔ کیوں نہ ہم ان مصنفوں کی مدد کریں جو اجتماعی فارم یا ریاستی فارم کے موضوع سے متعلق ناولوں پر سنجیدگی سے کام کرنے کی خاطر اپنی پسند کے کسی دیہی مقام میں رہنے تین چار سال کے لئے جانا چاہتے ہوں؟ ان کے رہنے کو ہم مکان بنا دیں جہاں وہ جی بھر کر بیٹھے لکھتے رہیں۔ یہ کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ وہ ماسکو، مینسک، کیئف یا جس شہر سے بھی وہ گئے تھے وہاں جب چاہیں آئیں گے لیکن بیشتر وقت وہ اپنے آئندہ ناولوں کے مرکزی کرداروں کے ساتھ گذاریں گے اور یہ کامیابی کی ایک ضمانت ہوگی۔ انجینئروں اور ٹکنیکی ماہروں کے لئے ہم مکان ضرور بناتے ہیں یا نہیں؟ تو کیوں نہ مصنفوں کے لئے بھی ایسا ہی کریں۔ اس کی بات میں اس لئے کر رہا ہوں کہ مصنف کا کام گھریلو دھندے کی طرح کا ہوتا ہے۔ اگر وہ مواد کی تلاش میں باہر گھومتا نہیں پھر رہا تو گھر میں بیٹھا لکھا کرے گا اور اس کے کام کو کام کرنے کے معمولی دن کے گھنٹوں میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے، اجتماعی رہائشی

سیکریٹری کے فرائض سے سبکدوشی حاصل ہوگئی تو وہ فوراً ہی کام میں جٹ گئے اور نہایت ہی مختصر عرصے میں ایک بہترین ناول کراسنوڈان کے ''قافلہ شہیدوں کا،، لکھ ڈالا۔ ہم نثرنگاروں میں سے کسی میں نوجوانوں کے متعلق پرجوش انداز میں لکھنے کی وہ خداداد صلاحیت موجود نہیں ہے جو فادیئف میں ہے اور ''قافلہ شہیدوں کا،، میں ان کا یہ جوہر پوری آب و تاب سے کارفرما نظر آتا ہے۔

چند برس گزرے اور ایک بار پھر ادیب فادیئف غائب ہوگئے اور ادب کے منتظم فادیئف پھر نمودار ہو گئے۔ واقعی کبھی کبھی کیسے کیسے تغیرات سے سابقہ پڑا کرتا ہے! اور وہ عجوبۂ روزگار جہاں ایسے تغیرات رونما ہوتے ہیں یہاں سے تھوڑی ہی دور ہے — سڑک وروفسکی پر۔

کیا اس انتظامیہ کام کے لئے ہماری پارٹی میں ان سے کچھ کم قابلیت کا آدمی نہیں مل سکتا؟ اور اگر آپ مجھے اس طرح کہنے کی اجازت دیں کہ فادیئف ادیبوں کی ٹولی کے آرٹ ڈائریکٹر ہیں، تو یہ بھی درست نہیں ہے۔ فیدین، گلادکوف، لیونوف یا کوئی اور بڑا ادیب فادیئف کے پاس آکر یہ نہیں پوچھتا ہے کہ ناول کیسے لکھے جائیں۔ ہم میں سے ہر ایک کا اپنا علحدہ انداز بیان ہے، دنیا کا اپنا علحدہ تصور ہے، اپنا طرز ہے اور فنی خوبیوں کے مسائل کے سلسلے میں فادیئف کبھی بھی ہمارے لئے سند نہیں ہو سکتے اور نہ ہی کبھی تھے۔ نثرنگار کبھی بھی فادیئف کے پاس نہیں گئے اسی طرح جس طرح کہ یاکوب کولاس، ریلسکی، تی‌چینا، تواردوفسکی، تیخونوف، مارشاک، ایساکوفسکی، شیپاچیف اور دوسرے بڑے شعراء میں سے کوئی بھی سورکوف سے اصلاح لینے نہیں آتا۔ سب جانتے ہیں اور سورکوف کو خود بھی بخوبی علم ہے کہ آرکسٹرا میں ڈھول، مجیروں اور اسی طرح کے ضرب لگاکر بجائے جانےوالے سازوں کے علاوہ بھی کچھ چیزیں ہوتی ہیں۔ تو سورکوف سے بھلا وہ کیا اصلاح لیتے؟ مگر یہ حقیقت ہے کہ کیا شاعر، کیا نثرنگار، کیا نقاد اور کیا تمثیل‌نگار، سب ہی گورکی کے متلاشی رہتے تھے... اگر فادیئف اور سورکوف جیسے ادبی قائدین کے پاس ان کے رفقائےکار میں سے کوئی بھی اپنے مسائل لیکر نہیں آیا یا کسی کا آنے کا ارادہ نہیں ہے تو سوال کیا جا سکتا ہے، ایسے قائدین کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اگر، مثلاً شولوخوف یا سیمونوف انجمن

کی فکرمندیوں اور ضرورتوں میں خود کو ذاتی طور پر ملوث پاتا ھے اور پھر کتاب لکھتا ھے وھی حقیقی کتاب ھوتی ھے، اس قسم کی جو قارئین کے دلوں میں گھر کرلیتی ھے۔

مثلاً کیوں نہ پانفیروف جو وادیٔ والگا کے باشندے ھیں، چند سال جاکر ساحل والگا پر رھیں اور ایسا ناول لکھیں جسے پڑھکر قارئین کو احساس ھو کہ ان کے لئے بھی یہ عظیم الشان دریا ''والگا میا،، ھے کوئی ممیری چچیری خالہ نہیں؟ پاؤستوفسکی کو صحیح روسی زبان پر بےپناہ عبور حاصل ھے اور انہوں نے مشاھدے کی دقیق نظر پائی ھے۔ پابندی کے ساتھ ھر سال وہ میشچیرا کے نشیبی علاقوں میں آتے ھیں جن کی یہاں کامریڈ لاریونوف نے اس قدر حسین منظرکشی کی ھے۔ کیوں نہ پاؤستوفسکی کو دریائے اوکا کے ساحل پر کہیں ھمیشہ کے لئے بس جانے میں مدد دی جائے؟ مجھے یقین ھے کہ جب مچھلی کے شکار کے شوقین پاؤستوفسکی کی بنسی کے کانٹے میں دیر تک کوئی مچھلی سنہ نہ ماریگی تو وہ اپنے آس پاس اجتماعی فارم کے منظر کو ایک فنکار کی نظر سے بیٹھے دیکھتے رھیں گے۔ اس مشاھدے اور غوروفکر میں واقعی ایک اچھی کتاب کی توقع مضمر ھے۔ پیروینتسیف بھی چاھیں تو تھوڑے دنوں کے لئے ماسکو کو خیرباد کہہ سکتے ھیں اور اپنی جنم بھومی کوبان میں جاکر پھر بس سکتے ھیں۔ خداداد صلاحیتوں کے شاعر سرگیئی واسی‌لیئف صرف ایک مختصر عرصے کے لئے علاقۂ کرگان میں اپنی جنم بھومی میں جاکر رھے تھے اور اچھی نظمیں لیکر لوٹے تھے۔ اگر وہ زیادہ عرصے تک وھاں قیام کریں تو نظموں کا ایک سلسلہ تخلیق کرسکتے ھیں یا شاید کوئی طویل نظم۔ پرمیتین کو بھی جو علاقۂ الطائی کے رھنےوالے ھیں اپنے وطن واپس پہنچ جانے سے نقصان کی بہ نسبت فائدہ زیادہ ھوگا اور چند برس ھی میں ھمارے پاس ایک کتاب کا اور اضافہ ھوجائیگا۔ بابائیوسکی نے بالکل بجا طور پر یہ فیصلہ کرتے ھوئے کہ ان کے ناول ''طلائی ستارہ بردار،، پر چوتھا استالن انعام نہیں ملیگا، تین سال کے لئے چین کی راہ لی ھے، بہرحال افواہ یہی ھے۔ اور ھاں اگر وہ ھمارے دوست چینی کسانوں کے بارے میں ایک اچھا ناول لیکر واپس آئے تو یہ ھم سب کے لئے ایک شاندار تحفہ ھوگا۔

ان تمام ادیبوں کو جو ھمارے وسیع‌ترین ملک میں کسی بھی جگہ دوبارہ بسنے کا فیصلہ کریں ٹھیک طرح سے امداد فراھم کرنی

مکان میں مثلاً ریاستی فارم کے ایسے گھر میں رہنے کا خیال قطعی ناقابل قبول ہے۔ باورچی خانے میں ایک پرائمس اسٹو سنسنا رہا ہو اور گھر میں صرف ایک بیوی ہو — خواہ وہ باتونی ہی کیوں نہ ہو — تو یہ الگ بات ہے۔ پھر شوہر کو ضروری سکون اور اطمینان کے لمحات ملجانے کی قوی امید ہے۔ لیکن اگر باورچی‌خانے میں آٹھ پرائمس اسٹو سنسنا رہے ہوں اور آٹھ عورتیں بات‌چیت کرنے میں ایک دوسری پر سبقت لیجانے کی کوشش کر رہی ہوں تو یہ بالکل دوسری بات ہوتی ہے۔ یہاں کام کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

جو مصنفین یہ طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کریں انہیں سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے اور اپنے ساتھ پورے گھربار کو لیجانا چاہئے — بیوی، بچے اور روزمرہ ضرورت کا سارا سامان۔ یہ کوئی ''تخلیقی دورہ،، نہیں ہے۔ اچھا تو یہ ہو کہ انہیں اپنی اپنی کاریں خریدنے میں بھی مدد دی جائے تاکہ وہ اپنے کام کی ضرورت کے مطابق ادھر ادھر گھوم پھر سکیں اور سڑک کے بیچ میں کھڑے ہوکر گزرتی ہوئی کاروں کو روکنے کی زحمت سے بچ جائیں یا انہیں مقامی سرکاری فارم اور مشین اور ٹریکٹر اسٹیشن کے ڈائریکٹر، ضلع پارٹی کمیٹی کے سیکریٹری یا علاقائی سوویت کے صدر کی مرضی کا ہمیشہ تابعدار نہ رہنا پڑے۔

ظاہر ہے کہ سب کے سب ادیبوں کو گاؤں کی راہ نہ لینی چاہئے۔ صرف ان کو ہی جانا چاہئے جو اجتماعی فارم کی زندگی کے بارے میں براہ‌راست معلومات حاصل کرنا چاہتے ہوں۔ جو مصنف مزدور طبقے کے متعلق یا شہری دانشوروں کے متعلق لکھنا چاہتے ہوں وہ سوویت یونین کے کسی بھی صنعتی مرکز یا شہر میں بخوشی جاکر رہ سکتے ہیں۔

جو مصنف پارٹی کا میمبر ہے وہ اپنے منتخبہ دیہی مکان میں پہنچنے کے بعد مقامی پارٹی تنظیم میں شامل ہو جائیگا اور کسی نہ کسی ایسے کام میں ہاتھ بٹائیگا جو اس کے اپنے خاص کام میں دخل انداز نہ ہو۔ بےپارٹی ادیب خدمت‌عامہ کا کوئی فرض اپنے ذمہ لینے سے انکار نہیں کرےگا۔ جہاں تک مواد کا تعلق ہے وہ اس کو وہاں بہت مل جائیگا۔ غور سے دیکھئے اور آپ کے چاروں طرف جو کچھ ہو رہا ہے اس پر گرفت حاصل کرنے کی کوشش کیجئے! جب کوئی مصنف حقیقی معنوں میں عوام کی زندگی بسر کرتا ہے، ان پر جو پڑتی ہے وہ خود بھی بھگتتا ہے، ان کی خوشیوں پر خوش ہوتا ہے، اور ان

سوویت ادیبوں کی پہلی کانگرس کے بعد گورکی نے کہا تھا: ''ہمیں بہترین مصنفوں کی پوری ایک فوج بنانی چاہئے — ضرور بنانی چاہیئے!'' گورکی کے ان الفاظ کو، ڈیلی گیٹ ساتھیو ہمیں کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ یاد ہے، جب گورکی کی وفات ہوئی تو سیر گیئیف — تسینسکی، پرشوین، سیرافیمووچ، یاکوب کولاس، گلادکوف، اولگا فورش، ساریئتا شاگینیان، ویریسائف، الیکسئی تالستائی، نوویکوف — پریبوئی، ششکوف وغیرہ جیسے ادیب باقی تھے۔ وہ آزمودہ‌کار ہیں۔ دوسرے بعد میں آکر شامل ہوئے۔ وہ اب مشہور و معروف ادیب ہیں۔ مگر ان میں سے سب سے کم عمر بھی پچاس برس کی عمر سے تجاوز کر چکے ہیں۔ ہماری جگہ لینے والے سست رفتاری سے آرہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء کے یعنی جس سال گورکی کا انتقال ہوا تھا اس کے مقابلے میں آج نوجوان ادیبوں کی تعداد کم ہے۔ مستقبل کے مصنفوں کو تربیت دینے کی ہماری ذمہ‌داری اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ ادیبوں کی نشو و نما سست رفتاری سے ہوتی ہے اور ہمیں ابھی سے سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیئے کہ چھٹے پنجسالہ منصوبے کی مدت ہی میں نہیں بلکہ آج سے بیس یا پچیس برس بعد جبکہ آج کے سربرآوردہ مصنفوں میں سے شاید ہی کوئی باقی ہو، ادب میں کیا ہو رہا ہوگا۔

ہم سب اپنی عظیم کمیونسٹ پارٹی کی اولاد ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک، پارٹی کے بارے میں سوچتے ہوئے نہایت ہی جذباتی انداز میں اپنے آپ سے دل ہی دل میں کہتا ہے: ''تم ہماری ماں کی طرح ہو، تم نے ہمیں پروان چڑھایا، تم نے ہمیں آہن پیکر فولاد بدن بنایا، تم ہمیں زندگی کی واحد سچی شاہراہ پر لئے جا رہی ہو۔'' اور اب میں آخر میں کہونگا:

میری پارٹی! تمہارا طاقتور اور صاف طور پر سوچنے سمجھنے والا اجتماعی ذہن ہے اور ماں کا ہاتھ ہے جو بیک وقت سخت گیر اور پرشفقت ہو سکتا ہے۔ اپنے مصنفوں کو مدد کرنے کی کوئی نہ کوئی راہ تم نکال ہی لوگی اور جب وہ تمہاری توجہ اور فکرمندی سے جوش و خروش حاصل کرکے اپنی نئی تصنیفات شائع کریں‌گے جو تمہارے، ہماری پارٹی کے، اور ہمارے ملک کے، شایان‌شان ہوں‌گی تو ممنون احسان سوویت اور غیرملکی قارئین سب سے پہلے تمہارے ہی شکرگذار ہوں‌گے۔

۱۹۵۶ء

چاهئے کیونکہ یہ سمجھنا کہ تمام مصنفوں کے پاس روپئے پیسے کی ریل پیل ھے، محض خام خیالی ھے۔

یہاں تو ساتھیو، میں آپ سے یہ کہہ رہا ھوں مگر دل میرا اپنی جگہ نہیں ھے: وہ کامریڈ زویریف، ھمارے فولادی وزیر مالیات بیٹھے میرے دوررس منصوبوں کی باتیں سن رھے ھیں اور مجھے یقین ھے کہ انہوں نے مجھے اپنے طبقاتی دشمن کے صف میں پہنچا دیا ھوگا۔ ان کے دل کو اطمینان دلانے کے لئے میں کیا کہہ سکتا ھوں؟ میرے منصوبے حقیقت بننے سے پہلے تو بہت سارے اگر، مگر ھیں۔ دوسرے اگر دوبارہ بسائے ھوئے ھر تین میں سے ایک مصنف ایک اچھی کتاب پیش کردے جس کی انتہائی ضرورت ھے تو زرکاری بہت بڑی حد تک حق بجانب ثابت ھوجائےگی۔ اور پیارے کامریڈ زویریف کو واقعی مطمئن کرنے کے لئے میں یہاں اور ابھی نہایت سنجیدگی کے ساتھ حلفیہ کہہ سکتا ھوں کہ اجتماعی کاشتکاروں کی ملکیت کے پھلوں کے درختوں کے موضوع پر ’’پراودا‘‘ کو آئندہ تاحیات کبھی کوئی خط نہیں لکھوں‌گا۔ بہرحال، اس سے میرا واسطہ بھی کیا ھے؟ اس موضوع پر کامریڈ زویریف کو مجھ سے زیادہ ماھرانہ معلومات حاصل ھیں۔ ان کو معلوم ھے کہ کاشتکاروں کو کب اپنے پھلوں کے درخت کاٹ ڈالنے اور کب نئے پودے لگانے چاھئیں۔ چنانچہ یہ میں ان پر ھی چھوڑتا ھوں۔

میں آپ کی توجہ خاص طور پر نوجوان ادیبوں کی جانب مبذول کرانا چاھتا ھوں جو انجام‌ِکار ھماری جگہ لیں گے۔ پرانی نسل کے ادیبوں کے متعلق اور ان میں سے کچھ کے لئے ماحول کی تبدیلیوں کے بارے میں جو کچھ میں نے کہا ھے وہ نوجوانوں میں سب سے زیادہ خداداد صلاحیت رکھنے‌والوں پر پوری طرح صادق آتا ھے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ انہیں زیادہ مالی امداد کی ضرورت ھوگی اور ان کے ساتھ زیادہ احتیاط برتنی چاھیئے۔ ان میں سے قریب قریب سب کے سب روزی کمانے کے لئے کام کرتے ھیں اور اگر وہ اپنا پہلا ناول یا افسانوں کا پہلا مجموعہ لکھنے کے لئے اپنا کام چھوڑ دیں تو وہ بڑی مشکل میں پھنس جائیں‌گے۔ ان میں کچھ کو، مثلاً معلموں کو اسکول لازمی طور پر ھمیشہ کے لئے چھوڑنا پڑےگا کیونکہ بیک‌وقت معلم اور مصنف ھونا ناممکن ھے۔ یہ بات ھر اس شخص پر بخوبی واضح ھوگی جس کو سرسری طور پر بھی معلوم ھے کہ ھمارے اسکول کے معلموں کا کام کا دن کس قدر زبردست مصروفیت کا ھوا کرتا ھے۔

سونڈے کھنچ آئے تھے لیکن انجام‌کار ان میں سے بیشتر کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ سوشلزم کے سرگرم‌عمل معمار بن گئے۔
مجھے ہنگری کی دلیر اور جفاکش قوم کی واضح دانشمندی پر پرخلوص عقیدہ ہے اور مجھے تہ‌دل سے امید ہے کہ آنے والے سال میں ہنگری کے محنت‌کش عوام، ہنگری کی مزدوروں کی سوشلسٹ پارٹی کی قیادت میں دنیا کی ترقی اور امن کے کام میں شایان شان حصہ ادا کریں گے۔

۱۹۵۶ء

عوام کی حکمت کا مخزن

کسی قوم کی سب سے بڑی دولت اس کی زبان ہوا کرتی ہے۔ انسان کے علم و دانش اور تجربے کے لاانتہا خزانے الفاظ کی شکل میں رہتی دنیا تک باقی رہنے کے لئے ہزارہا برس کے دوران جمع ہوتے رہتے ہیں۔ اور شاید ایسی کوئی اور شکل نہیں ہے جس میں عوام کی دانش اس قدر پرزور اور جامع طریقے سے منعکس ہوتی ہو، اور اس کی قومی تاریخ، سماجی تعلقات، طرز زندگی اور دنیا کے بارے میں نقطۂ‌نظر بلور کی طرح مصفا اور مجتمع شکل میں تلاش کئے جا سکتے ہوں جیسے کہ کہاوتوں میں۔
مختصر و جامع اور پر تخیل روسی زبان ضرب‌الامثال کی دولت سے خاص طور پر مالامال ہے۔ ان کی تعداد ہزاروں ہزار پہنچتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پر لگا کے پرواز کرتی ہوئی ایک صدی سے دوسری صدی میں، ایک نسل سے دوسری نسل میں داخل ہوتی چلی آئی ہیں اور یہ بہ‌بال‌وپر علم و دانش جس منزل کی جانب محو پرواز ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہے...
کہاوتوں کا جنم مختلف زمانوں میں ہوا تھا اور ان میں رنگا رنگ انسانی تعلقات کی تجسیم ہوا کرتی ہے۔ وقت کے نہاں خانوں سے وہ ہمارے پاس لوگوں کی مسرتوں اور المیوں، آنسوؤں اور قہقہوں، محبتوں اور دشمنیوں، عقیدوں اور بےعقیدگیوں، سچ اور جھوٹ، دیانتداری اور دغابازی، جفاکشی اور کاہلی، انصاف اور تعصبات کی کہانیاں لیکر آتی ہیں۔

یوکرین کا سپوت

ہماری مادروطن کے ان سپوتوں کے نام سنہری حروف سے لکھے ہوئے ہیں اور ان کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہیگا جن کے دل و دماغ، علم و دانش، فکر و نظر اس قوم کے لئے وقف تھے جس نے ان کو جنم دیا تھا۔ ایسا ہی ایک نام ایوان فرانکو ہے...

ان کی پیدائش کا جشن صدسالہ سوویت یونین کے لوگ، سب سے پہلے میرے ہمقوم یوکرینی منا رہے ہیں۔

لاکھوں کی ہم‌آہنگ آواز میں میں بھی اپنی سنحنی آواز ملانا اور اس عظیم ادیب، یوکرین کے سپوت سے اپنی محبت اور عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

۱۹۵۶ء

ہنگری کے ادیبوں سے خطاب

ہنگری کے واقعات سے میں، ایک سوویت شہری، مصنف اور کمیونسٹ، اپنی روح کی گہرائیوں تک پریشان ہوں۔ یہ واقعات اس لئے اور بھی زیادہ تکلیف‌دہ ہیں کہ ان کے ظہور میں آنے کی بڑی وجہ عوامی ہنگری کے سابقہ حکمرانوں کی جنہیں سوشلزم کی تعمیر اور عوام کے لئے بہتر زندگی کی تخلیق ٭کا فرض سونپا گیا تھا، شدید غلطیاں تھیں۔

ایک اور وجہ جن کے باعث یہ واقعات تکلیف‌دہ ہیں یہ ہے کہ میرے رفقائےکار، ہنگری کے ادیب جنہوں نے ان غلطیوں کے خلاف جرأت کے ساتھ آواز بلند کی تھی، رجعت پسندی کے خلاف عین‌وقت پر، جبکہ یکسر پراگندگی کا دور دورہ تھا، اپنی آوازیں بلند کرنے میں ناکام رہے۔

صورت حال اس وجہ سے ڈرامائی ہو جاتی ہے کہ اس الجھن سے نکلنے کا راستہ بہت سے لوگوں کو نظر نہیں آیا اور بعض لوگوں کو اب بھی صاف نظر نہیں آتا۔ مگر میں تو یہی کہوں‌گا کہ میں رجائیت پسند ہوں۔ اور اپنی رجائیت کی صفائی میں ہنگری کے واقعات کے اور خانہ‌جنگی کے زمانے میں اپنے ڈان دیس میں رونما ہونےوالے واقعات کے درمیان مماثلت واضح کرنا چاہوں‌گا۔ کٹر انقلاب‌دشمنوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی تھے جو وائٹ گارڈوں کی تحریک میں آنکھیں مونڈے

اس طرح وقت کی لہریں کہاوتوں کے زریں ذروں کی ریت کو متواتر دھوتی رہتی ہیں اور سونے کے یہ منتشر ذرات بےشمار نسلوں کی زندگی، جدوجہد اور روایتوں کو منعکس کرتے رہتے ہیں۔

روسی ضرب الامثال اور کہاوتوں کی اشاعت، جو پچھلی صدی میں قرنوں کی سعی و کاوش کے بعد ممتاز ماہر محاورات اور مصنف داھل نے مرتب کی تھیں، قومی تہذیب کی لازوال دولت کے متعلق ہماری معلومات میں اضافہ کرےگی اور ہمیں اپنی بےپایاں اور پرزور زبان پر بہتر عبور حاصل کرنے میں مدد ملےگی۔

۱۹۵۷ء

بحریہ کے نام ایک خط

میرے پیارے ملاح دوستو!

میں آپ کے خط کا اور میرے کام سے آپ نے جس دلچسپی کا اظہار کیا اس کا شکرگذار ہوں۔

آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں نے اپنے داویدوف کو بحیرۂ بالٹک کا ملاح کیوں بنایا۔

داویدوف جیسے لوگ، یوں سمجھئے کہ بہت سارے تھے۔ میں بہت سارے ملاحوں سے ملا، ان سے باتچیت کی اور دیکھا کہ پارٹی نے ان کو جو فرائض سونپے تھے وہ انہیں کس طرح انجام دے رہے تھے۔ اور وہ جہاں کہیں بھی ہوتے اپنی شاندار، انقلابی بحری روایات ہمیشہ رائج کر دیتے۔

اکتوبر انقلاب میں ملاحوں کے کارنامے کی ولادیمیر ایلیچ لینن نے بڑی ہی تعریف کی تھی۔ ویسی ہی بہادری سے وہ خانہجنگی میں لڑے اور سوویت حکومت کی تعمیر میں سرگرم عملی حصہ لیا۔

اسی سے مجھے خیال ہوا کہ داویدوف کو ملاح بناؤں۔ اس شخص میں جو گاؤں اس لئے آیا ہو کہ وہاں کے پہلے اجتماعی فارم کا انتظام سنبھالے جرأت، تحمل، خوش مزاجی، لوگوں میں گھل مل جانے کی صلاحیت اور اجتماعی طور پر زندگی بسر کرنے کا تجربہ بھی ہونا چاہئے۔ یہ تمام خوبیاں اور ان کے ساتھ پارٹی سے اور کمیونزم کے نصب العین سے بےپناہ عقیدت مجھے ان ملاحوں میں نظر آئی جنہوں نے سوویت بحریہ میں تربیت حاصل کی تھی۔

روسی کہاوتوں میں جو چیز بہترین ھے اس سب کو سوویت عوام اپنا لیں گے اور ان میں جو فرسودہ ہو گیا ھے اور نئی دنیا کی تعمیر میں ان کے لئے کارآمد نہیں ہوگا اس کو ترک کردیں گے۔

حب الوطنی کا ھمارا ناز ان جیسی کہاوتوں میں آھنی پیکر اختیار کرچکا ھے: ''جو بھی روسی سرزمین پر قدم رکھے، قدم سنبھال کے چلے،، '' ''اپنے وطن کی سرزمین پر آخر دم تک جم کر کھڑے رھو،، '' ''حق کے لئے لڑنے سے کبھی نہ ڈرو،،۔

ھم ان کہاوتوں کو بھی دوھرائیں گے: ''بیکار یہی چاھیں گے کہ کوئی دوسرا ان کا کام کردے،، '' ''بوجھ اٹھانے سے پہلے اپنی طاقت کا اندازہ کرلو،، '' ''دوسرے کا بوجھ ھلکا معلوم ھوتا ھے،، '' ''لوگوں کو کام کرتے ھوئے دیکھنے سے ھی تمہارا پیٹ نہ بھرےگا،، '' ''ایک گھنٹے کی تاخیر پوری کرنے میں ایک سال لگ جاتا ھے،، '' ''باتیں تیر نہیں ھوتیں، پھر بھی گھائل کر جاتی ھیں،،۔

لیکن ایسی کہاوتیں جن پر قومی عناد، زرخرید کسانی ذھنیت، عورتوں کے حقوق سے نفرت اور مذھبی توھمات کی چھاپ ھوتی ھے — مختصر یہ کہ ایسی کہاوتیں جو عوام کی جن پر کلیسائی، طبقاتی اور نسلی بوجھ لدا ھوا تھا، فطری ذھانت و ذکاوت کا اظہار نہیں کرتیں — ھمارے ھمعمروں کے لئے قطعی اجنبی ھیں۔ اس بوجھ کے خلاف احتجاج کا متعدد نہایت موزوں کہاوتوں میں اظہار ھے جن میں کچھ نہایت ھی تیکھے طنزیہ انداز کی ھوتی ھیں اور کچھ میں افسردہ تلخی کی جھلک ھوتی ھے۔ ان میں سے چند ملاحظہ فرمائیے: ''اگر غریب آدمی اناج مہیا نہ کرے تو مالدار کے پاس کھانے کو صرف پیسہ ھو،، '' ''دھونی زیادہ مت دو ورنہ مقدس تصویریں سیاہ پڑجائینگی،، '' ''مناجات گانے کو تو گا لی، پر بھلا کسی کا نہ ھوا،، '' ''اناج کے گن گاؤ جب کٹ جائے، مالک کے گن گاؤ جب مر جائے،،۔

صدیوں کی سماجی ناانصافی اور جبرو ریاکاری کی پرستش نے لوگوں میں طرح طرح کے توھمات اور جھوٹی کہاوتیں مشہور کردی تھیں۔ پرانی کہاوتوں میں بہت ساری ایسی چیزیں ھوتی ھیں جو صحت مند احساسات کو صدمہ پہنچاتی ھیں۔ لیکن ھماری برق رفتار زندگی ان سب کو پیچھے چھوڑ آئی ھے اور ھمارا نیا سوشلسٹ تجربہ نئی دنیاوی فہم و فراست کو جنم دیتا ھے۔

لیکن یہ امتیاز ان پر ایک حد تک ذمہ‌داری بھی عائد کرتا ھے۔ میں امید کرتا ھوں میرے رفیق‌کار مصنفین اس یاد دھانی کے لئے مجھے معاف فرمائیں‌گے کہ قارئین آج‌کل کے بارے میں نئی کتابوں کے منتظر ھیں۔ نہ ھی ان کو اس مشورے کا برا ماننا چاھیئے کہ ان کو اپنے ھنر کو کمال کے درجے تک پہنچانے کی جستجو برابر جاری رکھنی چاھیئے۔ پرمعنے روسی زبان کے مخزن سے مصنف جو لفظ منتخب کرے اسے ھر بار ایسا ھونا چاھیئے کہ جو براہ‌راست قاری کے دل میں گھر کرلے۔

ڈان کے اپنے ساتھی مصنفوں کو میرا دلی پیغام تہنیت پہنچے!

۱۹۶۰ء

''لتیراتورنایا گزیتا،، کے نامہ‌نگار سے انٹرویو

آپ کے مغربی یورپ کے دورے کا کیا مقصد تھا؟

انگلستان، اٹلی اور فرانس کے میرے دورے کا تعلق خاص طور سے تو ''جب زمین جاگی،، کے دوسرے حصے کی اشاعت سے تھا۔ علاوہ ازیں انگلستان میں مجھے جشن تالستائی میں بھی مدعو کیا گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے میں اس وقت تک لندن نہ پہنچ سکا۔

''جب زمین جاگی،، کا پہلا حصہ، جیسا کہ آپ کو معلوم ھے، قریب قریب تیس برس قبل شائع ھوا — جو تقریباً پورا ایک عرصۂ‌حیات ھے۔ دوسرے حصے کا اب ترجمہ ھوگیا ھے اور وہ انگلستان اور اٹلی میں شائع ھوگیا ھے۔ پیرس میں مجھے بتایا گیا کہ فرانسیسی ترجمہ جلد ھی یعنی موسم بہار تک شائع ھو جائیگا۔

یہ کتاب کن اشاعت گھروں نے شائع کی اور یورپ کے قارئین نے اس کا کیسا استقبال کیا؟

انگلستان میں مشہورو معروف ''پٹنام،، اشاعت گھر نے۔ میں نے اٹلی میں ''ایدیتوری ریئونیتی،، کو اپنی تمام کتابوں کو عالمی منڈی کے لئے شائع کرنے کے حقوق دے رکھے ھیں۔ اور فرانس میں ''جب زمین جاگی،، کی اشاعت کا اھتمام پیرس کے سب سے بڑے ناشرین ''گالیمارد،، کر رھے ھیں۔ قابل‌ذکر بات یہ ھے کہ جنگ سے بہت عرصہ قبل

آپ کے خط کے جواب میں میرا خیال ہے کہ میں بس یہی کہہ سکتا ہوں۔

ہماری مسلح فوجوں کی چالیسویں سالگرہ کے موقع پر ہمارے ظفرمند ملاحو تمہیں میرا پرجوش سلام۔

۱۹۵۸ء

قارئین آج کل کے بارے میں نئی کتابیں چاہتے ہیں

اس خبر کا کہ رسالہ ''لتیراتورا ای ژیزن،، وقتافوقتاً اپنی صفحات اور پورے کے پورے شمارے روسی فیڈریشن کے مختلف علاقوں اور خوداختیار جمہوریاؤں کے مصنفوں کی تخلیقات کے لئے وقف کیا کریگا، خیرمقدم ہی کیا جا سکتا ہے۔

آئیے ہم سوویت روس کے ادبی نقشے کا جائزہ لیں۔ ماسکو اور لینن گراد ہی وہ دو مقامات نہیں ہیں جہاں وہ کتابیں تصنیف ہوتی ہیں جو ملک بھر میں مشہورومعروف ہیں۔ بعض مصنفین مشرق بعید میں، یورال میں، سائبیریا میں، ڈان، کوبان، والگا اور تیریک کے ساحلوں پر رہتے ہیں اور وہ سب اپنے حقیقت بیان قلم سے پارٹی اور سوویت عوام کے نصب‌العین کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ ان کی سکونت وہ پیمانہ ہرگز نہیں ہے جس سے قارئین ادب میں ان کے حصے کی پیمائش کرتے ہوں۔ مصنفوں کو صدرمقامی اور صوبجاتی کے زمروں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔

اخبار کو چاہئے کہ روس کے ادبی کشت‌زار کو گاہے گاہے دیکھتا رہے اور کھیت کی ایک بھی نالی ایسی نہ رہ جائے جسے دیکھ نہ لیا گیا ہو۔ اسے نئی نئی، ہری کونپلوں کو دیکھنا چاہئے اور اس کو اپنی توجہ سے ان ادیبوں کو محروم نہ رکھنا چاہئے جو بےجتے قطعات پر اگ آتے ہیں۔

قدرتی بات ہے کہ میں اس حقیقت کی جانب سے نگاهیں نہیں چرا سکتا کہ آج کا اخبار ڈان کے ادیبوں کے لئے وقف ہے یعنی ان لوگوں کے لئے جو میرے ہموطن ہیں۔ انہوں نے یہ امتیاز واقعی اپنی محنت سے حاصل کیا ہے کیونکہ ان کی کتابوں میں زندگی کا تنفس ہوتا ہے۔ ہمارے ادب میں ڈان کی پلٹن کو اس کے قدموں کی زوردار چاپ سے فوراً پہچانا جا سکتا ہے۔

میں روم، نیپلز، سلیرنو اور پالیرمو گیا۔ مجھے سائنور انجولیتی سے ملنا تھا جو مصنفوں کی یورپی کمیٹی کے صدر ہیں مگر ان کی علالت کے باعث ملاقات نہ ہوسکی۔ سسلی کا میرا سفر ایک یادگار تجربہ تھا۔ پالیرمو میں خداداد صلاحیتوں کے مصنف دانیلو دولچی سے جنھیں بین‌الاقوامی لینن انعام مل چکا ہے اور ان کے دوستوں اور اہل‌خاندان سے ملاقات ہوئی۔ میں امید کر رہا ہوں کہ سائنور اور سائنورا دولچی اور ایک جمہوریت‌پسند اخبار ''لااورا،، کے مدیراعلی ویتوریو نیستیکو کی مہمان‌نوازی ویشنسکایا میں کرنے کا مجھے موقع ملیگا جہاں میں نے اب کی خزاں میں انھیں مدعو کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی یہ سفر دلچسپ رہا۔ میرے مجموعہ تصانیف کی (میری مراد ہے ''اور ڈان بہتا رہا...،، ' ''جب زمین جاگی،، ' ''مقدر انسان کا،، ' ''وطن کے مجاهد،، غرضیکہ فرانسیسی ناشروں نے میری جو چیزیں شائع کی ہیں ان کی) اشاعت کے سلسلے میں ۱۹۶۲ء کی بہار میں لوئی اراگاں نے مجھے فرانس آنے کی دعوت دی ہے۔ یہ دعوت‌نامہ میں نے قبول کرلیا ہے۔

۱۹۶۱ء

سیمیون داویدوف کے متعلق

(لینن گراد میں کیروف کارخانے کے
مزدوروں سے خطاب سے اقتباس)

پیارے دوستو،

لوگ اکثر مجھ سے پوچھا کرتے ہیں کہ ''جب زمین جاگی،، کا مرکزی کردار سیمیون داویدوف کیروف کارخانے کا مزدور کیوں ہے، اور اس سے پہلے وہ بالٹک کے بیڑے کا ملاح کیوں تھا۔

تیس برس سے زیادہ عرصہ ہوا جبکہ میں نہایت ہی نوجوان مصنف تھا، تو اس طرح میں پیتروگراد کے ترقی‌پسند مزدور طبقے کو اور اس کے شاندار انقلابی کارناموں اور روایات کو بصد احترام‌وعقیدت پیش کرنا چاہتا تھا۔ یہ لینن گراد کے مزدوروں، خصوصاً کیروف کارخانے کے مزدوروں کو میرا خراج تحسین تھا۔

میرا دوسرا خراج تحسین بالٹک کے بیڑے کے بانکے ملاحوں کو پہنچتا ہے۔ کیونکہ ان کے کارناموں اور انقلابی روایتوں کی بھی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔

۱۹۳۰ء کی دھائی میں ''گالیمارد،، نے فرانسیسی قارئین کو میری تصنیفات سے متعارف کردیا تھا اور ۱۹۶۰ء میں انہوں نے ھی ''اور ڈان بہتا رھا ...،، کا آخری حصہ شائع کیا تھا۔

میرے ناشرین نے مجھے بتایا ھے کہ ''جب زمین جاگی،، کا دوسرا حصہ جس تیز رفتاری سے فروخت ھوا وہ قارئین میں اس کی مقبولیت کی توثیق کرتی ھے۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اس ناول پر اخباروں نے بہت کچھ لکھا اور مجھے نہایت مختلف‌الخیال اخبارات کے تبصرے دکھائے جن میں لندن کا ''ٹائمز،، بھی تھا جس کے ''ادبی ضمیمے،، میں میری کتاب پر تبصرہ شائع ھوا تھا۔

دوسرے اور کونسے ممالک آپ کی یہ کتاب شائع کرنےوالے ھیں؟

''ایدیتوری ریئونیتی،، نے ''جب زمین جاگی،، کی اشاعت پر ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا، جرمنی کی وفاقی جمہوریہ، ھالینڈ، اسپین، پرتگال، ارجنٹائن، چلی، برازیل اور دوسرے ملکوں کے مختلف ناشروں سے معاھدے کر لئے ھیں۔ آج کل یونان اور اسرائیل کے ناشروں سے گفت و شنید ھو رھی ھے۔ انگلستان کے اشاعت گھر ''پٹنام اینڈ کمپنی،، نے میرے ناول کے اپنے قدرے بڑے ایڈیشن کے خاصے حصے کو آسٹریلیا، نیوزی‌لینڈ اور بعض افریقی ملکوں میں فروخت کیا ھے۔

آپ کے اور کونسے ناول پچھلے دنوں مغرب میں شائع ھوئے ھیں؟

مجھے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں۔ لیکن یہ مجھے معلوم ھے کہ فرانس کے مشہور ژولیارد اشاعت گھر نے ''اور ڈان بہتا رھا ...،، کی چاروں جلدیں پچھلے سال شائع کی تھیں اور اٹلی میں — یہ بھی پچھلے سال کی بات ھے — ''جب زمین جاگی،، کے علاوہ ''وطن کے مجاھد،، کے ابواب بھی شائع ھوئے اور میرے ''ڈان کے افسانوں،، کی ایک کتاب بھی شائع کی گئی جس میں افسانہ ''مقدر انسان کا،، بھی شامل ھے۔

کیا آپ مختلف مقامات اور لوگوں کے بارے میں اپنے تاثرات بھی ھمیں بتائیں‌گے؟

انگلستان میں کرسمس کی شب کو پہنچا، اور اس لئے مجھے انگریزوں کے تہوار دیکھنے کا موقع بھی مل گیا — یہ وہ زمانہ ھوتا ھے جبکہ شہر قریب قریب اجاڑ ھو جاتے ھیں۔ میں لندن اور ایڈنبرگ گیا اور تھوڑا سا سفر اسکاٹلینڈ کا بھی کیا۔ نو روز کی شب کو میں اٹلی پہنچا جہاں مقامی روایات کے بموجب تہوار بہت دھوم دھام سے منائے جاتے ھیں۔

کمیونزم کے تصورات سے وفاداری

غالباً علم‌وفن کے کسی اور شعبے میں نظریاتی تصادم اتنا شدید نہیں ہوتا جتنا کہ ادب میں ۔ ایک ناول میں جہاں کرداروں کی اندرونی دنیا اور سیاسی رویے کو واضح کیا جاتا ھے ، مصنف اپنی همدردیوں اور بیزاریوں کو چھپا نہیں پاتا یہاں تک کہ ان کو مبہم بھی نہیں کرسکتا ۔ وہ قارئین سے اپنے نظریاتی عقیدے کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا ۔

مصنفین کے بارے میں علیحدہ گفتگو کرنے کے معنے ادب کے بارے میں گفتگو کرنا ھے کیونکہ فنی فکر اور ادبی روایات کے تسلسل سے هم قریبی طور پر باهم وابستہ ہوتے ھیں ۔ هم، مصنف، درحقیقت واحد زنجیر کی مانند ہوتے ھیں جو الگ الگ کڑیوں پر مشتمل ہوتی ھے ۔

دورحاضرہ کی زندگی نے ثابت کردیا ھے کہ صرف وهی آرٹ جو عوام کے مفادات کی خدمت کرتا ھے عوام‌الناس میں زندہ رهیگا اور آئندہ وجود کا مستحق ہوگا ۔ اور یہ قدرتی بات هی ھے کہ اس آرٹ کا مقدر گمنامی اور موت ھے جو صرف ایک طبقے، غلام بنانےوالوں کے طبقے، طفیلی طبقے کی جو تواریخی منظر سے غائب ہو رہا ھے، روحانی ضرورتوں کی تسکین کرتا ھے ۔

جدید ادب کی تاریخ سے یہ بات قطعی واضح ھوسکتی ھے ۔ بونین کو نثر اور نظم دونوں میں خواہ کتنا هی ملکہ کیوں نہ حاصل تھا اسے قریب قریب فراموش کر دیا گیا ھے اور همارے قارئین میں، خصوصاً نوجوانوں میں اسے کوئی جانتا تک نہیں ۔ اور اس کی وجہ یہ نہیں ھے کہ بونین کی تصانیف سوویت یونین میں پھر سے شائع نہیں ہوئیں ۔ شائع ہوتی ھیں ۔ اس کے برعکس گورکی اور سیرافیمووچ فراموش نہیں کئے جائیں‌گے ۔ حالانکہ وہ بونین کے همعصر تھے، ادبی منظر میں وہ ساتھ ساتھ نمودار ہوئے تھے لیکن انھوں نے عوام کی خدمت جن طریقوں سے کی وہ مختلف تھے ۔ اور ان کی تخلیقات کی قدر مختلف انداز میں کی جاتی ھے ۔ بونین کو ان کے ناول ''آرسینیف کی زندگی'' پر نوبل انعام دیا گیا تھا لیکن گورکی کو سویڈن کی اکادمی نے ان کے ناول ''کلیم سامگین کی زندگی'' پر اس انعام سے نہیں نوازا تھا حالانکہ یہ تخلیق اپنے طور پر کامل تھی اور انقلاب سے عین پہلے زارشاهی روس کے سماج کے تمام طبقات اور پرتوں کا اس میں حقیقی طور پر انسائکلوپیڈیائی احاطہ کیا گیا تھا ۔

مجھے فخر ہے کہ سیمیون داویدوف، ''جب زمین جاگی،، کا ھیرو، اس اجتماعی فارم کا صدر جو اس نے ھمارے ڈان دیس میں منظم کیا تھا، آپ میں سے آیا تھا، یعنی یہ کہ وہ آپ میں سے تھا...

مزدوروں کی اس نئی پود کو دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے جن کا تجربہ اور تربیت سیمیون داویدوف کا اور اس کے ھمعمر لوگوں کا مرھون منت ہے، جن کی بہترین روایات ان کو ورثے میں ملی ھیں اور جن کو انہوں نے جاری رکھا ہے۔

ھم ڈان سے یہاں آپ سے صرف اتنا ھی کہنے نہیں آئے ھیں، بلکہ آپ کو اپنے ھاں آنے کی دعوت بھی دیتے ھیں۔ آئیے اور دیکھئے کہ سیمیون داویدوف کے خون‌پسینے سے سینچی ہوئی زمین پر زندگی کس شان سے پھل‌پھول رھی ہے۔

١٩٦١ء

استحکام اور پھر استحکام!

ھمارے پرآشوب زمانے میں امن کے مجاھدوں کا استحکام اور پھر استحکام وقت کا اھم‌ترین مطالبہ ہے۔

میں محسوس کرتا ھوں کہ آج کل دانشوروں کو — ان لوگوں کو جو تہذیب کے میدان میں سرگرم عمل ھیں — ذمےداری کا خاص طور پر بڑا حصہ قبول کرنا چاھئے۔

ایٹم بم ایجاد کرنےوالے ھی کو وہ پہلا شخص ھونا چاھئے جو اس کو ممنوع قرار دے۔ تہذیب کے سچے علمبرداروں نے کبھی بھی اس بات کی وکالت نہیں کی اور نہ ھی کریں‌گے کہ ایٹم کو بنی نوع انسان کے خلاف تباہ کن مقاصد کےلئے استعمال کیا جائے۔

ھمیں اس بات کا قائل ھوجانے کے بارھا مواقع ملے ھیں کہ غضبناک احتجاج نے ان لوگوں کے منصوبے خاک میں ملا دئے جو نیوکلیائی جنگ چھیڑنا چاھتے ھیں۔

تو آئیے ھم دوچند زور شور سے اپنا احتجاج دوھرائیں اور اپنی کانگرس میں کہیں بم ''نہیں چلیگا،،۔

١٩٦٢ء

تیس برس سے بھی زیادہ عرصہ ہوا کہ مجھے کامریڈ سیرافیمووچ سے قریبی طور پر واقفیت حاصل کرنے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ ۱۹۲۰ء میں، ناشرین ''ماسکووسکی ربوچی،، نے میرے افسانوں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا اور سیرافیمووچ کو گیلی پروف دکھائے جنھوں نے انھیں پڑھنے کے بعد کہا کہ وہ نوجوان مصنف سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری ملاقاتیں اکثر ہوتی رہیں۔ ویشنسکایا میں سیرافیمووچ میرے ہاں ٹھہرنے آتے اور جب کبھی میں ماسکو جاتا تو ان سے ملنے ان کے ہاں ضرور جاتا۔ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے ویشنسکایا میں کوئی دس روز ہمارے ہاں قیام کیا۔ دریائے ڈان میں مچھلی کا شکار کھیلنے اور کشتی رانی کرنے ہم ساتھ جایا کرتے اور ان دنوں ڈان دیس میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے سیرافیمووچ ہمیشہ انتہائی جوش و خروش سے دلچسپی لیا کرتے تھے۔

ہماری ملاقات رفتہ رفتہ قریبی دوستی میں بدل گئی حالانکہ ہماری عمروں میں بڑا فرق تھا۔ میری روح کی گہرائیوں میں، اس پیارے، سادہ مزاج انسان کی مورتی براجمان ہے، جس کی آنکھوں میں مخصوص کاسکی قسم کی چمک تھی — ایک عظیم ادیب جو نوآموزوں کو جن میں خود میں بھی شامل تھا، مدد دینے کو ہر وقت تیار رہتا تھا۔

میرا خیال ہے کہ ہمارے ڈان دیس میں آج کل جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہمارے حیرت‌انگیز، ممتاز مصنف اور ہمارے ہموطن کی بہترین یادگار ہے۔

ایک بار ویشنسکایا میں انہوں نے دیکھا کہ ایک چھوٹی سی دخانی کشتی جو دھار کے خلاف پانی کو چیرتی چھپچھپاتی ہوئی جارہی تھی اور اشارہ کررہی تھی کہ کشتیوں کا پل کھول دیا جائے، تب انہوں نے کہا تھا: ''یہ حیرت‌انگیز چھوٹا سا جہاز پرسکون ڈان کے خواب گیں کناروں کو بیدار کر رہا ہے، کیوں نہ؟،،

اگر آج ''پرسکون ڈان،، کے ساحل پر زندگی موجزن دیکھتے تو وہ مرد بزرگ، مجھے یقین ہے کہ بےانتہا خوش ہوتے۔ ہم، قارئین اس عظیم دلنواز شخصیت کو ہمیشہ اپنے دل میں جگہ دیں‌گے اور ان کی تصانیف کو اپنی دولت سمجھ کر رکھیں‌گے جو کمیونزم کے نصب‌العین کی خدمت انجام دیتی ہیں۔

۱۹۶۳ء

اسی طرح سویڈن کے ادبی نکتہ‌دانوں نے گورکی کے بہترین ناول ''ارتاسونوف کنبہ،، کو توجہ کے قابل نہ سمجھا۔ یہی حشر سیرافیمووچ کے ناول ''آھنی سیلاب،، اور سوویت نثرنگاری کی بہت سی دوسری اھم تخلیقات کا ھوا۔

جیسا کہ آپ دیکھیں‌گے بین‌الاقوامی میدان‌عمل میں فنی تخلیقات کو طبقاتی مفادات پیش نظر رکھتے ھوئے پرکھا جاتا ھے۔ اور اس سے بورژوا نظریہ‌دانوں کے ان بیانات کی تردید ھوجاتی ھے کہ خود اپنی نوعیت کے اعتبار سے آرٹ بےطبقاتی ھوتا ھے...

پورے ملک میں سوویت عوام الکساندر سیرافیمووچ کا صدسالہ یوم پیدائش منا رھے ھیں جو ایک ممتاز ادیب تھے اور جن کی تخلیقات گورکی، مایاکوفسکی، الیکسئی تالستائی، یسینین اور سیرگیئیف – تسینسکی کی تخلیقات کی طرح ھمارے ملک میں اور دنیا میں کبھی بھی گوشہ گمنامی میں نہیں پہنچینگی اور آئندہ نسلوں کو یہ تہذیبی خزانہ ورثے میں ملتا رھیگا۔

''آھنی سیلاب،، سوویت ادب کا ھمیشہ ایک اثاثہ رھیگا۔ سیرافیمووچ کی تصانیف میں یہ ناول ھمارے لئے خاص طور پر بیش‌بہا ھے کیونکہ یہ ان دو اولین تخلیقات میں سے تھا – دوسرا فورمانوف کا ناول ''بغاوت،، تھا – جنھوں نے ان سورماؤں کے مؤثر خدوخال پیش کئے تھے جو سوویت اقتدار قائم کرنے‌والے مجاھدوں کی، کمیونزم کے عظیم‌الشان نصب‌العین کے حامیوں کی صف اول میں تھے۔ بڑی بات یہ ھے کہ ان کے نقوش ایک ایسے انداز میں ابھارے گئے تھے جس میں انقلاب کے ان اولین سپاھیوں سے محبت اور احسان‌مندی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

الکساندر سیرافیمووچ کی پوری زندگی، ان کی تخلیقات کی طرح اصلیت میں انقلابی تھی۔ آخر دم تک وہ ترقی، انقلاب اور ھماری کمیونسٹ پارٹی کی دیانتداری سے خدمت کرتے رھے۔

ھم وادی ڈان کے لوگ سیرافیمووچ کے خاص طور پر ممنون ھیں اور دل سے محبت کرتے ھیں، صرف اس لئے نہیں کہ وہ ھماری سرزمین میں پیدا ھوئے اور پرورش پائی بلکہ اس لئے کہ انھوں نے یہاں رھنے‌والے تمام لوگوں سے یکساں شفقت کا اظہار کیا – خواہ وہ ڈان کے کاسک ھوں یا نووارد یا کوبان کے کاسک یا علاقۂ استاوروپول کے کسان جنھوں نے جنوبی روس میں سوویت اقتدار قائم کرنے اور اس کو مستحکم کرنے کے لئے ھتھیار اٹھائے، اپنے خون سے آبیاری کرکے اس کو تقویت پہنچائی۔



سوویت مصنفوں کی چوتھی کل‌یونینی کانگرس میں شرکت کے لئے ماسکو میں ۔

چارلس پرسی اسنو کے نام ایک خط

اپنے پیارے دوست کو میں روستوف کی ریاستی یونی‌ورسٹی سے لسانیات میں ڈاکٹری کی اعزازی سند ملنے پر پرخلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

سوویت عوامی تنظیمیں، جن میں علاقہ روستوف کی تنظیمیں بھی شامل ہیں روس کی ایک قدیم‌ترین ریاستی روستوف یونی‌ورسٹی کی لسانیات کی ڈاکٹری کی اعزازی سند ملنے پر آپ کو جو انگریزی کے ممتاز مصنف ہیں، امن کے اور برطانیہ اور سوویت یونین کے درمیان دوستانہ تعلقات کے سرگرم مجاہد ہیں، پرخلوص مبارکباد پیش کرتی ہیں۔

ہم آپ کو، آپ کی اہلیہ پامیلا ہینسفورڈ جانسن کو اور آپ کے اہل خاندان کو دعوت دیتے ہیں کہ اگر آپ کو سہولت ہو تو امسال مئی میں روستوف بر ساحل ڈان تشریف‌لائیں اور سند قبول فرمائیں۔

عالمی ریکارڈ مات کرنے کے اپنے خروش میں ہم یہاں ساحل ڈان پر توقع کرتے ہیں کہ سینٹ اینڈروس میں میری جو شاندار اور پرخلوص مہمان‌نوازی ہوئی تھی اس پر سبقت حاصل کر پائیں‌گے۔

آپ کا مخلص
میخائل شولوخوف

۱۹۶۳ء

مصنفوں کی کل یورپی کمیٹی کے اجلاس میں تقریر

سوویت انجمن مصنفین کی جانب سے میں آپ کو تہنیت پیش کرنے اور اس موجودہ کانفرنس کی کامیابی کی خواہش کا اظہار کرنے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

مجھے اپنے سامنے جو حضرات نظر آ رہے ہیں — یقیناً میری مراد خواتین سے نہیں ہے — ان میں سے بیشتر اپنی جوانی کی منزل سے گزر چکے ہیں: وہ ایسے مصنف اور نقاد ہیں جن کے شانوں پر عمر اور تجربے کا بار بلاشبہ لدا ہوا ہے۔ اس لئے ہمیں سادہ لوحی سے کام نہ لینا چاہئے: میرے سفیدبالوں کا احترام کرتے ہوئے مجھے سب سے پہلے آپ سے خطاب کرنے کا اعزاز نہیں بخشا گیا ہے، بلکہ محض اس وجہ سے کہ میرے اچھے دوست الیوشا سورکوف اور سوویت انجمن مصنفین کے بورڈ کے دوسرے اراکین جانتے ہیں کہ میں بحث زوردار کیا کرتا ہوں، چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا: ”سوویت مصنفوں میں سب سے پہلے شولوخوف کو بولنے دو۔ اپنی



یورپ کو روانگی۔

یانوش کادر کے مہمان شولوخوف۔

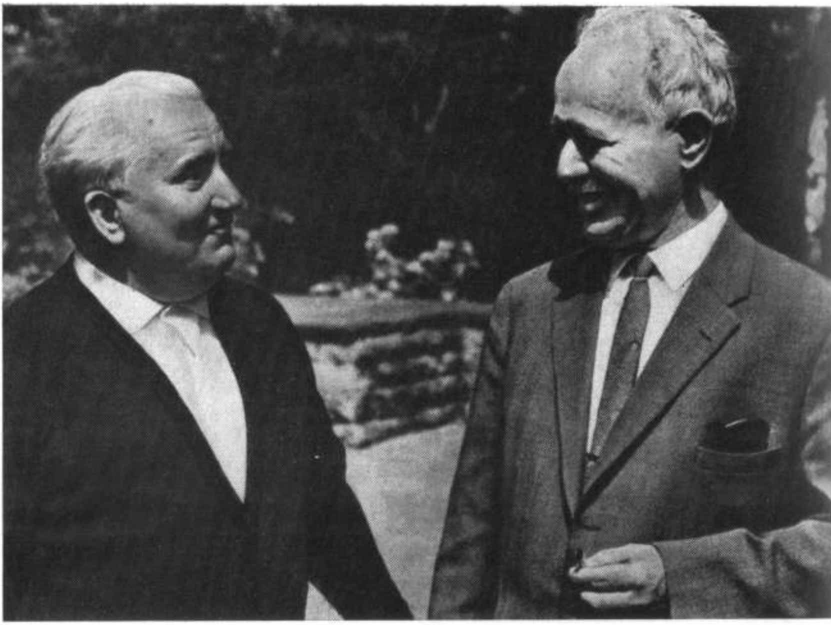




سوویت مصنفوں کی چوتھی کل‌یونینی دنگرس کی صدارتی مجلس
میں شولوخوف ۔

سوشلسٹ محنت کے ھیرو کا خطاب ملنے پر نکولائی پودگورنی
مصنف کو مبارکباد دے رہے ھیں ۔





ڈریسڈین ۔ شولوخوف ویلی بریڈل سے باتیں کر رہے ھیں ۔



جرمن جمہوری ری پبلک ۔
مصنفہ آننا سیگھرس اپنے
مہمان کا خیرمقدم کر
رہی ھیں ۔



قوموں کی دوستی کے ستارے کا اعزاز والٹر البریخت شولوخوف کو
پیش کر رہے ھیں۔



''پراودا'' کے عملے کے مہمان۔

سنسکدیا ۔ پروفیسر ایبرهارڈ برونتگ مصنف کو لائپزیگ یونیورسٹی کی
فلسفے کی اعزازی سند پیش کر رہے ہیں۔





فن لینڈ کے ادیب مارتی لارنی شولوخوف کو ساٹھویں سالگرہ کی مبارکباد
پیش کر رہے ہیں۔



شولوخوف جارجیہ کے چائے کے باغ میں۔

یہاں، قزاخستانی لھاس کے میدانی علاقے میں شولوخوف کو پہلی بار یہ خبر ملی کہ انہیں نوبل انعام ملا ہے۔





جارجیہ ۔ ''دروژبا،، (دوستی) باغ میں درخت لگا رہے ہیں ۔



اسٹاک ہام کے سوویت سفارتخانے میں ۔ شولوخوف اپنی اہلیہ، دو بیٹوں اور دو بیٹیوں کے ساتھ۔
بائیں سے دائیں: الکساندر، سویتلانا، مصنف اور ان کی اہلیہ ماریا پیتروونا، ماریا اور میخائل۔



جہاز ''سویا یارل،، تورکو سے اسٹاک ھام کے لئے روانہ
ھو رھا ہے۔

نوبل انعام کی سند۔





شاہ سویڈن شولوخوف کو مبارکباد دے رہے ہیں ۔

Årets nobelpristagare

MICHAIL SJOLOCHOV



STILLA FLYTER DON

– en nobelpristagares mästerverk – ett av sovjet-litteraturens kraftfullaste verk. En levande och storslagen skildring av Donkosackernas liv under ryska revolutionens och inbördeskrigets dramatiska dagar. **Del 1–5 i presentband 150:–**

Övriga Sjolochov-böcker:

DEN AZURBLÅ STÄPPEN
ETT MÄNNISKOÖDE
Tidens Klassiker 7:50

NYPLÖJD MARK
Tidens Bokklubb Inb. 14:50

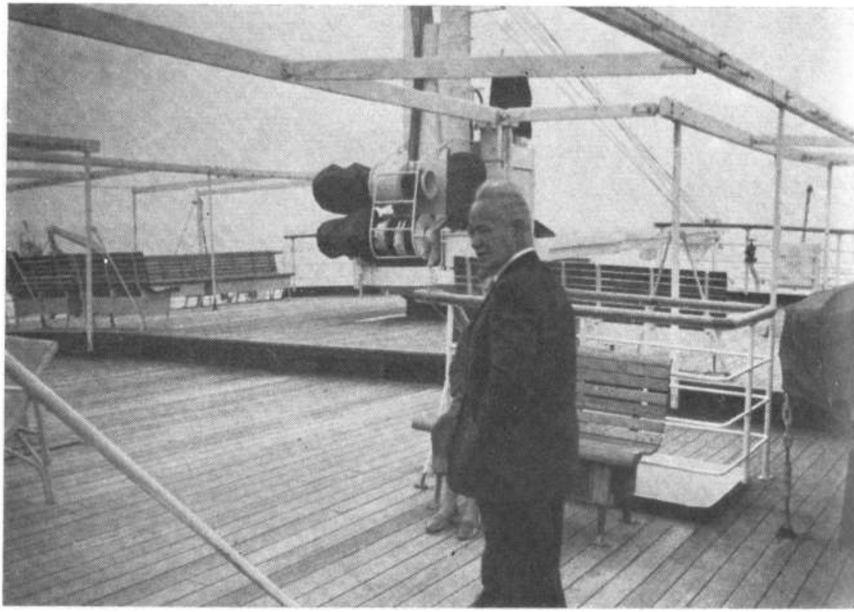
SKÖRD VID DON
27:50, Inb. 32:50

SE FILMEN I TV

Romanerna filmades 1957–58 av den kände regissören Sergej Gerasimov och visas som serieavsnitt i TV under december. Filmen sänds i oavkortat skick för första gången i Sverige.

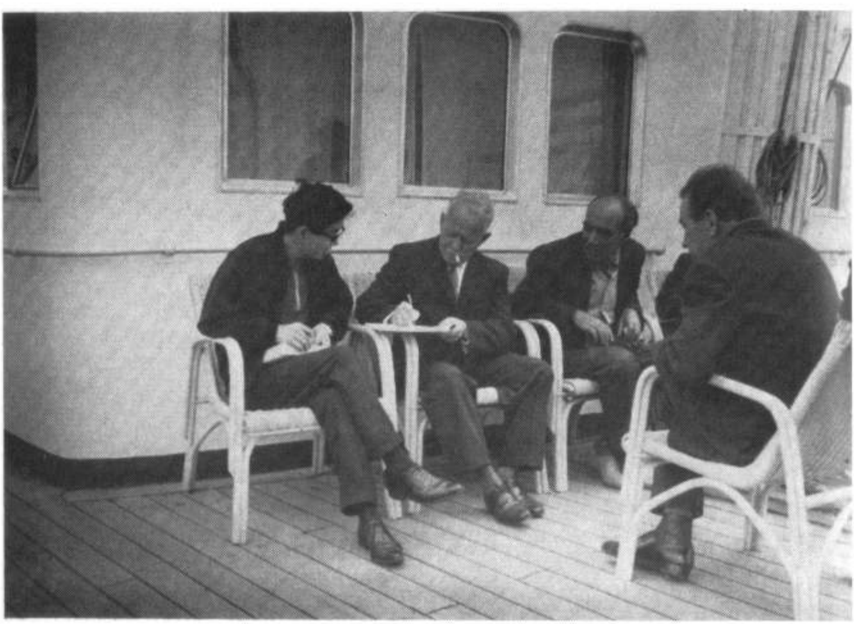
TIDEN • FIB

سویڈن کے ایک
اخبار کا تراشہ ۔



جہاز ''بائیکال،، ہونشو کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔

ایک جاپانی قاری کے لئے شولوخوف آٹوگراف دے رہے ہیں۔





خباروسک ۔ وسیوولود سیسوئیف جو اس علاقے کے میوزیم کے ڈائریکٹر، سائنسداں اور شیر کے مشہور شکاری ہیں میخائل شولوخوف کو گنسنگ کی جڑ بطور تحفہ پیش کر رہے ہیں ۔

خلیج نخودکہ کے قریب جنگل میں ۔



ابتدائی تقریر کے بعد دوسرے مقرروں پر تنقید کرنے میں وہ شش و پنج میں پڑ جائیگا...،،

یہ ہے حکمت، اس کا وار کبھی خالی نہیں جاتا! لیکن جو میرے دوست محسوس کر رہے ہیں وہی میں بھی محسوس کر رہا ہوں: خوشگوار باتیں کرنا ناخوشگوار باتیں کہنے سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔

لیکن پھر بھی اگر کوئی تختوں پر رندہ کرنا اور انہیں جوڑ کر تابوت بنانا شروع کردے تاکہ اس میں ناول کو رکھ کر دفن کردیا جائے تو میں پھر تقریر کرنے کا اپنا حق محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔

ناول کے سلسلے میں میرے لئے ''ہو یا نہ ہو،، کا سوال ہی نہیں اٹھتا، ٹھیک اسی طرح جس طرح کہ بوئیے یا نہ بوئیے کا سوال کسان کے لئے نہیں اٹھتا۔

کسان کے معاملے میں سوال اس طرح کیا جاسکتا ہے: ''کھیت بونے کا وہ کونسا بہترین طریقہ ہے کہ عمدہ فصل کاٹی جا سکے؟،،

ٹھیک یہی میرے معاملے میں ہے اور سوال یہ ہے: اپنے ناول کو اتنا اچھا کیسے بناؤں کہ وہ میرے عوام کی اور میرے قارئین کی حقیقی معنوں میں باوقار خدمت انجام دے؟

بہرحال اس کے متعلق باتیں ہم اس وقت کریں گے جب ہمارے اجتماع کا کاروباری سلسلہ شروع ہوگا۔

ہم اپنی کانفرنس کا افتتاح ایک یادگار دن کو کر رہے ہیں۔ نیوکلیائی آزمائش کے امتناع کے سمجھوتے پر آج ماسکو میں دستخط ہوجائیں گے۔ اگر بڑے سیاسی رہنماؤں اور سیاستدانوں میں سمجھوتہ ہو سکتا ہے تو یقیناً ہم مصنف بھی اس بات پر ضرور متفق ہو جائیں گے کہ اپنے فن کے ذریعے عوام کی اور امن کی سب سے اچھی طرح کیسے خدمت کریں۔ اگر ہم متفق نہیں ہوں گے تو اپنے قارئین کو ہرگز منہ نہ دکھا پائیں گے۔ ہمیں مشترک زبان تلاش کرنی ہے، کرنی ہی پڑےگی!

ہم، سوویت مصنفین، پیارے مہمانو آپ کا خیرمقدم کھلے دل سے، سچی روسی مہمان‌نوازی سے کرتے ہیں۔

اس کانفرنس کے کام کےلئے بہترین حالات پیدا کر دئے گئے ہیں۔ اچھی بات ہے کہ یہ لینن گراد میں منعقد ہو رہی ہے کیونکہ یہاں اتنی گرمی نہیں جتنی کہ ماسکو میں ہے۔ لیکن اگر ہماری بحثیں حد سے زیادہ گرما گرم ہوجائیں تو ہم اپنی کانفرنس آرخنگلسک یا مثلاً مورمانسک میں ہر وقت منتقل کر سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ آپ کی پسندیدہ کسی



ٹوکیو میں -

مزدور طبقے کی عظمت و شان کے متعلق کتابوں کی ضرورت ہے

لینن گراد کے کیروف کارخانے کے مزدوروں اور انجینئروں کے ایک جتھے کی ویشنسکایا میں آمد ایک یادگار واقعہ تھی۔ ادب کے متعلق ہم نے کچھ نہایت کارآمد باتیں کیں جو اس لئے اور بھی زیادہ دلچسپ تھیں کہ خود ہمارے مہمان ادبی کاموں میں مصروف ہیں، اپنے کارخانے کی تاریخ لکھ رہے ہیں جس کی اشاعت سوویت اقتدار کی پچاسویں سالگرہ پر عمل میں آئیگی۔ انہوں نے مجھ سے اپنی کتاب کا پیش لفظ لکھنے کو کہا ہے جو میں بخوشی لکھ رہا ہوں۔

پوتیلوف (کیروف) کارخانے کی تاریخ ان لوگوں نے بنائی ہے جیسے کہ میخائل گاوریلووچ الکسیئف جو وہاں کے سب سے معمر توپساز ہیں جنھوں نے اس کارخانے کی کارگاہوں میں ساٹھ برس کام کیا ہے، جیسے نکولائی واسیلیوچ اسکوورتسوف جو پہلے تو بالٹک بیڑے کے ملاح تھے اور پھر ان پچیس ہزار میں سے ایک ہوئے جو اجتماعیفارم کے صدر بنے اور اس کے بعد پھر سے صنعتی مزدور بن گئے، جیسے ریتائی کی مشین کے آپریٹر یوگینی ساوچ اور ایوان لیونوف جنھوں نے اپنی اپنی وضع کے کاموں میں جدتیں کی ہیں، جیسے سوویت یونین کے ہیرو فیودور دیاچینکو جو پچھلی جنگ میں ایک مشاق نشانہباز تھے، اور ان جیسے سینکڑوں، ہزاروں لوگ۔ اس کارخانے کی تاریخ مزدور طبقے کی نسلوں کی تاریخ ہے جنھوں نے انقلاب کی تکمیل کی، جنگ میں اپنے ملک کی عزت اور آزادی کی حفاظت کی اور اب کمیونزم کی تعمیر کر رہے ہیں۔

سوویت عہد حکومت کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر فیکٹریوں اور کارخانوں کے متعلق صرف یہی کتاب نہیں جو چار سرکاری تمغوں سے سرفراز کیروف کارخانے کے متعلق لکھی گئی ہے بلکہ اس طرز پر لکھی ہوئی اور کتابیں بھی نظر آنی چاہئیں۔

میں ''پراودا'' اور مزدوروں کے اخبار ''ترود'' کے ذریعے تمام مزدور نامہنگاروں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے اپنے کارخانوں کی تاریخ مرتب کریں۔ مزدور طبقے کی عظمت و شان کے متعلق کتابوں کی سخت ضرورت ہے۔ مصنف اور صحافی جتنی ہو سکیگی ان کی مدد کریں گے۔

۱۹۶۴ء

بھی جگہ، بشرطیکہ ناول پر ہماری بحث پروقار، معقول طریقے سے ہو اور اس کے اچھے نتائج کے برآمد ہوں۔

ہم یقین کرتے ہیں کہ یہ کانفرنس کارآمد ثابت ہوگی اور ہمیں امید ہے کہ ہمارے ملک میں آپ کا قیام ایک خوشگوار تجربہ ہوگا۔

۱۹۶۳ء

جب مصنف اپنے ہیروؤں کے دوست بن جاتے ہیں

سنئے کہ مزدور طبقہ کیا کہتا ہے۔ چونتیس برس ہوئے، یا ٹھیک ٹھیک کہیں تو پینتیس برس ہوئے ''جب زمین جاگی،، کا سیمیون داویدوف ان پچیس ہزار لوگوں میں سے محض ایک فرد نہیں تھا جنہیں پارٹی نے کاشتکاری کو اجتماعی کرنے کے کام کی تکمیل کے لئے دیہات بھیجا تھا وہ پوتیلوف (اب کیروف) کارخانے کا ایک مزدور بھی تھا۔

ہمارا روحانی رشتہ جو عرصہ‌دراز قبل قائم ہوا تھا اب مادی توثیق حاصل کرتا جارہا ہے۔ لوگوں نے یہاں دوستی کے بارے میں، مصنفوں اور ان کے ہیروؤں کے درمیان دوستی کے بارے میں اچھی باتیں بتائی ہیں۔ واقعی خوب ہوتا ہے جب مصنف ان مزدوروں کے کنبے کا، گویا، ایک فرد بن جاتا ہے اور اس کا خیالی ہیرو، گوشت پوست کی صورت اختیار کرکے اس کے پاس واپس آجاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں ایسی ملاقاتیں انتہائی کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔

یہ سارے قابل تعریف لڑکے، میرا پیارا ساوچ اور لیونوف جو کچھ کم عزیز نہیں ہے، روستوف کے زراعتی مشین سازی کے کارخانے گئے۔ انہوں نے اپنے کام کے طریقوں کا مظاہرہ کیا اور وضاحت کی کہ انہوں نے خود اپنی ایجادوں، خود اپنی ریتائی کی مشینوں پر کیسے کام کیا اور پورے روستوف میں نہایت اعلی قابلیت رکھنےوالے ریتائی کی مشینوں کے آپریٹروں کو محظوظ کیا اور دادتحسین وصول کی۔ اگر ہم اس طرز عمل پر کاربند رہیں اور کیروف کے مزدور مثلاً ایلیا کوسونوژکین اور ہمارے کچھ اور مزدوروں کو اپنے کارخانے میں مدعو کریں تو اس طرح شہر اور گاؤں کے ہنرمند لوگوں میں سچے معنوں میں تجربے کا تبادلہ ہوجائیگا۔ کیروف‌والوں سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے اپنے ڈان دیس میں آپ کا خیرمقدم کرکے ہمیں ہمیشہ مسرت ہوگی۔

۱۹۶۴ء

دیکھئے، کیروف کارخانے کے مزدور طبقے نے ہمارے پاس اپنا کیسا شاندار دستہ بھیجا ہے ۔ یہاں تین نسلوں کے لوگ آئے ہیں اور ان میں سے ایک ایک کرکے سب ممتاز شخصیت ہیں ۔ اگرچہ تعارف ہو چکے ہیں مگر میرے گاؤں‌والوں کو ممکن ہے ان کے سارے نام یاد نہ ہوں ۔ مثلاً نکولائی واسیلیوچ اسکوورتسوف کو لیجئے ۔ کیا وہ داویدوف کی وضع کے نہیں ہیں؟ ان کے حالات زندگی تک ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں : اسکوورتسوف بھی بالٹک کے بیڑے کے ملاح تھے، اور ۱۹۳۰ء میں وہ بھی پچیس ہزار میں سے ایک تھے اور وہ بھی اجتماعی‌فارم کے صدر مقرر ہوئے تھے، فرق صرف اتنا ہے کہ وہ فارم علاقۂ کالینن میں تھا یہاں نہیں ۔

یہ ضرور ہے کہ ان چونتیس برسوں نے کتاب کے مصنف اور داویدوف ثانی دونوں کو کچھ معمر کردیا ہے، ان کے بالوں میں سفیدی کی تحریر آگئی ہے ۔ لیکن اگر ہمارے ملک کو ضرورت ہوئی تو ہم صفوں میں آن کر کام کرنے کو یا دفاع میں حصہ لینے کو تیار ہیں ۔ اور محنت اور آرٹ میں اتحادعمل سے ہماری یہی مراد ہے ۔ ایک اور پیارے مہمان کے متعلق میں کچھ کہنا چاہوں‌گا — وہ ہیں میخائل گاوریلووچ الکسیئف ۔ جیسا کہ آپ خود دیکھ سکتے ہیں اب وہ نوجوان نہیں ہیں ۔ لیکن دیکھئے صنعت میں ساٹھ سال کام کرنے کے بعد انسان کیا کچھ ہو جاتا ہے ! مجھے رازداری میں کسی نے بتایا ہے کہ اب بھی وہ جہاں جاتے ہیں خواتین کا جمگھٹ لگا لیتے ہیں ۔

کیروف والوں کے ساتھ ہی ساتھ ماسکو اور روستوف سے کچھ مصنف دوست بھی میرے ہاں ٹھیرے ہوئے تھے ۔ مچھلی کا شکار کھیلنے، دریا میں نہانے اور جام صحت پینے کے ساتھ ساتھ ہم نے اہم معاملوں پر تبادلۂخیالات بھی کیا ۔ کیروف والوں نے ہم پر اپنے قطعی قانونی حق جتائے اور الزام عائد کیا کہ ہم نے آج کل کے حالات کے متعلق اور مزدور طبقے کے متعلق بہت کم کتابیں لکھی ہیں ۔

شروع شروع میں تو مصنفوں نے ہر طرح سے اپنے بچاؤ کی تابڑتوڑ کوششیں کیں اور اپنے مورچے پر ڈٹے رہے ۔ لیکن پھر کیروف‌والوں کی کثیر فوج کے مقابلے کی تاب نہ لاکر، جیسے کہ جنگی مراسلوں میں کہا جاتا ہے، یا یوں کہنا چاہئے کہ ان کے معقول دعوؤں کے دباؤ کے تحت، مصنفین مجبور ہوئے کہ پسپا ہوجائیں ۔ واقعی ہم مزدور طبقے کے بارے میں بہت تھوڑا لکھتے ہیں ۔ مگر یہ اتنی سادہ بات نہیں ہے جتنی کہ کسی ناآشنا کو معلوم ہو ۔ مجھے یقین ہے کہ مزدوروں اور ادیبوں کی اس

محنت اور آرٹ کے درمیان
زیادہ مضبوط اتحاد عمل کے لئے

پیارے ویشنسکایا والو، پیارے کیروف والو، ہمارے اچھے دوستو اور ہمارے خوش آئند مہمانو!

ویشنسکایا میں آپ کے قیام کا یہ آخری دن ہے، ڈان کی سرزمین پر آپ کا آخری دن۔ کل آپ وسطی ڈان کےلئے روانہ ہوجائیں‌گے اور وہاں سے دریا کے دھانے پر۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر جگہ آپ کا خیرمقدم پیارے اور معزز مہمانوں کی طرح کیا جائیگا کیونکہ آپ کی ذات میں ڈان لینن کے عظیم شہر اور مشہور کیروف کارخانے کے نمائندوں کو اعزاز بخش رہا ہوگا۔ لیکن ہمیں یقین ہے کہ ساحل ڈان کا کوئی گاؤں اور کوئی شہر اپنے خیرمقدم کی پرخلوص گرمجوشی میں ہمیں مات نہ کر سکیگا۔ یہ دعوی کرنے کے میرے پاس خاص اسباب موجود ہیں۔ سب سے پہلے تو ویشنسکایا کے لوگوں کا ایک جتھہ ۱۹۶۱ء کے شروع میں آپ کا مہمان ہوکر لینن گراد گیا تھا اور مہمان‌داری میں ہم آپ کے مقروض تھے۔ اور دوسرے، ہماری دوستی تین یا چار سال پہلے نہیں بلکہ قریب چونتیس سال ہوئے شروع ہوئی تھی جب آپ کا مزدور ساتھی سیمیون داویدوف میری کتاب کے صفحات سے زندگی کے بیچ منجدھار آیا تھا تاکہ کھیتی باڑی اجتماعی کرنے کو عملی جامہ پہنانے میں پارٹی کی مدد کرے۔

اس کا ذکر میں شائد بہت زیادہ مرتبہ کر رہا ہوں مگر اس لئے نہیں کہ اپنی ادبی انانیت کی تسکین کروں بلکہ محض اس بات پر زور دینے کےلئے کہ آپ کی دوستی میں ہم سبقت کے دعویدار ہیں۔ اور ہم نے آپ کی ۱۹۶۱ء کی پرجوش مہمان‌نوازی کا دو چند جوش و خروش سے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

پچھلے چند برسوں میں میرے گھر بہت سارے مہمان آئے ہیں۔ غیرملکی بھی۔ کون ہے جس کے قدم ہمارے ویشنسکایا کی سرزمین پر نہ آئے ہوں! جرمن، انگریز، ناروے کے باشندے، سویڈن، ڈینمارک، فنلینڈ اور بہت سے دوسرے ملکوں کے لوگ۔ میرے پیشے کا تقاضا ہے کہ دنیا کے بہت سے ملکوں کے ادیبوں اور ناشروں کی مہمانداری کروں۔ ان حضرات سے جن کے سیاسی نظریات میرے خیالات سے ہم‌آہنگ ہیں میری واقعی اچھی دوستی ہو گئی ہے۔ لیکن خوش اخلاقی سے خیرمقدم کرنا ایک چیز ہوتی ہے اور اپنے دل کی گہرائیوں سے استقبال کرنا دوسری۔ پیارے کیروف‌والو، ہم نے تمہارا اسی طرح خیرمقدم کیا ہے— اپنے دل کی گہرائیوں سے۔

روسی فیڈریشن کے مصنفوں
کی دوسری کانگرس میں افتتاحی تقریر

ساتھیو !

روسی مصنفوں کی دوسری کانگرس کا آغاز کرنے کا اعزاز اور نہایت ذمہ‌داری کا فرض مجھے سونپا گیا ہے۔

یہ جانتے ہوئے کہ سوویت یونین اور غیرممالک کے کروڑوں لوگوں کی توجہ ہمارے عظیم روسی ادب کی اور روس کی وسیع و بسیط سرزمین پر نشو و نما حاصل کرنےوالے بہت سے شاندار ادبوں کی نمائندگی کرنےوالے مصنفوں کے اس اجتماع پر مرکوز ہے، مجھے خوشی بھی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ قدرے پریشانی بھی۔

مجھے قوی یقین ہے کہ ہماری کانگرس کی کارروائی دنیا کی رائے عامہ اور خصوصاً اخبارات کی نظروں میں ضرور آئیگی۔ ظاہر ہے کہ ہمیں تیار رہنا اور محسوس کرنا چاہئے کہ صرف ہمارے دوست ہی نہیں، جو خلوص کے ساتھ ہماری کامیابیوں پر خوش ہوتے اور ہماری ناکامیوں پر اظہار ہمدردی کرتے ہیں، اس واقعہ سے متاثر ہوں‌گے بلکہ ہمارے دشمن بھی جو یقینی طور پر ہمارے کام پر حاشیہ‌آرائی کریں‌گے۔ میرے ذہن میں وہ حضرات ہیں جن کا ہمارے معاملات کے بارے میں افواہیں پھیلانا محبوب مشغلہ ہے۔

خیر چھوڑیئے، ان کی پرواہ مت کیجئے۔ ہمارے سامنے بےشمار مسئلے ہیں جنہیں ہمیں اس کانگرس میں صاف صاف زیربحث لانا اور کاروباری انداز میں جن پر غور کرنا چاہیئے۔ یہ بات میں اس چیز کا پہلے سے اندازہ لگاکر کہہ رہا ہوں کہ جو ممکن ہے اس طرح ہمارے لوگوں، کروڑوں قارئین کے ذہن میں آئے: ہمارے مصنفین بیٹھ کر لکھنے کے بجائے خواہ مخواہ جلسے کیوں کرتے ہیں جبکہ انہیں اتنا سارا کچھ کرنا پڑا ہے اور ویسے بھی ہمارے ہاں بےشمار تو جلسے ہوا کرتے ہیں؟

عوام کی رائے ایک ایسی چیز ہے جس کی ہم مصنفوں کو سب سے زیادہ قدر کرنی چاہئے۔ ہم میں سے ہر ایک کی زندگی اور کوششوں کو اگر عوام کا اعتماد اور اس حقیقت کا تسلیم کیا جانا نہیں تو پھر اور کیا حق بجانب قرار دے سکتا ہے کہ ہم اپنی ساری قوتیں اور صلاحیتیں عوام پر، پارٹی پر، اپنے ملک پر نچھاورکر دیتے ہیں؟

میرا عقیدہ ہے کہ اپنے سماج کی زندگی میں فنکار دانشور کے مسئلے کی،

مٹھبھیڑ سے ہمیں بےحساب فائدہ پہنچیگا - میں نہایت غوروفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایسی دوستانہ ملاقاتیں جن کے دوران ہم مزدوروں سے آرٹ کے متعلق اپنے نظریات پر بھی تبادلۂخیالات کرسکیں اور اس امر پر بھی کہ دیرپا قدروقیمت کی، سیاسی اعتبار سے پختہ اور فنی خوبیوں کے اعتبار سے ممتاز اور معیاری کتابیں کیسے تصنیف کی جائیں — ایسی دوستانہ ملاقاتیں انتہائی ضروری اور اہم ہیں - میرا خیال ہے کہ ہماری پیشقدمی کی نہ صرف ہمارے روستوف کے مصنفین بلکہ ماسکو، لینن گراد اور غالباً ملک میں ہر جگہ کے ادیب تقلید کریں گے - میں حد سے زیادہ خوداعتمادی کا تو اظہار نہیں کرنا چاہتا لیکن ہم نے ایک اچھی چیز کی ابتدا کی ہے اور ہماری باہمی خواہش اور مزدور طبقے سے ہمارے تخلیقی تعاون کے نتیجے میں اچھی کتابیں منظر عام پر آسکیں گی - عوام کا، خواہ وہ آرٹ کے میدان عمل میں کام کر رہے ہوں یا صنعت میں ہمارا عام اتحاد، ہمارا سیاسی اتحاد، اور ہمارا اخلاقی اور روحانی اتحاد اس کی ضمانت کرےگا - اور اس لئے میں آپ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیروف کارخانے کے مزدوروں کو یقین دلا دیں کہ اس قسم کی کتابیں واقعی ضرور لکھی جائیں گی -

کیروف والے میرے مہمانوں نے مجھے جو تحفے دئے ہیں ان میں سب سے بیش بہا یقینی طور پر کمیونسٹ کارگر کامگار کا خطاب اور کیروف کارخانے کا پاس ہے - مگر میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بات ذہن نشین رکھیں کہ کیروف والے بڑے ہی سیانے ہیں اور یہ پاس جو تحفے میں دیا ہے اس میں بھی بڑا راز ہے - ان کے جی میں کیا ہے یہ مجھے قریب قریب معلوم ہوگیا ہے : آپ جس وقت، جس دن جی چاہے ہمارے کارخانے میں آئیے ہمیں اور ہمارے کام کو اچھی طرح سمجھئے اور قدرتی بات ہے کہ یہ سب کچھ اتنا مسحورکن ہوگا کہ آپ چاہیں گے کہ فوراً بیٹھ جائیں اور اس کے متعلق لکھ ڈالیں - میرے پیارے ساتھیو، میں نے کبھی بھی یہ حلف نہیں لیا کہ صرف زراعت یا جنگ کے موضوعات پر ہی قلم اٹھاؤں گا! پرانے زمانے کی سہانی یادیں میں نے فراموش نہیں کی ہیں اور ممکن ہے اب بھی میں دوسرے موضوعات پر لکھنے بیٹھ جاؤں -

اچھا تو پھر آئیے ہم اپنے مہمانوں کے لئے بخیر و عافیت سفر کی دعا کریں اور انہیں یقین دلائیں کہ یہاں ویشنسکایا میں اور یوں تو ڈان دیس میں ہر جگہ ان کا ہمیشہ پرجوش خیرمقدم ہوگا -

۱۹۶۳ء

نشوونما کے راستے میں حائل ہوتی ہو تو ہمیں چاہئے کہ اس کو سمیٹ کر اپنے راستے سے ہٹا دیں۔ اگر ہم میں اب بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو کبھی کبھار اعتدال پسندی کو منہ لگا لیتے ہوں اور نظریاتی جدوجہد میں سوقع پرستوں کا کھیل کھیلتے ہوں تو ہمیں صاف صاف، ان کے منہ پر کہہ دینا چاہئے ان کے متعلق ہماری کیا رائے ہے۔

سخت تنقید کرنے سے پہلو بچانے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے کیونکہ ہماری ذمہ داری اتنی بڑی ہے اور ہمیں جس نصب العین کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے وہ اتنا اہم ہے کہ ہم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔

قدرتی بات ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے کچھ شدید مسئلے ہیں اور تقریر کرنے والوں میں سے ہر ایک یقیناً انہیں چھیڑنا چاہیگا اور خود اپنی ادبی تنظیم کے معاملات اور پریشانیوں کے بارے میں حاضرین جلسہ کو بتانا چاہیگا۔ لیکن میں آپ سے اس نکتے پر خاص طور سے زور دینے کی اجازت چاہتا ہوں — سب سے اہم چیز یہ ہے کہ اپنی خاص سمت کو، اپنے خاص موضوع کو آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیں یعنی ادب اور عوام کی زندگی، ادب اور کمیونزم کی تعمیر۔ اگر آپ اور ہم اس اونچے سر کو برقرار رکھ پائیں تو گیت کی دھن بہت خوب رہیگی اور ہماری کانگرس وقتی ادبی واقعہ بن کر نہ رہ جائیگی بلکہ ان لوگوں کا ایک کارآمد اجتماع ہوگی جو زندگی اور ہمارے فن پر سنجیدگی سے غوروفکر کرتے ہیں۔

غیر ممالک میں ہم سے اکثر دریافت کیا جاتا ہے — بعض بدباطنی کے ساتھ پوچھتے ہیں اور کچھ واقعی سمجھنے کی غرض سے کہ — سوشلسٹ حقیقت پسندی اصل میں ہے کیا؟ میں یہ جرأت تو نہیں کرونگا کہ اپنے ہاں کے نظریات دانوں کو ان کی روزی سے محروم کردوں اور اس کے علاوہ علمی نکات مرتب کرنے میں مجھے ویسے بھی کوئی ملکہ حاصل نہیں ہے۔ لیکن اس کے جواب میں جو کچھ میں کہا کرتا ہوں وہ یہ ہے: سوشلسٹ حقیقت پسندی زندگی کی سچائی منعکس کرنے کے طریقے کو، لیننی جانبداری کے نقطۂ نظر سے فن کار سچائی کو جس طرح سمجھتا اور جس طرح وہ اس کی ترجمانی کرتا ہے اس طرح اس کو پیش کرنے کے طریقے کو کہتے ہیں۔ اور بھی سیدھے سادے الفاظ میں کہیں تو یہ ایک ایسا طریقہ ہے جو ایک نئی دنیا کی تعمیر میں لوگوں کی عملاً مدد کرتا ہے۔

جو لوگ یہ سمجھنا چاہتے ہیں کہ سوشلسٹ حقیقت پسندی کیا ہے، ان کو سوویت ادب کی تقریباً نصف صدی کی تاریخ پر تفصیل سے غور

اگر اس قسم کا مسئلہ واقعی موجود ہے تو اس کی، کنجی ہمیں یہیں تلاش کرنی چاہیئے... سچ پوچھئے تو میں بعض اوقات سوچتا ہوں کہ اس مسئلے کو ہم نے حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بڑی ہی اچھی بات ہے کہ فکر کے ساتھ برتاؤ کیا جائے، بڑھنے میں مدد دی جائے، ڈھارس بندھا کر دل بڑھایا جائے، لیکن کیا ہم سوویت دانشوروں میں سے ہر ایک پر جنہیں پارٹی اور عوام نے پروان چڑھایا، یہ لازم نہیں آتا کہ اپنی باری میں ہر اس چیز کی بڑی احتیاط اور فرزندانہ محبت سے نگہداشت کریں جو ہمارے عوام نے، ہماری پارٹی نے اور ہماری اپنی سوویت حکومت نے نصف صدی کی دشوار جدوجہد کے بعد حاصل کیا ہے؟

اگر کوئی میری ذاتی رائے پوچھے تو میں یہی کہوں کہ ہمارے ملک میں دانشوروں کا مسئلہ بڑی سادگی سے حل ہو جاتا ہے: بس لینن پارٹی کے وفادار سپاہی رہو، اور چاہے کمیونسٹ ہو یا بےپارٹی، اپنی تمام تر قوت، اپنی روح تک عوام پر وقف کردو، عوام کی زندگی میں، اس کی تمام تر مسرتوں اور مشکلوں کے ساتھ، حصہ بٹاؤ اور بس ''مسئلہ'' ختم ہو گیا۔

ہمیں یہاں ماسکو میں چند روز ایک ساتھ گذارنے ہوں گے۔ ہمیں سر جوڑ کر بیٹھنا اور کام کرنا ہوگا، اور کام بھی بڑی محنت کے ساتھ۔ اور سوویت ادب کے مفاد کے لئے ان چند دنوں میں زیادہ سے زیادہ کچھ حاصل کرنے کی غرض سے ہمیں پہلے ہی سے اس بات پر متفق ہو جانا چاہئے کہ ہم نیک ارادوں کے ساتھ، فوجی بھائیوں کی طرح کام کریں گے اور چھوٹی چھوٹی تکلیفوں اور غلطفہمیوں کو بھول جانے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں اپنے ذہن میں اس خیال کو سب پر سبقت دینی چاہئے جو ہم سب کو متحد کرتا ہے — اپنے عظیم سوویت ادب کی مزید ترقی کی فکر۔ پارٹی اور پورا ملک ہم سے یہی آس لگائے ہوئے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میری مراد کیا ہے: میں آپ سے یہ نہیں کہہ رہا کہ ایک دوسرے کو گلے لگالیں اور تمام غلطیوں کو معاف کر دیں۔ دوست بنکر رہنا سب ٹھیک ہے مگر ہمارے ادبی، نظریاتی معاملے اصولی ہوتے ہیں جن سے احتراز اپنے عزیزترین دوست کا بھی معاف نہ کرنا چاہئے۔ ہمارا اتحاد حقیقی معنوں میں اسی وقت ٹھوس ہوگا جب کہ ہم ایک دوسرے کی غلطیوں کو نظرانداز کرنا ترک کردیں اور لگی لپٹی کچھ نہ رکھیں۔ اگر اب بھی کوئی چیز ایسی ہو جو معمول کے مطابق کام کرنے اور معمول کے مطابق ادب کی

جنھوں نے میری سالگرہ کے اجتماع میں شرکت کرکے میری عزت‌افزائی فرمائی اور اپنے ان بہت سارے قارئین کا جو یہاں موجود نہیں ھیں، شکریہ ادا کرنا چاھتا ھوں۔

میں ھر اس فرد بشر کا شکرگذار ھوں جس نے اس طویل ساٹھ سالہ سفر میں اپنی دلی گرمجوشی سے میری مدد کی۔ مجھے جو اعلی انعام ملا ھے اس کے لئے میں اپنی سوویت حکومت کا تہ‌دل سے احسان‌مند ھوں۔

آپ سب کا شکریہ!

۱۹۶۵ء

''پراودا،، کے نامہ‌نگار سے انٹرویو

نوبل انعام جیتنے پر آپ کو کیسا لگا؟

قدرتی طور پر خوشی ھوئی کہ مجھے نوبل انعام دیا گیا ھے مگر میں آپ سے درخواست کرتا ھوں کہ میرے احساسات کو صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کیجئے: مجھے ایک فرد کا، پیشہ‌ور مصنف کا جس کے کام کی بین‌الاقوامی قدر شناسی ھوئی ھو، اطمینان قلب نہیں ھے۔ میرے جذبات پر اس پرمسرت احساس کا غلبہ ھے کہ میں نے اپنے ملک، اس پارٹی کی جس کی صفوں میں شامل ھوئے مجھے اپنی زندگی کے آدھے حصے سے زیادہ عرصہ گزر چکا ھے اور یقیناً اپنے سوویت ادب کی شان میں اضافہ کرنے کے لئے کچھ کیا ھے، چاھے تھوڑا ھی سا کچھ کیا ھے۔ اپنے ذاتی جذبات کی بہ‌نسبت یہ میرے لئے زیادہ اھم ھے۔

یہ جان کر بھی خوشی ھوئی ھے کہ ناول کی صنف نے، جس کی بعض ادبی ھستیوں نے جدید دنیا میں وجود کے جائز ھونے پر ھی شبہات کا اظہار کیا ھے، اپنے وجود کے حق بجانب ھونے کو منوالیا ھے۔ سلیقے سے لکھی ھوئی کتاب کی زندگی طویل ھوتی ھے اور کسی زندہ ھستی کے وجود سے بلاسبب انکار نہیں کیا جاسکتا۔

آپ کو یہ خبر کیسے ملی؟

سویڈن کے صحافیوں کے بھیجے ھوئے ایک تار سے۔ لیکن یہ اطلاع مجھے دیر میں ملی۔ یہ تار فورسانوف ضلع پارٹی کمیٹی کے سیکریٹری کامریڈ میندالیئف نے مجھے پہنچایا جنھوں نے اضلاعی مرکز سے ۱۴۰ کلومیٹر دور جاکر مجھے ڈھونڈ نکالا۔ سویڈن کی شاھی اکادمی کو بذریعہ

کرنا چاهیئے۔ اس ادب کی تاریخ وهی سوشلسٹ حقیقت‌پسندی هے جس کا اظهار هیروؤں کے جیتے جاگتے کرداروں اور عوامی جد و جهد کی بین تصویروں میں ملتا هے۔

آج جب هم مستقبل پر غوروفکر کررهے هیں تو همیں اپنے دماغ کی کھڑکیاں کھول لینی چاهئیں تاکه وه شاندار راسته صاف نظر آنے لگے جس پر سے ۵۰ برس کے دوران سوویت ادب کا اور خاص طور سے روسی ادب کا جو اس کا ایک خاص دسته هے، پورا قافله هوکر گزرا هے۔ هم نے جو دولت اکٹھی کرلی هے وه بےپناه هے۔ همارے پاس جو ذخیره هے وه قابل فخر هے، اور جس کو هم بےنتیجه پرشور تجریدیت کے مقابلے میں پیش کرسکتے هیں۔ اور اگرچه هم غور کر سکتے هیں که عوام کے اعتماد کو حق بجانب قرار دینے کے لئے همیں اب بھی کتنا کچھ کرنا باقی هے، اور اگرچه ممکن هے که هم اب بھی اپنے کام سے غیرمطمئن هوں، لیکن نوع انسانی کی روحانی قدروں کے خزانے میں همارے ادب نے جو اضافه کیا هے اس کو اور دنیا میں هر جگه اسے قطعی سند کا جو درجه حاصل هے اسکو کبھی هرگز فراموش نه کرنا چاهئے۔

پیارے ساتھیو!

روسی فیڈریشن کے ادیب هی سوویت یونین میں سب سے پهلے خود اپنی کانگرس منعقد کر رهے هیں۔ جمهوریائی سطح پر ایسی دوسری کانگرسیں بعد میں ضرور هوں‌گی۔ بڑی هی اچھی بات هوگی که هم، روسی، ادب کے مسائل کا سنجیده، کاروباری قسم کا مباحثه بنائیں۔ مجھے اعتماد هے که هم ایسا هی کریں‌گے۔

اس امید کے ساتھ میں روسی فیڈریشن کے مصنفوں کی دوسری کانگرس کے آغاز کا اعلان کرنے کی اجازت چاهتا هوں۔

۱۹۶۵ء

اظهار شکریه

باوجودیکه مجھے خوشامد سے سخت چڑ هے، مگر میں مغلوب هوکر ره گیا هوں، اور ان تین دنوں میں مجھے ایسا لگنے لگا هے که جیسے دس سال اور بوڑھا هوگیا هوں۔ چنانچه اسے میری ساٹھویں نهیں بلکه سترویں سالگره بھی کها جاسکتا تھا...

لیکن سنجیدگی کے ساتھ عرض کروں تو میں ان تمام حضرات کا

حقیقت‌پسندی کی جاندار قوت

اس اهم موقع پر میں ایک بار پھر سویڈن کی شاهی اکادمی کا شکریه ادا کرنا اپنا خوشگوار فرض تصور کرتا هوں که اس نے مجھے نوبل انعام دیا۔

میں پہلے هی برسر عام بیان کرچکا هوں که اس اعزاز سے مجھے محض اس لئے هی مسرت حاصل نہیں هوئی که یه میری پیشه‌ورانه خوبیوں یا مصنف کی حیثیت سے جو خوبیاں مجھ سے مخصوص هیں ان کی بین‌الاقوامی قدرشناسی هے۔ مجھے فخر هے که یه انعام ایک روسی، ایک سوویت مصنف کو ملا هے۔ میرے ملک میں بہت سارے مصنف هیں اور یہاں میں ان کی نمائندگی کر رها هوں۔

جیسا که میں پہلے کہه‌چکا هوں، میں اس لئے بھی خوش هوں که یه انعام چاهے بالواسطه هی سہی، ناول کی صنف کو تسلیم کرنے کے مترادف هے۔ پچھلے دنوں مجھے اکثر ایسے دعوے پڑھنے اور سننے کا موقع ملا هے، جن سے سچ تو یه هے که میں حیران ره گیا، که ناول کی صنف فرسوده هوگئی هے اور اب اس میں جدید تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت باقی نہیں ره گئی هے۔ حالانکه حقیقت یه هے که ناول هی مصنف کو اس بات کا موقع فراهم کرتا هے که دنیا کی نہایت هی جامع تصویر پیش کر سکے اور اس حقیقت کی اور اس کے اهم مسئلوں کی جانب خود اپنے رویے کا اور اپنے همخیال لوگوں کے رویے کا بھی اظہار کر سکے۔

کسی اور صنف سے زیاده ناول هی مصنف کےلئے اس بات کی گنجائش پیدا کر سکتا هے که وه کائنات کے مرکز کی حیثیت سے خود اپنے مختصر سے وجود کو پیش کرنے کے بجائے، همارے اطراف و جوانب کی زندگی کی وسعتوں کی چھان‌بین کرسکے۔ اپنی خود نوعیت کے اعتبار سے یه صنف حقیقت‌پسند مصنف کو عمل کا وسیع‌ترین میدان فراهم کرتی هے۔

آرٹ میں بہت سے جدید رجحانات حقیقت‌پسندی کو اس وجه سے مسترد کر دیتے هیں که گویا وه اپنا وقت پورا کر چکی هو۔ میں قدامت‌پسندی کا قصوروار ٹھیرائے جانے کے خوف سے بے نیاز هوکر دعوی کرتا هوں که میری رائے اس کے بالکل برعکس هے اور میں حقیقت‌پسند آرٹ کا قائل اور علمبردار هوں۔

جدیدی ادب کے متعلق بہت باتیں هوتی هیں، اور لوگوں کے ذهن میں خاص طور پر هیئت کے دائرے میں تجربات کرنے کی بات هوتی هے۔

تار جواب دینے کے لئے مجھے قدرے مخدوش موسم میں یورالسک تک پرواز کرنی پڑی - لیکن بحیثیت مجموعی ۱۰ اکتوبر میرے لئے بڑا ھی مبارک دن تھا - میں صبح تڑکے ھی سے بیدار ھوگیا اور اپنے ناول کے پہلے حصے کے اس باب کو لکھ لیا جس کی نشست میں کسی طرح چستی آ ھی نہیں رھی تھی (یہ وہ باب ھے جس میں نکولائی استریلتسوف سے اس کا بھائی ملنے آتا ھے جو ایک جرنیل ھے جس کا نمونہ میں نے جرنیل لوکین کی شخصیت کو بنایا ھے) - تیسرے پہر مجھے نوبل انعام کے بارے میں معلوم ھوا اور شام کو میں نے دو نہایت نفیس مرغابیاں ماریں دو گولیاں چلا کر (اور یہی دو فائر کئے تھے) - اور سب سے بڑی بات یہ کہ بندوق کی مار کی آخری حد کے فاصلے پر - جیسا کہ آپ جانتے ھی ھیں ایسا نشانہ شاذ و نادر ھی ٹھیک بیٹھتا ھے -

اور اس انعام نے آپ کی زندگی کے موجودہ مقررہ نظام پر کیا اثر ڈالا ھے؟

اب تک آپ کو معلوم ھو جانا چاھئے تھا کہ مجھے اپنی نشست سے اکھاڑنا چنداں آسان نہیں - حسب معمول میں کام کرتا، آرام کرتا، لزیز قزاخی کومس * پیتا اور کبھی کبھی جب میں مرغابی کے شکار کو جاتا ھوں اور مارے سردی کے جب خون تک جم جاتا ھے تو قزاخستانی ''اراکا،، کا ایک گلاس پینے کی جسارت بھی کر لیتا ھوں - اسٹاک ھام سے واپسی کے بعد میں ''وطن کے مجاھد،، کا پہلا حصہ مکمل کرلوں گا - مجھے پکا یقین ھے کہ کرلوں گا - تو سب کچھ ٹھیک ھے!

قزاخستانی میدان سمگن ھے سنسان نظر آتے ھوں مگر یہاں، جیسے کہ سارے ملک کی کیفیت ھے، زندگی پوری آب و تاب سے موجزن ھے - خزاں کی ھلائی کے لئے زمین کے آخری ھیکٹر — منصوبے سے تجاوز کرنے کے بعد — توڑے جا رھے ھیں، دشوار سرما کے لئے گڈرئے تیاریاں کر رھے ھیں، کاشتکاری کی مشینیں چلانے والے — علاقے کے بہترین مشینیں چلانے والے — اپنے تجربے سے ایک دوسرے کو مستفید کرنے جمع ھو رھے ھیں - چنانچہ یہاں بھی لوگ ملک کی معاشی اور تہذیبی ترقی کے لئے پارٹی کی فکرمندی سے جوش و خروش حاصل کرکے اپنی بہترین صلاحیتوں کو بروئے کار لا رھے ھیں - کمیونزم کی تعمیر کرنے والی اس طاقتور جمعیت کا خود کو ایک ننھا ذرہ محسوس کرکے میں مگن ھو جاتا ھوں -

۲۱ اکتوبر ۱۹۶۵ء

---

* کومس گھوڑی کے دودھ کو کہتے ھیں - (ایڈیٹر)

بھرے کر سکتا ہے جن میں دوسری عالمی جنگ نے وسیع و بسیط علاقوں کو تبدیل کردیا تھا؟ کیا کوئی بھی دیانتدار ادیب ان لوگوں کے خلاف آواز اٹھائے بغیر رہ سکتا ہے جو نوع انسانی کو اپنی تباہی آپ ہی لانے کی ڈگر پر لگا دینا چاہتے ہیں؟

تو پھر ایک ادیب کا جو اپنے آپ کو ایک طرح سے دیوتاؤں میں شمار کرنے نہیں لگ جاتا اور متصادم قوتوں کے معرکے سے بلند اولیمپائی بلندیوں پر نہیں پہنچ جاتا اور جو انسانی مصائب و آلام کے معاملے میں غیرجانبدار نہیں رہتا بلکہ اپنی قوم کا سپوت اور نوع انسانی کا ایک ننھا سا ریزہ تصور کرتا ہے، اس کا فریضہ کیا ہے ؟

اس کا فرض ہے کہ وہ پڑھنے والے سے ایمان کی بات کہے، لوگوں کو حقیقت سے، ممکن ہے تلخ حقیقت لیکن ہمیشہ جرأت آزما حقیقت سے آشنا کرے۔ عوام کے دلوں میں مستقبل اور اس مستقبل کی تعمیر کی صلاحیت میں یقین کو تقویت پہنچائے۔ دنیا میں امن کےلئے جہاد کرے اور ہرجگہ، جہاں تک اس کی آواز پہنچ سکے ایسے مجاہدوں کی ہمت‌افزائی کرے۔ عوام کو ترقی کےلئے اپنی فطری اور باعزت جستجو میں متحد کرے۔

آرٹ میں لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کرنے کی قوت ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ فنکار کہلانے کا حق ان مصنفوں کو پہنچتا ہے جو اس تاثر کو نوع انسانی کی بھلائی کےلئے، اور لوگوں کی روح میں حسن کی ایک دنیا تخلیق کرنے کےلئے استعمال کرتے ہیں۔

میری اپنی قوم نے اپنی تواریخی پیشقدمی میں پیش پاافتادہ راہ اختیار نہیں کی۔ ہم نے نئی راہیں روشن کیں، ہم پیش رو تھے۔ ایک مصنف کی حیثیت سے میرا فرض، جیسا کہ میں نے اسے ہمیشہ سمجھا ہے یہ ہے کہ اب تک جو میں نے لکھا ہے اور آئندہ جو کچھ لکھوں‌گا اس سے اپنے سوویت عوام کو — جفاکش، خلاق، جانباز عوام کو جنہوں نے کبھی بھی کسی پر فوج کشی نہیں کی، لیکن جو کچھ تخلیق کیا ہے اس کی ہمیشہ حفاظت کی ہے، آزادی اور عزت اور اپنے لئے اپنی پسند کا مستقبل تعمیر کرنے کے اپنے حق کا تحفظ کیا ہے — بصد احترام خراج عقیدت پیش کروں۔

میں چاہوں‌گا کہ میری تصانیف لوگوں کو بہتر اور پاک باطن کر دیں، میں چاہوں‌گا کہ میری تصانیف ان میں اپنے ہم‌جلیسوں سے محبت اور انسانیت اور ترقی کے مقاصد کےلئے جدوجہد کرنے کی آرزو پیدا کردیں۔

میری رائے میں حقیقی جدیدی وہ ادیب ہوتے ہیں جو اپنی تصانیف میں ہمارے دور کی زندگی سے مخصوص نئے خدوخال، تعلقات اور رویے پیش کریں ۔

حقیقت‌پسندی کی اور بطور خود حقیقت‌پسند ناول کی بنیاد ماضی کے باکمالوں کے تجربے پر استوار ہوتی ہے ۔ لیکن ارتقاء کے دوران میں اس کے نقوش بنیادی طور پر نئے اور نمایاں طور پر جدید ہو جاتے ہیں ۔

میں اس حقیقت‌پسندی کا ذکر کر رہا ہوں جس میں زندگی کو نیا کرنے اور اس کو انسان کے فائدے کے لئے از سر نو منظم کرنا مضمر ہوا کرتا ہے ۔ میں یقیناً اس چیز کا تذکرہ کر رہا ہوں جسے ہم سوشلسٹ حقیقت‌پسندی کہتے ہیں ۔ اس میں انوکھاپن یہ ہے کہ یہ ایک ایسے عالمی نقطۂنظر کا اظہار کرتی ہے جو نہ تو گیان‌دھیان پر ایمان رکھتا ہے، نہ حقیقت سے فرار پر بلکہ جو لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ نوع انسانی ترقی کےلئے جدوجہد کریں، انہیں ان مقاصد کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے جن کی کروڑوں لوگ حمایت کرتے ہیں اور جو ان کے لئے اس جدوجہد کی راہیں روشن کرتا ہے ۔

نوع انسانی ان بےشمار افراد میں منقسم نہیں ہے جو بےوزنی کی حالت میں ارضی کشش جرثقل سے باہر نکل جانےوالے خلابازوں کی طرح تیرتے پھر رہے ہوں ۔ ہم کرۂارض پر رہتے ہیں، ہم ارضی قوانین کے تابع ہوتے ہیں ۔ کرۂارض کی آبادی کے ایک بڑے طبقے کے مفادات مشترک ہوتے ہیں اور وہ ایک ہی منزل پر پہنچنا چاہتے ہیں اور اس کی تگ‌ودو انہیں منتشر کرنے کے بجائے متحد کرتی ہے ۔

یہ طبقے محنت‌کش عوام کے ہیں جو اپنے ہاتھوں اور اپنے ذہن رسا سے سب کچھ پیدا کرتے ہیں ۔ میں ان مصنفوں میں سے ہوں جو محنت‌کش عوام کی بلاتامل خدمت کرنے کے قابل ہونے کو اپنےلئے اعلیٰ‌ترین اعزاز اور افضل‌ترین آزادی تصور کرتے ہیں ۔

ہر چیز یہیں سے عود کرتی ہے ۔ یہیں سے نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ جدید دنیا میں آرٹسٹ کے مقام کی تصویر میرے یعنی ایک سوویت ادیب کے ذہن میں کیا ہے ۔

ہم ایک متلاطم عہد میں رہتے ہیں ۔ لیکن دنیا کی کوئی بھی قوم ایسی نہیں ہے جو جنگ چاہتی ہو ۔ ایسی قوتیں ضرور موجود ہیں جو پوری کی پوری قوموں کو جنگ کے شعلوں میں جھونک دیتی ہیں ۔ کیا کسی مصنف کا دل جلتے ہوئے ان کھنڈرات کی آہوبکا کی طرف سے کان

بذات خود آپ کا بھی شکریہ ادا کرنا چاھتا ھوں۔ یہ بھی خاص ایک کارنامہ ھے کیونکہ سفر چنداں آسان نہیں۔

کامریڈ شلیم، میں آپ کا بھی، جمہوری جرمنی کے محنت کش عوام کے نمائندے کی حیثیت سے شکریہ ادا کرنا چاھتا ھوں۔

میں آپ سب کا جنھوں نے میری زندگی کے اس اھم موقع پر یہاں تشریف لا کر میری عزت‌افزائی فرمائی ھے، شکریہ ادا کرتا ھوں۔

۱۰ جنوری ۱۹٦٦ء

سوویت کمیونسٹ پارٹی کی تیئیسویں کانگرس میں تقریر

ساتھیو!

جس طرح دریائےوالگا کی مست خرامی کے حسن فسوں‌خیز کا اندازہ اس کے معاون دریاؤں سے نہیں لگایا جا سکتا، حالانکہ روسی حسن و دل‌آویزی کی ان کی اپنی نرالی شان ھے، اسی طرح ھمارے روزمرہ کے کاموں اور الگ الگ کامیابیوں کے بارے میں غیر مربوط اخباری اطلاعات سے تعمیر کے پیمانے اور ھمارے ملک کی ھوشربا کارگذاریوں کی مکمل تصویر سامنے نہیں آ سکتی۔

لیکن جب ھم اپنی پارٹی کی کانگرس کے لئے جمع ھوتے ھیں، خاص رپورٹ سنتے ھیں اور زیرتبصرہ مدت میں پارٹی اور عوام نے جو کچھ کیا ھے اس کا خلاصہ پیش کرنےوالے اعداد و شمار ھمیں معلوم ھوتے ھیں تو ھمیں واقعی زبردست کوششوں کے نتائج کا پتہ چلتا ھے اور مستقبل کی خاطر عوام جو کچھ تخلیق کر رھے ھیں اس کی عظمت کا واقعی احساس ھوتا ھے۔

اگر اس شاعرانہ تعارف کے بعد میں اچانک نثر کی طرف واپس آجاؤں تو پوری پوری ایمانداری کے ساتھ عرض کروں‌گا کہ مجھے ان لوگوں پر رشک ھوتا ھے جو اس بلند منبر پر آکر کانگرس کو ان کامیابیوں کی تفصیل بتاتے ھیں جو صنعت، سائنس یا تعلیم کے کسی نہ کسی شعبے میں انھوں نے حاصل کی ھوتی ھیں۔ یہاں میں سوویت ادب کے ایک نمائندے کی حیثیت سے تقریر کرنے کھڑا ھوا ھوں اور مجھے یہ تلخ حقیقت تسلیم کرنی پڑتی ھے کہ ھماری کامیابیاں اتنی بڑی نہیں ھیں جتنی کہ ھم خود اور آپ، ھمارے قارئین چاھتے ھیں کہ ھوں۔

اگر میں نے اس میں ذرا بھی کامیابی حاصل کرلی ہو تو یہی میرے لئے باعث مسرت ہے۔

میں تمام حاضرین کا اور ان تمام لوگوں کا جنھوں نے نوبل انعام ملنے پر مجھے مبارکبادی کے پیغامات بھیجے ہیں، شکریہ ادا کرتا ہوں۔

۱۹۶۵ء

لائپزیگ کی کارل مارکس یونی‌ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی اعزازی سند لینے کے بعد تقریر

پیارے کامریڈ بروننگ!

پیارے کامریڈ ہوکسلشنیدر!

میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ لائپزیگ یونی‌ورسٹی کے شعبۂ لسانیات کی علمی مجلس کو میرا دلی شکریہ پہنچا دیں۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ کوئی بورژوا ملک مجھے اعزازی علمی سند دے اور ایسی ہی سند مجھے کسی برادر سوشلسٹ ریاست کی جانب سے ملے تو میرا ان کے متعلق تاثر مختلف ہوا کرتا ہے۔ اول‌الذکر صورت میں یہ میرے ادبی ہنر اور ادب کے شعبے میں میری کارگذاریوں کا ایک صداقت‌نامہ ہوتا ہے۔ موخرالذکر صورت میں معاملہ بالکل مختلف ہوتا ہے۔ علمی سند مجھے ان لوگوں نے عطا کی ہوتی ہے جن کے سیاسی نظریات وہی ہوتے ہیں جو میرے ہیں اور جو ان منزلوں کی جانب پہنچنے کے لئے ہی کوشاں ہوتے ہیں اور وہ انہیں نظریات کے حامل ہوتے ہیں جو ہمارے سوویت عوام کے ہیں۔ ان کا شرف قبولیت بخشنا میرے لئے بے‌پناہ قدر و قیمت رکھتا ہے۔

اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں کامریڈ بروننگ اور کامریڈ ہوکسلشنیدر آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ لائپزیگ یونی‌ورسٹی کے اساتذہ اور طلباء کو میرا دلی پیغام تہنیت پہنچا دیں۔

میں ایک بار پھر اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اگلی بار جب بھی کبھی میرا جرمن جمہوری ری‌پبلک میں آنا ہوا تو آپ کی یونی‌ورسٹی میں حاضر ہونا میں اپنے لئے باعث عزت اور اپنا خوشگوار فریضہ تصور کروں‌گا۔

لائپزیگ سے ویشنسکایا تک کے طویل سفر کی تکلیف اٹھانے پر میں

ہمارے جو ادبی معاملات ہیں ان کا تفصیلی تجزیہ کرکے میں آپ کو دق کرنا نہیں چاہتا اور ویسے بھی یہ ایک آدمی کے بس کی بات بھی نہیں ہے ۔ اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کی ہم مصنفوں کی کانگرس میں کوشش کریں گے جو اسی سال بعد میں منعقد ہوگی ۔

چند الفاظ اس کے بارے میں جسے عام رواج کے مطابق سماج کی زندگی میں ادب کا مقام کہتے ہیں ۔ وہ کونسے مظاہر ہیں جو ہمارے ہمعصر سماج کی زندگی کی کرداری خصوصیات واضح کرتے ہیں اور ان مظاہر کے تعلق سے مصنف کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے ؟

مجھے یقین ہے کہ ہر غیرمتعصب شخص پر یہ حقیقت بخوبی روشن ہے کہ آج کی دنیا میں رونما ہونےوالے واقعات کسی بھی دیانتدار مصنف یا فنکار کےلئے غیرجانبدار مشاہد کا رویہ اختیار کرنا غیر ممکن کر دیتے ہیں ۔ شاید کوئی یہ سوچے کہ یہ تو سیدھی سادی حقیقت ہے، پھر بھی اس کے متعلق لوگوں کو یاد دھانی کرانی پڑتی ہے ۔ عصرحاضرہ کی نوع انسانی کی زندگی کے واقعات نے جو راستہ اختیار کیا ہے اسے کسی طرح بھی ہموار نہیں کہہ سکتے ... رجعت‌پسند بورژوا آرٹ ہر ممکن کوشش کرکے لوگوں کے انتہائی وحشیانہ جذبات مشتعل کرنے کی کوشش کرتا ہے، بہت کچھ بدی کی ان قوتوں کی طرح جو تمام قوموں اور ملکوں کے قدیم قصوں کہانیوں میں بیان کی جاتی ہیں انسان کو انسانی پیکر اور انسانی روح سے محروم کر کے حیوان میں تبدیل کر دیتا ہے ۔ ان کے اظہار کی علامتیں مختلف ہوتی ہیں مگر وہ ایک ہی زمرے کے مظاہر کی نشاندھی کرتی ہیں ۔

ہمارا ملک اور دوسرے سوشلسٹ ممالک مختلف قومیتوں، مختلف سیاسی نظریوں کے حامل اور مختلف نسلوں سے تعلق رکھنےوالے کروڑوں محنت کشوں کےلئے تابناک اور منصفانہ مستقبل کی امید اور یقین کے ایک قلعے کی علامت بن گئے ہیں ۔ ہر وہ چیز جو ہم تعمیر کر رہے ہیں، ہر وہ چیز جس کی تخلیق کےلئے ہمارے مزدور، کاشتکار، سائنسدان اور فن‌کار کام کر رہے ہیں، ہر وہ چیز جس کی تخلیق کے لئے ہماری پارٹی ہمیں جوش‌وخروش دلاتی ہے وہ دنیا میں امن کےلئے، آزادانہ محنت کا بول بالا ہونے کے لئے، جمہوریت، سوشلزم، قوموں کی برادرانہ دوستی اور تعاون کے لئے، انسان کے لئے، نوع انسانی کے لئے کیا جاتا ہے ۔

اور وہ سوال جو گورکی نے پوچھا تھا کہ : ” تہذیب کے معمارو، تم کس کی طرف ہو ؟“ آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ تیس برس پہلے

تولا کے مصنفین کی تنظیم کے سیکریٹری کے متعلق ایک لطیفہ ھے جس سے جب پوچھا گیا کہ تمہارے ھاں کیا حال ھے تو اس نے بہت خوشی خوشی جواب دیا تھا: ''حال بہت ھی اچھا ھے! پرانے زمانے میں تولا کے ضلع میں صرف ایک ھی ادیب تھے — لیو تالستائی — مگر اس کے مقابلے میں آج انجمن مصنفین کی تولا کی شاخ کے میمبروں کی تعداد تیئیس تک پہنچ گئی ھے۔''

میں اس کی طرح پرامید نہیں ھوں۔ یہ صحیح ھے کہ ھمارے میمبروں کی تعداد میں اضافہ ھو رھا ھے لیکن جیسے کہ امداد باھمی کی انجمن کے میمبر کہا کرتے ھیں: ''ھمیشہ ھی ایسا نہیں ھوتا کہ پیداوار مطلوبہ معیاروں کے مطابق ھوتی ھو۔''

یہ ضرور ھے کہ پچھلے چند برسوں کے دوران میں نظم اور نثر دونوں کی کچھ اچھی کتابیں نکلی ھیں لیکن قریب قریب ناکافی۔ اس کا کافی حد تک قطعی ثبوت ان کتابوں کی فہرست سے ملتا ھے جو لینن انعام کے لئے تجویز کی گئی ھیں۔ دو یا تین کے علاوہ یہ کتابیں ابتدائی بحث تک کے جائزے سے آگے مشکل ھی سے بڑھ سکیں گی۔ یہ کوئی زچ کی کیفیت نہیں ھے۔ مصنفین سخت محنت کر رھے ھیں۔ لیکن معرکۃالآرا کتابیں شائع ھونا کوئی سال کے سال کی بات نہیں ھوتی اور ان کے اکثر و بیشتر شائع ھونے کی توقع کرنا درست بھی نہ ھوگا۔ کراسنودار کے خوش نصیب علاقے ھی کو لیجئے۔ وھاں بھی خراب سال ھوتے اور بری فصلیں حاصل ھوا کرتی ھیں۔ تو پھر ادب سے آپ کیا توقع کر سکتے ھیں؟

مثلاً اگر آپ جنگ کے متعلق ادب ھی کو لیں تو اس کی سست رفتار پیش رفت کا باعث خود موضوع کی پیچیدگی ھے۔ پچھلے چند برس ھی سے جنگ کے بارے میں یادداشتیں خاصی بڑی تعداد میں شائع ھونی شروع ھوئی ھیں۔ اور ھمارے بہت سے معزز و ممتاز کمانڈروں اور فوجی شخصیتوں کو تو اب بھی اپنی داستان سنانی باقی ھے حالانکہ ایک بڑے ناول کی بہ نسبت خود اپنے حالات و واقعات لکھنا نسبتاً زیادہ آسان ھوتا ھے۔ یہ نہ سمجھئے کہ میں اپنے لئے جواز تلاش کر رھا ھوں: بہرحال میں جنگ کے متعلق لکھنے والوں میں ایک اکیلا ھی تو نہیں ھوں اور ھمارے بعد بھی اس کے متعلق دوسرے بہت سے لکھیں گے۔ میں تو صرف احوال واقعی بیان کر رھا ھوں۔

هم سب ایک بڑے کنبے کے افراد ھیں ۔ تو پھر ھمارا رویہ ان غداروں کی جانب کیا ھو سکتا ھے جو اس چیز کو ناپاک کرنا چاھتے ھیں جو ھمارے لئے سب سے زیادہ مقدس ھے ۔ ایک پرانی کہاوت ھے کہ ''ھر گلے میں ایک کالی بھیڑ ھوتی ھے،، ۔ لیکن کالے اور کالے میں بھی فرق ھوتا ھے ۔ اور مجھے یقین ھے کہ اس بات سے سب متفق ھوں گے کہ خود اپنی ماں کو بدنام کرنے، کینہ پروری کے ساتھ اس کی توھین کرنے اور اس پر ھاتھ اٹھانے سے زیادہ ذلیل اور کمینی حرکت کوئی نہیں ھو سکتی!

مجھے شرم ان مصنفوں پر نہیں آ رھی جنھوں نے ھمارے ملک کو بدنام کیا ھے اور جو چیز ھمیں عزیزترین ھے اس پر کیچڑ اچھالی ھے ۔ وہ تو بدچلن ھیں ۔ مگر مجھے ان لوگوں کی وجہ سے ضرور شرم آتی ھے جو ان مصنفوں کی صفائی پیش کرتے ھیں، خواہ وہ کسی وجہ سے ھی کیوں نہ کرتے ھوں ۔

اور ان لوگوں پر مجھے دو چند ندامت ھوتی ھے جو ان سزا یافتہ مرتدوں کو ضمانت پر رھا کرانے کی اجازت حاصل کرنے کی درخواستیں داخل کرتے پھر رھے ھیں ۔

ھم نے جو کچھ پایا ھے اس کے بہت مہنگے دام چکائے ھیں ۔ ھم اپنی سوویت حکومت کی بےحد قدر کرتے ھیں اور اس بات کی ھرگز اجازت نہیں دے سکتے کہ کوئی اس کو بلاخوف سزا بدنام کرتا پھرے ۔

کچھ لوگ ھیں جو انسانی ھمدردی کی دھائی دے رھے ھیں 'سزا کی سختی پر واویلا مچا رھے ھیں ۔ یہاں مجھے ھماری سوویت فوج کی پارٹی تنظیم کے ڈیلی گیٹوں کا ایک جتھہ نظر آ رھا ھے اور میں سوچ رھا ھوں کہ اگر انھیں اپنی کسی ٹکڑی میں کہیں غدار مل جاتے تو وہ ان سے کیا سلوک کرتے؟ ھمارے فوجی اور کسی سے زیادہ اچھی طرح جانتے ھیں کہ انسانی ھمدردی اور بدمست شرابیوں کے دلار میں کیا فرق ھوتا ھے ۔

ایک چیز اور بھی ھے جس کے متعلق میں سوچ رھا ھوں ۔ اگر کہیں یہ سن بیس کی یادگار دھائی میں ھوا ھوتا جبکہ مقدمات قانون تعزیرات کی الگ الگ دفعات کے بجائے ''انقلابی انصاف کی بنیاد پر فیصل ھو رھے تھے،، تو ان نمک حراموں کو سزا بہت مختلف، اف نہایت ھی مختلف ملی ھوتی! اور یہاں بھلا ملاحظہ فرمائیے کچھ لوگ ھیں جو سزا کے ''سخت ھونے،، کی باتیں کر رھے ھیں!

افترا پردازوں کی صفائی پیش کرنےوالے بورژواؤں سے میں کہنا چاھتا

تھا۔ سوویت مصنفوں کی غالب اکثریت اور دوسرے ملکوں کے ترقی پسند مصنفین اپنی تصانیف میں اس سوال کا دوٹوک جواب دیتے ھیں۔

بڑے بڑے، نمائندہ اجتماعات میں مصنفوں، صحافیوں اور اخبار نویسوں سے مجھے بارھا تبادلۂخیالات کرنے کا موقع ملا ھے کہ سماج کی زندگی میں مصنف کا کیا کردار ھوتا ھے۔ پچھلے سال نوبل انعام کی تقسیم کی رسم کے دوران میں اسٹاک‌ھام کے ٹاؤن ھال میں جو تقریر میں نے کی تھی اس کا بڑا حصہ اسی موضوع پر مشتمل تھا۔ سامعین موجودہ اجتماع سے بنیادی طور پر مختلف تھے۔ اور اسی لئے اپنے خیالات کو جن الفاظ کا میں نے روپ دیا تھا وہ بھی اسی مطابقت سے مختلف تھے۔ خیال رھے، ھیئت میں، ماھیت میں نہیں۔

کمیونسٹ کہیں بھی، خواہ کسی زبان میں کیوں نہ بولے وہ ھمیشہ کمیونسٹ ھی کی حیثیت سے بولتا ھے۔ بعضے ایسے بھی ھیں جنہیں ممکن ھے یہ پسند نہ ھو مگر حلق سے انہیں اتارنا ھی پڑتا ھے۔ علاوہ ازیں یہی وہ خوبی ھے جس کا ھر جگہ احترام کیا جاتا ھے۔ جہاں کہیں بھی جلسہ عام میں کوئی سوویت فرد تقریر کرے اس کو سوویت محب وطن کی حیثیت سے بولنا چاھیئے۔ سماج کی زندگی میں مصنف کے کردار کی تعریف بیان کرتے ھوئے ھم کمیونسٹوں کی حیثیت سے، اپنی عظیم مادر وطن کے بیٹوں کی حیثیت سے، ایک ایسے ملک کے باشندوں کی حیثیت سے جو کمیونسٹ سماج کی تعمیر کر رھا ھے، اپنی پارٹی کے اور اپنے عوام کے انقلابی انسان دوست نظریات کے ترجمانوں کی حیثیت سے بات کرتے ھیں۔

وہ معاملہ بالکل مختلف ھوتا ھے جبکہ کوئی مصنف سوویت یونین میں ایک چیز لکھتا ھے اور غیرممالک میں کوئی بالکل مختلف چیز شائع کراتا ھے۔ دونوں صورتوں میں وہ ایک ھی سی روسی زبان لکھتا ھے۔ لیکن پہلی صورت میں اصلیت پر اچھی طرح پردہ ڈالنے کےلئے اور دوسری صورت میں ھر اس چیز کے خلاف جو سوویت ھے، ھر اس چیز کے خلاف جو ھمارے لئے بیش بہا اور مقدس ھے اپنی نفرت اور عداوت سے اس زبان کو ناپاک کرنے کےلئے۔

میں ان مصنفوں میں سے ھوں جنہیں عظیم اور نیک سوویت عوام کا ایک ننھا سا ذرہ ھونے پر فخر ھے۔ ھمیں اپنے خوبصورت اور طاقتور ملک کا سپوت ھونے پر فخر ھے۔ ھمارے ملک نے ھمیں تخلیق کیا اور وہ جو کچھ دے سکتا تھا ھمکو دیا۔ ھم ھر چیز کے لئے اپنے ملک کے مرھون‌منت ھیں۔ ھمارا سوویت وطن درحقیقت ھمارے لئے ایک ماں ھے۔

بہت بڑی بات نہیں ہے مگر یہ پوچھنے کو تو جی چاھتا ھی ہے : یہ بھلا کس قسم کی منصوبہ‌بندی ھوئی؟

پچھلے سال والگا گراد میں کسی فیکٹری کے گندے پانی کو صاف کئے بغیر دریائےوالگا میں آنے دیا گیا تھا یا تو غفلت کے سبب سے یا تحفظی تنصیبات کی منصوبہ بندی میں لاپروائی کے باعث ۔ جس جگہ سے پانی گندہ ہوا تھا وھاں سے چار سو کاومیٹر کے فاصلے تک مردہ مچھلیاں تیرتی پھر رھی تھیں ۔ جانچ پڑتال کی چوکیوں نے نقصان کا جو میزان لگایا تو وہ یہ تھا : ۸۴۲۰۰۰ اسٹرجن (اسٹرجن مچھلیوں کی دوسری قسمیں)، ۳۵۰۰۰۰ فلس‌دار مچھلیاں اور بیشمار چھوٹی مچھلیاں اور انڈے ۔ ھماری قومی معیشت کو جو نقصان ہوا اس کا کوئی ایک کروڑ دس لاکھ روبل کا اندازہ لگایا گیا ۔ اور اس امر کے پیش نظر کہ جب اسٹرجن مچھلیاں مر جاتی ھیں تو آدھی سے زیادہ بجائے سطح پر آنے کے تہ میں بیٹھ جاتی ھیں، نقصان کو اس سے بہ‌آسانی دوگنا شمار کیا جا سکتا ہے ۔

آئیے ھم لوٹ کر پھر جھیل بائیکال کی طرف آئیں ۔ اس کے بارے میں بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے ۔ لیکن اخبارات کی سخت تنبیہوں پر ایسا نہیں ہے کہ ھمیشہ ھی کان دھرے جاتے ھوں اور کیا معلوم والگا میں جو کچھ ہوا وھی بائیکال میں بھی نہ ھو؟ کیوں نہ ھم کوشش کریں اور ھمت کرکے جھیل بائیکال کے اطراف کے جنگلات کاٹنے اور وھاں لگدی اور کاغذ کے کارخانے تعمیر کرنے کا ارادہ ترک کر دیں اور ان کے بجائے اس قسم کی فیکٹریاں بنائیں جن سے روسی قدرتی منظر کے اس مخزن کو کوئی خطرہ لاحق نہ ھو ؟ بہرحال بائیکال کو بچانے کے لئے تمام ضروری کارروائیاں کرنی چاھئیں ۔ اگر ھم ”روس کے تابناک سمندر، مقدس بائیکال!“ کو محفوظ رکھنے میں ناکام رہے تو آنےوالی نسلیں ھمیں ھرگز معاف نہ کریں گی ۔

ساتھیو، مجھے آپ کے سامنے ایک ذاتی مسئلہ بھی پیش کرنا ہے ۔ پرسکون ڈان پر تباھی نازل ھو رھی ہے ۔ ماھروں کا کہنا ہے کہ صنعتی کارخانے ھر سال اس میں ستر لاکھ مکعب میٹر گندہ پانی چھوڑتے ھیں ۔ بحیرۂآزوف کو حقیقی خطرہ لاحق ہے — آئندہ چندھی برسوں میں اس کے مچھلیوں کے محفوظ ذخیرے نہایت ھی قلیل ھو کر رہ جائیں‌گے ۔ پہلے صرف بیش قیمت مچھلیاں ھی سال بھر میں ۱۰۰۰۰۰ ٹن سے زیادہ پکڑی جاتی تھیں ۔ اب بمشکل ۱۰۰۰۰ ٹن پکڑی جاتی ھیں یا بہ الفاظ دگر دسواں حصہ ۔

هوں : ہمارے ملک میں تنقید کے تحفظ کے بارے میں آپ فکر مت کیجئے۔ تنقید کی ہم حمایت کر رہے ہیں، اس کو نشوونما دے رہے ہیں۔ اور موجودہ کانگرس میں بھی کہیں زیادہ سخت تنقید ہوئی ہے۔ لیکن بدنام کرنے کو تنقید نہیں کہتے اور گڈھے کی کیچڑ مصور کی تختی پر سے لیا ہوا روغن نہیں ہوتی۔

ساتھیو، ادب کے بارے میں مسائل کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرائے اب بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ یہ سوچنے لگیں کہ ہم مصنفوں کے لئے ادبی امور ہی تمام چیزوں کا آغاز اور انجام ہیں۔ اس کے علاوہ بھی ہماری دلچسپیوں کی بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً مصنف لیوند لیونوف نے اپنی زندگی کے کئی سال جنگلات کو — روسی دیہات کے حسن و دولت کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کےلئے وقف کئے۔ دوسرے مسئلے بھی ہمارے ذہن پر چھائے رہتے ہیں۔ جس چیز کے بارے میں اب میں بولنےوالا ہوں اس کا ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہمیں جھیل بائیکال کے مسئلے کو حل کرنا چاہئے۔ اور میں آپ سے اپنے ہاں کی منصوبہ بندی کے بارے میں چند باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

پانچویں مارچ کو ''پراودا،، میں و۔ تیتوف کا ایک مضمون بعنوان ''انتظامیہ کی غزل سرائیاں،، شائع ہوا۔ اس مضمون میں جو کچھ واضح کیا گیا تھا وہ مختصراً یوں ہے : کسی زمانے میں روسی فیڈریشن کی غذائی صنعت کی وزارت نے فیصلہ کیا تھا کہ شہر کلیازین میں ترکاریاں خشک کرنے کی ایک فیکٹری تعمیر کی جائے۔ یہ فیکٹری درحقیقت تعمیر بھی ہو گئی مگر پتہ یہ چلا کہ اس کو جتنے خام مال کی ضرورت ہوتی ہے وہ فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ فیصلہ کیا گیا کہ اس کو سویابین کی چٹنیاں بنانے کی فیکٹری میں تبدیل کر دیا جائے۔ جب یہ کام بھی ہو گیا تو پتہ چلا کہ ماسکو اور سرپوخوف کی فیکٹریاں ماسکو اور علاقۂ ماسکو کے لوگوں کی ضرورت بھر کی چٹنی فراہم کر رہی ہیں۔ پھر بیش‌قیمت درآمدشدہ مشینیں لائی گئیں تاکہ اس جگہ کو دودھ کی فیکٹری میں تبدیل کر دیا جائے لیکن اس سے پہلے کہ مشینیں پوری طرح نصب کی جاتیں فیصلہ یہ کر لیا گیا کہ مرغیوں کا مذبح قائم کرنا بہتر رہیگا۔ بینک نے بہت بڑا قرضہ منظور کیا۔ مگر ایک بار پھر پتہ یہ چلا کہ اس کارخانے کی گنجائش خام مال فراہم کرنے کی موجودہ صلاحیت سے کئی گنی زیادہ ہوگی۔ فیکٹری کو وجود میں آئے دس برس ہو چکے ہیں اور مختلف تبدیلیاں کرنے پر قریب دس لاکھ روبل صرف کئے جا چکے ہیں۔ غالباً یہ کوئی

کامریڈ ایشکوف کے لئے میری یہی دعا ہے : ''وہ جیتے رہیں اور سارڈیل چرتے رہیں!،،

مجھے یہ بھی عرض کرنا ہے کہ مچھلیوں کے علم کے ہمارے ماہروں کا حصہ بھی نہایت ہی قلیل ہے اور ہماری قومی معیشت کی ضرورتوں کے مقابلے میں بہت ہی اوچھا پڑتا ہے۔ جاپان، رومانیہ اور دوسرے ملکوں میں تالاب کے فی ہیکٹر سے پکڑی جانےوالی مچھلیوں کا جو اوسط پڑتا ہے وہ ہمارے ہاں کی بہ‌نسبت کئی گنا ہوتا ہے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ موازنہ ہمارے حق میں نہیں ہے اور اس پر ان لوگوں کو سوچ بچار کرنا چاہئے جن کا کام معیشت کی اس خاص شاخ کے متعلق غور و فکر کرنا ہے۔ ان کو جلد ہی سوچ بچار کرنا ہے کیونکہ ہمارے دریاؤں میں سے پانی کے تیزی سے اخراج کے باعث جلد ہی تالابوں میں ماہی گیری کا مسئلہ پوری شدت کے ساتھ ہمیں درپیش ہوگا۔

میں نے اپنی تقریر میں ماہی گیری پر اتنی ہی توجہ دی ہے جتنی ادب پر۔ کیا آپ کا خیال ہے کہ اس میں کوئی بھید نہیں؟ جی نہیں۔ میں مچھلیوں کی افراط چاہتا ہوں — روچ، وبلا وبلا اور ہیرنگ — سمندری کیل نہیں۔ جنہیں سمندری کیل لذیذ معلوم ہوتی ہو وہ وہی کھائیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں تو مچھلیوں کو محفوظ رکھنے کا حامی ہوں، کیونکہ اس میں فاسفورس بہت ہوتا ہے، جس کے متعلق دعوی کیا جاتا ہے کہ دماغ کےلئے مفید ہے، اور اس کو زوردار طریقے سے کام کرنے کے قابل بنا دیتا ہے۔ اور، بہرحال، جس چیز کو دماغ کہتے ہیں اس کی ضرورت صرف مصنفوں کو ہی نہیں ہوتی!

اگر آپ اجازت دیں تو منصوبہ‌بندی کے متعلق چند باتیں اور۔ اپنی بات کے ثبوت میں ایک مثال پیش کروں‌گا۔ عام طور پر میں منصوبہ‌بندی کے حق میں ہوں، لیکن میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ افراط ہو۔ علاقۂ‌روستوف کے اجتماعی فارموں اور ریاستی‌فارموں کے پاس ٹریکٹر ان کی ضرورتوں سے دو ہزار کم ہیں۔ جس قسم کی منصوبہ‌بندی کا میں حامی ہوں وہ ایسی ہونی چاہئے کہ وزیر زراعت کامریڈ متسکیئےوچ فارموں کو یہ ٹریکٹر خود پیش کریں تاکہ ہمیں اپنے علاقائی عہدیداروں کو ماسکو نہ بھیجنا پڑے تاکہ جائز یا ناجائز کسی طرح سے بھی انہیں حاصل کریں۔ اب ہوتا کیا ہے ؟ ان لوگوں کو ماسکو جاتے اور کچھ نہ کچھ چیزیں حاصل کرکے آتے دیکھ کر میں بھی اپنے رستے اسی طرح چل پڑتا ہوں۔ قدرتی بات ہے کہ میرا پیمانہ چھوٹا ہوتا ہے : میں ایک نیا

صنعتی غلاظت چھوڑے جانے، تسملیانسکایا بند سے ڈان کے پانی کے کنٹرول اور ان سب باتوں کے علاوہ سوویت یونین کی ماھی گیری صنعت کے وزیر کامریڈ ایشکوف کے نظم و نسق میں زیادہ دوراندیشی سے کام نہ لئے جانے کے باعث بحیرۂ آزوف کا علاقہ تباھی و بربادی سے ھمکنار ھوگیا ھے۔ ''لتیراتورنایا گزیتا،، اور ''کومسوسولسکایا پراودا،، نے جو جائز حملے کئے تھے ان کے جواب میں طویل خاموشی کو توڑتے ھوئے کامریڈ ایشکوف نے آخر کار ایک بودا سا مضمون ''بحیرۂ آزوف آج اور کل،، لکھا ھے۔ اگر کامریڈ ایشکوف آج بحیرۂ آزوف کا انتظام اسی طرح کرتے رھے تو اس کا ''کل،، نہیں ھو سکتا۔ ان کی اجازت سے ھی گرمیوں کے دو مہینوں کے علاوہ سارے سال قریب قریب دو سو جہاز بلہیڈ اور سارڈیل مچھلیاں پکڑنے میں مصروف روھتے ھیں۔ ان کی ھدایات سے ھی کیچڑ چوسنے کی مشینیں ھی ایک کروڑ سے زیادہ چھوٹی چھوٹی پائکپرچ مچھلیاں سالانہ ھلاک کر ڈالتی ھیں اور اس طرح بحیرۂآزوف کے ان اداروں کی تمام کوششوں کو ناکارہ کر دیتی ھیں جو مچھلیوں کی افزائش نسل اور ان کے انڈوں کی دیکھ بھال کا کام کرتے ھیں۔

ماھی گیری اور تحقیق کی تنظیموں کی کانفرنس کا تصدیق کے لئے حوالہ دیتے ھوئے کامریڈ ایشکوف دعوی کرتے ھیں کہ اب بھی ھر سال چالیس سے پچاس ھزار ٹن تک سارڈیل مچھلیاں پکڑی جا سکتی ھیں۔ جس چیز کا وہ تذکرہ نہیں کرتے وہ یہ ھے کہ سارڈیل مچھلیوں کے ساتھ ساتھ بیش‌قیمت مچھلیوں کے چھوٹے*چھوٹے بچے بھی پکڑ لئے جایا کرتے ھیں۔

میں اقرار کرتا ھوں کہ کل تک میرا ارادہ یہ تھا کہ کامریڈ ایشکوف کی سخت‌ترین الفاظ میں مذمت کروں، لیکن شام کو میری ملاقات محاذجنگ کے اپنے کچھ دوستوں، اپنے اچھے پرانے ساتھیوں سے ھوئی اور شیطان نے آکر مجھے بہکایا تو میں نے ان کو اپنی وہ تقریر دکھا دی جو تیار کی تھی۔ انھوں نے مجھ پر سخت کلامی کا الزام لگایا اور کہا کہ کامریڈ ایشکوف کچھ برے آدمی اور برے کارکن نہیں ھیں اور مجھ سے وعدہ لے لیا کہ اپنی تقریر کو نرم کردوں۔ محاذ جنگ کے اپنے دوستوں کےلئے کوئی بھلا کیا کچھ نہیں کرتا! میں تو اسٹرجن کی یعنی وزیر کی تنقید کرنا چاھتا تھا۔ اور سارڈیل کی — ماھی گیری کے روستوف کے یا کہیں اور کے بورڈ کی تنقید سے بھلا کیا حاصل؟ خیر چلئے، وعدہ تو وعدہ ھوتا ھے اور اس لئے میں کچھ اور نہیں کہوں گا۔ چنانچہ

طرح بن پڑتی ھے آپ کچھ حاصل کر لیتے ھیں۔ چنانچہ آپ نے دیکھا مصنفوں کی زندگی کچھ ھنسی کھیل نہیں۔

اس اعلی منبر سے تقریر کرتے ھوئے میں نے جس طرح مسکرا مسکرا کر باتیں کی اس کےلئے معافی کا خواستگار ھوں۔ سنجیدگی سے عرض کروں تو ھم سب اپنی پارٹی کی دانشمندی پر، پارٹی ھمیں جن فرائض کی تکمیل کی ذمہ‌داری دیتی ھے انہیں مکمل کرنے پر پورا پورا عقیدہ رکھتے ھیں۔

اور آپ، پیارے کامریڈ ڈیلی گیٹو، مطمئن رھیں کہ ھزارھا مصنفوں کی فوج، جو ملک کی اور عوام کی خدمت کےلئے سچے دل سے اپنے آپ کو وقف کر چکے ھیں، آرٹ اور ادب کے متعلق ان خیالات سے پوری طرح متفق ھیں جو ھماری مرکزی کمیٹی کی رپورٹ میں واضح کئے گئے ھیں اور اپنی لیننی پارٹی کی پالیسی کی تہ‌دل سے حمایت کرتے ھیں۔

۱۹۶۶ء

انسان دوست وہ شخص ھے جو جہاد کرتا ھے
(ایک خط سے اقتباس)

پیارے دوستو اور مصنف بھائیو!

سب سے پہلے میں اس نیک مقصد میں جس کے لئے ھم یہاں جمع ھوئے ھیں اس اجتماع کی کامیابی کا دعاگو ھوں۔

دوسرے ملکوں کے ھمارے مہمانوں، ھمارے شرکائے کار کو جنھوں نے ھمارا دعوت‌نامہ قبول فرمایا اور اس جلسے میں شرکت کرنے اور اس کی کارروائیوں میں حصہ لینے کے لئے طویل اور مشکل سفر کیا انھیں تہ دل سے خوش آمدید۔

یہ مصنفوں کا معمولی اجتماع نہیں ھے جہاں خالص ادبی مسائل پر تبادلۂخیالات ھوتے ھیں۔ یہاں ھم جس موضوع پر بات‌چیت کریں‌گے وہ ھے مصنف کا فرض‌منصبی، ھمارے کام کا مقصد اور نوع انسانی کے روبرو مصنف کی ذمہ‌داری۔

ھیئت کے اعتبار سے ادبی پیشہ دنیا کے سب سے زیادہ انفرادیت‌پسندانہ پیشوں میں سے ھے۔ اس کے لئے مصنف کو یوگیوں کی سی تنہائی میں گھنٹوں اپنے قلمدان کے سامنے بیٹھنا پڑتا ھے۔ اور میرے خیال میں کسی مصنف کے لئے دوسرے مصنف سے مشابہت سے زیادہ تباہ‌کن کوئی اور

اسکول کھلوانا چاہتا ہوں، یا پھر میں اجتماعی فارم کےلئے چھت چھانے کا سلیٹ پتھر حاصل کرنا چاہتا ہوں یا کچھ عمارتی لکڑی ۔ تو پھر میں وزیر کے پاس پہنچتا ہوں اور عرض کرتا ہوں: ''کامریڈ وزیر، اجتماعی فارم کے مویشیوں کے باڑے پر چھت ڈالنے کے لئے تین ہزار ٹکڑے سلیٹ پتھر کے ہمیں دلوا دیجئے ۔،، اور جناب وزیر جواب دیتے ہیں: ''لیکن ہماری معیشت تو بامنصوبہ ہے، آپ کو تو خود سمجھنا چاہئے! منصوبے کے تحت آپ کو جو کچھ ملنا تھا وہ سب آپ کو پہنچایا جا چکا ہے ۔،، اور میں انہیں جواب دیتا ہوں: ''میں تو سمجھتا ہوں مگر گائیں اور خاص طور سے بچھڑے بالکل نہیں سمجھیں گے کہ وہ خزاں کی بارش میں بھیگ کر چوڑا کیوں ہوں اور سردیوں میں کیوں ٹھٹھریں۔،، چھتوں پر سلیٹ پتھر کی تختیاں اس لئے نہیں چھائی جاتیں کہ وہ خوش‌نما یا حسین ہوتی ہیں بلکہ محض اس لئے کہ اس میں بچت ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ اگر مویشیوں کے باڑوں کی چھتیں بھوسے سے چھائی جائیں تو کسانوں کی ہمت افزائی نہیں ہوگی کہ وہ چارہ بہت سارا جمع کریں: کمی پڑ جانے کی صورت میں وہ گایوں کو جب چاہیں، چھپر کھلا سکتے ہیں لیکن چھت اگر سلیٹ کی ہو تو وہ جوں کی توں رہیگی۔

اور جب آپ کچھ نہ کچھ مانگنے مستقل جاتے رہتے ہیں تو اپنی خصلت میں ناگوار تبدیلی آتی معلوم ہوتی ہے، یہاں تک کہ ڈیل ڈول میں بھی۔ مصنف کی پروقار چال ڈھال کو اور پرانے فوجی کے چاق چوبند انداز کو کیا ہوگیا؟ آپ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ منت سماجت کرتے کرتے کمر جھک گئی ہے اور یہ کہ آپ وزیر کو ''کامریڈ وزیر،، کہہ کر رسمی انداز میں مخاطب نہیں کرتے بلکہ دلجوئی کے انداز میں ''پیارے ایوان ایوانووچ،، کہتے ہیں ۔ رفتہ رفتہ منصوبہ‌بندی میں ہماری تصحیح جس کے لئے خود زندگی ہمیں مجبور کرتی ہے آپ میں حرص و ہوا کے بعض رجحانات پیدا کر دیتی ہے ۔ یہاں اس کانگرس میں بھی جب آپ مختصر التوا کے دوران میں برآمدے میں ٹہلتے ہوتے ہیں تو شکرے کی سی نگاہوں سے کسی وزیر یا اور کسی کی تلاش میں رہتے ہیں اور اس دوران میں نہایت سرگرمی سے یہ سوچتے رہتے ہیں کہ ''اس سے میں کیا حاصل کر سکتا ہوں؟،، اور جب آپ کسی وزیر کو ملاقات کا وقت حاصل کرنے کے لئے ٹیلی‌فون کرتے ہیں تو یہ کبھی نہیں کہتے کہ آپ اعلی سوویت کے میمبر ہیں بلکہ کہتے ہیں کہ آپ مصنف ہیں ۔ وزراءٔ مصنفوں کی بات زیادہ آسانی سے مان لیتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ جس

کی حفاظت کرے، اور اپنی زندگی اور اپنے مستقبل کی تعمیر اپنی مرضی کے مطابق کرے۔ سوویت عوام اپنے دلسوز تجربے سے جانتے ہیں کہ خون کے پیاسے دشمن کے خلاف جو ہمیں اپنی آزادی اور خود زندگی تک سے محروم کرنے میں کسی چیز سے بھی دریغ نہ کرتا ہو، لڑنے کے کیا معنے ہیں۔ ہم ہمیشہ ان لوگوں کی طرف‌داری کرتے ہیں جو اپنی قومی آزادی حاصل کرنے کے لئے سامراجی ظالموں کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں۔

آج اس گول میز پر جو مصنف جمع ہوئے ہیں ان کو اس ضرورت کا سامنا ہے کہ اپنے لئے غیرمبہم نتائج اخذ کریں۔ سوویت مصنفین عرصہ ہوا اپنا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے سہمان، اپنے اپنے ادبوں کے نمائندے ہماری نیت کی قدردانی فرمائیں‌گے۔ ہمارے برادر ویت‌نامی عوام کو اور ساری دنیا میں قومی آزادی کی تحریک کو عملی امداد اور سہارے کی ضرورت ہے۔

اور کیا آپ کو ایسا نہیں لگتا کہ آج دنیا کی قوموں کے لئے جو واقعات باعث تشویش بنے ہوئے ہیں ان سے مشابہت نہیں رکھتے ہیں جو تیس برس پہلے رونما ہوئے تھے جبکہ فاشزم نے عالمگیر مسلح تصادم سے قبل اسپین میں اپنی زورآزمائی شروع کر دی تھی۔ یہ کہاوت تو سب ہی جانتے ہوں‌گے کہ ''دیوتا آ کر هانڈی نہیں پکاتے،،۔ میرا خیال ہے کہ اگر زمانۂ قدیم میں دیوتاؤں کو هانڈیاں بنانے اور پکانے کا پیشہ اختیار کرنے پر رضامند کرلیا گیا ہوتا تو نوع‌انسانی کا اسمیں کوئی خسارہ نہ ہوتا۔ لیکن آج کے سیاسی کمہار، جب اپنے آپ کو دیوتا سمجھ کر ہر جگہ بزور شمشیر اپنا ''نظام‌نو،، مسلط کرنا شروع کر دیتے ہیں تو یہ بالکل مختلف چیز ہے۔ اس سے ہمیں، سب سے پہلے ہم مصنفوں کو خبردار ہو جانا چاہئے۔ ہر صاحب‌فکر کے دل میں اس سے منصفانہ خفگی اور غم و غصے کے جذبات پیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ہمیں آنجہانی جیولیس فوچک کے قول کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہئے: ''لوگو، خبردار رہو!،، اور مصنفوں کے معاملے میں کہا جاسکتا ہے: عمل کا وقت آ گیا ہے!

ہماری قوت، مصنفوں کی قوت ہمارے ان الفاظ کے خروش میں مضمر ہے جو لوگوں کے دل و دماغ پر چھا جاتے ہیں، ان کی قوت کو بڑھاتے، ان کے عزم کو تقویت پہنچاتے ہیں، انسان کے لئے، انسان‌دوستی، قوموں کی آزادی اور اخوت کی روشنی کےلئے، سامراجی درندگی کی تاریکی کے خلاف جدوجہد کے لئے انہیں بیدار کرتے ہیں۔

چیز نہ ہوگی۔ یہ ایک ایسا پیشہ ہے جس پر شہری ذمہ‌داری کا انتہائی بھاری بوجھ لدا ہوا ہے۔ اور اس اعتبار سے حقیقی فنکاروں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہوتا۔ ہم میں سے ہر ایک اس امید میں لکھتا ہے کہ اس کے بول سننے کے خواھشمندوں کے زیادہ سے زیادہ کانوں تک پہنچ سکیں گے۔ ھمیں مسرت اس وقت ھوتی ہے جب اپنی ''ذات،، کی ننھی سی دنیا کے اظہار میں نہیں بلکہ کسی ایسی چیز کو ظاھر کرنے میں کامیابی حاصل ھو جاتی ہے جو کروڑوں لوگوں کے دل ودماغ میں ھلچل پیدا کر دے۔

دنیا میں واقعات رونما ھوتے رھتے ھیں اور ایسا زمانہ آ جاتا ہے جو ھم پر لازم کر دیتا ہے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں تاکہ مل جل کر اپنے اھم مسئلے طے کر لیں، اور اپنی کوشش کی باطنی ماھیت، مصنف کے ضمیر، انسان دوستوں کے ضمیر سے متعلق سوالوں کے جواب تلاش کریں۔

سوال یہ ہے کہ جب پوری ایک قوم کی جدوجہد اور صعوبتوں کا معاملہ ھو تو مصنف کو کیا رویہ اختیار کرنا چاھئے؟

انسان دوستی، انسان سے، نوع انسانی سے محبت... مختلف لوگ، انسانی سماج کی کن قوتوں کی وہ نمائندگی کرتے ھیں اس کے مطابق اس تصور کی کتنی مختلف تعبیریں پیش کرتے ھیں!

ھم کمیونسٹوں کا جو یقین ہے اس کے مطابق ھم سوویت مصنفوں کی رائے یہ ہے کہ جب کوئی قاتل یا لٹیرا کسی کو قتل کرنے یا لوٹنے کے لئے ھاتھ اٹھاتا ہے تو سچا انسان دوست اس بات کی جدوجہد کرے گا کہ قاتل کی کلائی موڑ دے، اور اس کی بدی کی خواھش کو ناکارہ کر دے اور محض بیچارے مقتول کا ماتم کرنے اور اس حقیقت پر آہ و زاری کرنے پر ھی اکتفا نہ کرے کہ دنیا میں قتل کا اب بھی وجود ہے۔

تو پھر اس وقت انسان دوستوں کی ذمہ‌داری اور فرض میں کتنا گنا اضافہ ھو جاتا ہے جبکہ کسی بڑے، طاقتور ملک کے سامراجی وحشیانہ قتل و غارتگری کا بازار گرم کرتے ھیں جن کا نشانہ بننے والے کسی چھوٹے سے ملک کے پروقار اور جوانمرد لوگ ھوتے ھیں جو اپنی خودمختاری کے لئے بہادری کے ساتھ نبرد آزما ھوتے ھیں۔

فن کار کا دائمی موضوع نیک و بد کے درمیان، اجالے اور اندھیرے کے درمیان جدوجہد ھوتی ہے۔ ھمارے دور میں اس جدوجہد کے واضح طبقاتی معنے ھوتے ھیں۔

ھر قوم کا اٹل، مقدس حق ھوتا ہے کہ اپنی خودمختاری اور عزت

بین‌الاقوامی ادبی سمپوزیم کو ایک برقیہ

پیارے ساتھیو !

یہاں تاشقند میں منعقد ہونے والے بین‌الاقوامی ادبی سمپوزیم میں شرکت کرنے‌والے آپ حضرات کے ساتھ ذہنی طور پر جو بھی موجود ہوگا اس کے خیالات اور احساسات پر عہد پارینہ کی دانش اور زمانۂ حال کے مسائل چھائے ہوئے ہوں‌گے ۔

یہ سالگرہ کا سمپوزیم ہے ۔ دس برس ہوئے کہ یہاں تاشقند میں ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کے مصنفوں کا جلسہ ہوا تھا اور دنیا میں امن کے تحفظ اور نوع انسانی کی ترقی کے نیک مقصد کے لئے مصنفوں کی انجمنوں کے دائرے میں منظم مصنفوں کے درمیان نتیجہ‌خیز تعاون کی بنیادیں استوار کی تھیں ۔

آج جو مسائل ہمیں درپیش ہیں وہ تاکیداً مطالبہ کرتے ہیں کہ ادب کا ہر باکمال ان سوالوں کا جواب دے : وہ کس کے ساتھ ہے؟ اپنے قلم، اپنے کام، اپنے فن سے وہ کس کی اور کیا خدمت انجام دیتا ہے؟ ہمارے دور کا مطالبہ ہے کہ ہم اس کے اہم مسائل چھیڑنے اور حل کرنے میں سرگرم عملی حصہ لیں ۔

آپ کو نوائی کی جنم‌بھومی میں ان کے جشن میں بھی شرکت کرنے کی خوش‌نصیبی حاصل ہوگی ۔ بہت سی قوموں کو اپنے عظیم شعرا پر فخر ہوتا ہے ۔ ایسا کم ہی ہوتا ہے کہ پانچسو پچیسواں جشن ولادت منایا جائے ۔ محنت و سخاوت انسانی کے مغنی نے دنیا کےلئے علم و دانش کا جو خزانہ ورثے میں چھوڑا ہے اسے ان کے ہموطنوں نے سیکڑوں ہزاروں برسوں کے لئے سنبھال کر رکھا ہے ۔ اس علم و دانش کی روشنی سے موجودہ سمپوزیم میں آپ بھی اپنی راہیں روشن کیجئے :

”اور انسان کے معزز نام
کا مستحق وہی ہے جس کے خیالوں
کا مرکز عوام ہوں ۔ “

یہ نوائی نے کہا تھا ۔ ہمیں چاہئے کہ ان کے قول پر توجہ دیں ۔

۱۹۶۸ء

یہی وجہ ہے کہ ہم سوویت مصنفین، دنیا میں رونما ہونےوالے واقعات پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ایشیا اور افریقہ کے مصنفوں سے، تمام ملکوں اور براعظموں کے مصنفوں سے یک‌جہتی کی، اتحاد کی اپیل کرتے ہیں۔ یہ مصنفوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے، انسان دوستوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے، بین الاقوامیت پسندوں کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے۔

ہر بڑھتا ہوا قدم منزل کو قریب تر لاتا ہے۔ آج کا جلسہ ایسا ہی ایک قدم ہو۔

۱۹۶۶ء

کتاب ''کیروف کارخانے کی تاریخ،، کا پیش‌لفظ

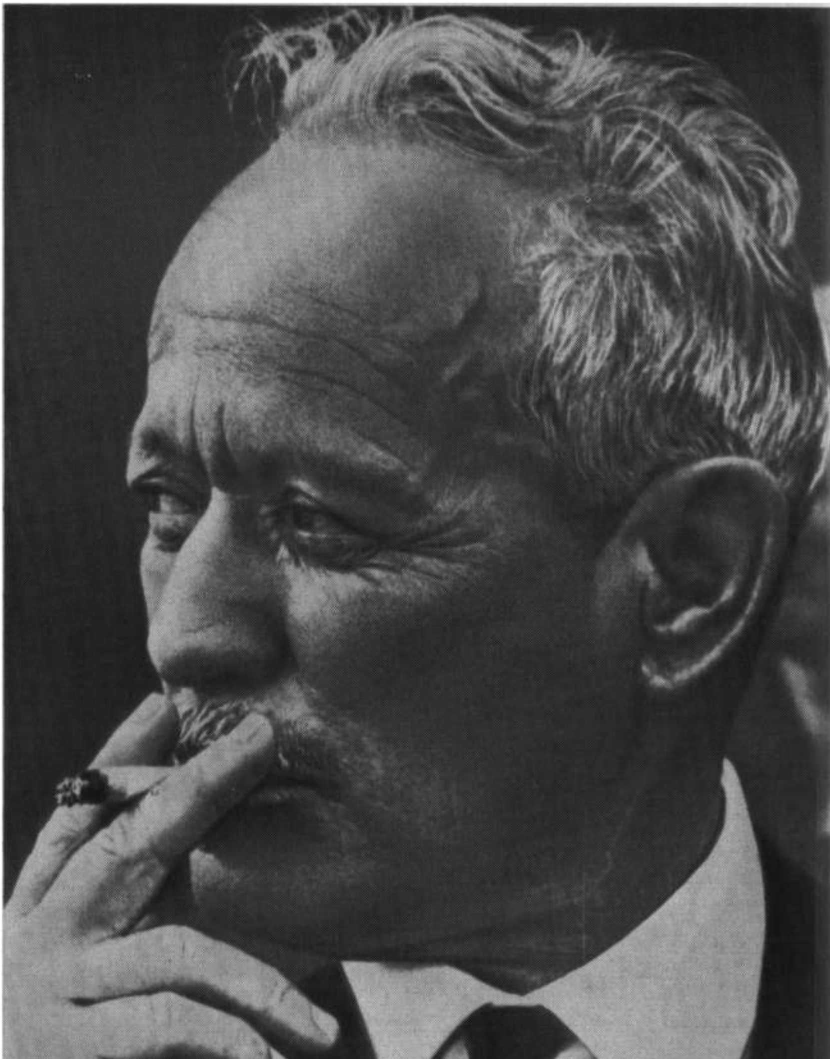
کیروف کارخانے کی تاریخ مرتب کرنے کا بےحد اہم کام کامیابی کے ساتھ انجام دے لیا گیا۔

کارخانے کی پیدائش، قیام اور ارتقا کی طویل مدت کے پورے اور ہر ایک پیچیدہ عمل کا، ایک ایسے عمل کا جس میں مزدوروں، انجینئروں اور ٹکنیکی ماہروں کی کئی نسلوں کی زندگی صرف ہوئی، کوئی بھی ناول احاطہ نہیں کرسکتا تھا۔

لیکن تاریخ اور ناول ایک دوسرے سے علیحدہ کے بجائے باہم تکمیلی اصناف تحریر ہوتے ہیں اور اس لئے اگر کیروف کارخانے کے مزدوروں کے متعلق، ان کے الوالعزم اور ڈرامائی تجربوں پر مبنی پلاٹوں کی مدد سے ناول اور افسانے لکھے جاتے ہیں تو افسانوی ادب کے مصنفوں کی ان کتابوں اور مورخوں کی موجودہ کتاب کا زندگی میں باہم ساتھ رہیگا۔

اس کارخانے کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے معاً خیال آنے لگتا ہے کہ آنےوالی نسلوں کے لئے (اور صرف کیروف کارخانے کے مزدوروں کی نسلوں کے لئے ہی نہیں) یہ کتاب اس احوال واقعی کی حیثیت سے بےحد قدر و قیمت کی ہوگی کہ سینٹ‌پیٹرس‌برگ — پیٹروگراد — لینن گراد کے جانباز مزدور طبقے نے کس طرح مصیبتیں اٹھائیں، جدوجہد کی، فتوحات حاصل کیں اور کامیاب ہوگیا!

۱۹۶۶ء



۱۹٦٦ء کی ایک تصویر ۔

سوویت کمیونسٹ پارٹی کی چوبیسویں کانگرس میں تقریر

ڈیلی گیٹ ساتھیو !

ھمارے لئے، سوویت مصنفوں اور فنون لطیفه میں کام کرنےوالوں کےلئے یه پانچ سال کمیونسٹ پارٹی کے پرچموں کے زیرسایه اور بھی قریب ھوکر مجتمع ھونے کے، اپنے سیاسی نظریات، اپنی جمالیاتی تہذیب اور سب سے اھم یه که سوویت عوام یعنی قارئین، ناظرین اور سامعین کی، ان سب کی جن سے ادب اور فنون مخاطب ھوتے ھیں، کمیونسٹ تعلیم کےلئے ذمهداری کا اور بھی زیاده واضح احساس حاصل کرنے کے سال ثابت ھوئے۔

ھم فخر کے ساتھ توثیق کر سکتے ھیں که ھمارے ادب نے سوویت اقتدار کے قیام کے روز اول ھی سے وفاداری اور دیانتداری کے ساتھ عوام کی خدمت کی ھے اور اس کی آواز، بقول ھمارے روسی شاعراعظم، واقعی ''مصیبت کے وقت اور مسرت و شادمانی کے دنوں میں سب کو آگاہ کرنے کے لئے گجر کی طرح گونجی،،۔

حسب سابق اس کی آواز ھمارے ملک سے باھر بھی سنی جاتی ھے اور پہلے کی طرح وہ محنت کش نوع انسانی کو بیدار کرتی اور ھر محنت کش کے دل و دماغ کو حقیقی ترقی کے لئے، امن کے لئے اور ھمارے کرۂارض کے تمام سوچنے سمجھنےوالے لوگوں کی انتہائی قابل‌اعتماد آرزو — کمیونزم — کے لئے جدوجہد کرنے کےلئے متاثر آمادہ کرتی ھے۔

بغیر کسی تصنع‌آمیز انکسار کے کہا جاسکتا ھے که آرٹ کے وسیلے سے ھم نے عوام کے اخلاقی اور روحانی ارتقاء کو بڑھاوا دیکر ان کی ازسرنو تعلیم میں قابل‌لحاظ پیشقدمی کی ھے۔ اس حقیقت کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ھے که ھمارے ادب میں جسقدر بلند نظریاتی پیغام ھوتا ھے اتنا کسی اور ادب میں نہیں ھوتا۔ کیا آپ کسی ایسے ملک کا نام لے سکتے ھیں جو اس اعتبار سے ھمارے مقابلے میں آسکے؟ میں بلاخوف تردید دعوی کر سکتا ھوں که ایسا کوئی ملک نہیں ھے اور کوئی ادب ایسا نہیں ھے۔

تہذیبی ارتقاء کے عالمی عمل میں سوویت ادب اور فن جو مجاھدانه کردار ادا کرتے ھیں اس کا سب سے پہلے تعین اس کمیونسٹ نظریے اور جانبداری سے ھوتا ھے جو ھمارے فنکاروں کی بہترین تخلیقات میں رچے ہوئے ھوتے ھیں۔ یہی وہ خوبی ھے جو ھمارے نظریاتی دشمنوں اور ان کے



سپاٹ میدانوں کا ایک سفر۔



ایک جاپانی طالبہ آٹوگراف لے رہی ہے۔

نکو آبشار کے پاس۔





مختلف ملکوں کے نوجوان ادیب شولوخوف کی دعوت پر ویشنسکایا آتے
رہتے ہیں ۔



یوری گگرین کے ساتھ ساحل ڈان پر ۔

شولوخوف اپنے نوجوان شرکائے کار سے باتیں کر رہے ھیں ۔



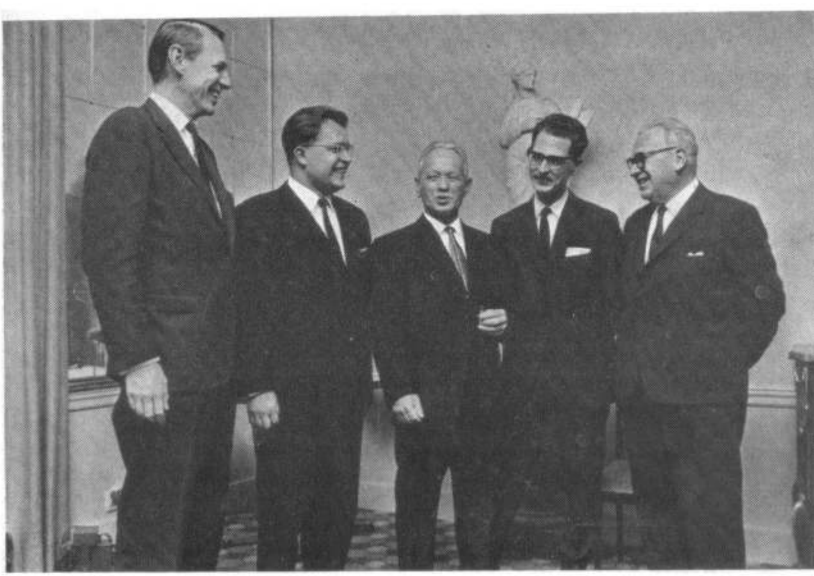


بلغاریہ کے اشاعت گھر ''نرودنا ملادیژ،، کے ڈائریکٹر ایوان پوپوف
شولوخوف کے ہاں مہمان آئے ہیں۔



شولوخوف اور یوری گگارین ادیبوں کے ساتھ۔

شولوخوف ناشروں کے ساتھ۔



ساجھیوں — ترمیمیت‌پرستوں میں جوش‌جنون پیدا کرتی ھے۔ وہ چاھیں‌گے کہ ھم ان کے قائل ھوکر سوشلزم اور کمیونزم کے پکے مجاھدوں کا سلجھا ھوا رویہ ترک کردیں اور پارٹی اور عوام کے مفادات کی خدمت کرنے کے اپنے بنیادی اصولوں سے ھٹ جائیں۔

سوشلسٹ حقیقت‌پسندی کا تختہ پلٹنے کے نمایاں امیدواروں میں سابق آسٹریائی کمیونسٹ فشر مین بھی ھیں۔ ''خالص،، اور مکمل طور پر غیرمحدود آزادی کے یہ مشہور ماھر ھمارے سوویت آرٹ کو نہایت جوش و خروش سے مطعون کرتے ھیں۔ وہ کہتے ھیں کہ سوویت یونین میں آرٹ بیڑیاں پہنے ھوئے ھے اور ''پابند،، ھے اور اس وجہ سے وہ بہت ھی غمگین ھیں۔ ان کی تمنا ھے کہ ھمارے آرٹ کی بیڑیاں کاٹ دیں اور اس کو جانب‌داری سے، سماج کی خدمت کرنے کے نیک فریضے سے سبکدوش کر دیں۔

یہ فشرمین اور غیرممالک میں دیگر ماھی‌گیر اپنی بنسیوں کی ڈور میں بودار چارا لگا رھے ھیں اور یہ آس لگائے ھیں کہ جتنی بہت ساری سادہ لوح کارپ مچھلیاں نام نہاد ناپیدا کنار حقیقت پسندی کے گدلے پانی میں، کانٹے میں پھنس جائیں اتنا ھی زیادہ اچھا ھے۔

ھمارے ھاں بھروسے کی ان کارپ مچھلیوں کی بڑی قلت ھے اور اس لئے چالاک ماھی‌گیروں کا شکار بڑا ھی مایوس‌کن رھیگا۔

لیکن انتہائی شدید نظریاتی جدوجہد کے موجودہ حالات میں اب وقت آ گیا ھے کہ ھم بھی پرعزم دھاوا بولیں اور بےخطا ھتھیار — کبھی ماند نہ پڑنےوالی لیننی سچائی — سے ھر رنگ کے بھگوڑوں اور ترمیمیت‌پسندوں کی کوششوں کا جواب دیں! یہ ھمارا فوری فریضہ ھے۔

اپنی تقریر کے شروع میں جو کچھ میں نے کہا تھا اس کا مقصد ھم مصنفوں نے جو کچھ حاصل کر لیا ھے اس کی اھمیت کو بڑھانا چڑھانا نہیں تھا۔ اگر یہ پارٹی نہ ھوتی جس نے ھمیں یہاں اس کانگرس میں اکٹھا کیا ھے تو ادب میں ریاضت کا کوئی ثمرہ حاصل نہ ھوتا اور حق تو یہ ھے کہ کسی سوویت ادب کا وجود ھی نہ ھوتا۔

ھزاروں ادبی شخصیتوں کو، لگاکر گورکی سے آجکل کے نوجوانوں تک، ایک ساتھ متحد کر کے اور ان کے ھنر کو عوام کی اور عوام کے مفادات کی خدمت پر مامور کرنا ایک ایسا کارنامہ تھا جسے صرف ھماری پارٹی اور اس کی رھبری کرنےوالے بلند تصورات ھی انجام دے سکتے تھے۔ اس پر جب آپ واقعی غور کرنے بیٹھیں تو ساتھیو، یہ درحقیقت محوحیرت کردینے والی بات ھے!



روستوف برساحل ڈان۔ فن کار نوجوانوں کے بلغاریائی سوویت کلب کے میمبروں سے ملاقات۔

ان نوجوان ادیبوں کا شولوخوف استقبال کر رہے ہیں جو پانچویں کل یونینی کانفرنس میں حصہ لیکر آئے ہیں۔



قیمتی کارتوس ضائع ہو جاتے ہیں اور ہمارے بعض قارئین کو جو نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے وہ خاصا بڑا ہوتا ہے۔ مگر ذرا کوشش تو کیجئے کہ ایسا خراب نشانہ‌باز چاند ماری سے چلا جائے! وہ بہ‌اصرار یہی کہیگا کہ میں تو پہلے ادبی سرحدی مورچے پر لڑ رہا ہوں۔ وہ ہر ایک کو یقین دلائےگا کہ آئندہ اس کی گولی ٹھیک نشانے پر لگنےوالی ہے۔ اس کی مراد اصل میں یہ ہرگز نہیں ہوتی کیونکہ نشانے پر گولی مارے بغیر ہی وہ تو موج مارتا آیا ہے۔ کم از کم اس کا حال ویسا تو ہے ہی جیسا کہ گوشت کی دکان میں رہنےوالی بلی کا ہوا کرتا ہے۔

اس کا علاج کیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ اشاعت گھروں اور رسالوں کے مدیروں کو اپنے مطالبات کے معیار ایک دم بلند کر دینے چاہئیں۔ کیونکہ کسی خراب کتاب کی راہیں سب سے پہلے اشاعت گھروں اور رسالوں کے مدیر مسدود نہیں کریں‌گے تو اور کون کریگا؟ ادبی نقادوں کو اس وقت خاموشی اختیار کرلینے کی عادت ترک کر دینی چاہیئے جبکہ معاملہ اس کتاب کا ہو جسکی تعریف نہ کی جا سکتی ہو۔ ان کا فرض ہے کہ تجزیہ اور کتاب کی اصل قدر و قیمت کا جائزہ پیش کریں۔ مصنفوں کی انجمنوں کا بھی بڑا قصور ہے کہ وہ فضول کتابوں کی ڈھیلی‌قبا کا دامن پکڑ کر گھسیٹ کیوں نہیں لیتے۔

اس معاملے کا ایک پہلو اور بھی ہے اور میری مراد مصنف کے محنتانے سے ہے۔ ہم سوویت مصنفوں کے لئے تصنیف کا کام قدرتی طور پر کبھی بھی مالدار بننے کا ذریعہ نہیں بنا اور نہ کبھی ہو سکتا تھا۔ یہ ہمارا ایک اصول ہے۔ مغرب میں کتاب کی فروخت سے ناشروں کو جو منافع حاصل ہوتا ہے اس کا کچھ فیصد حصہ اس کے مصنف کو مل جاتا ہے اور اس طریقے سے مشہور و معروف یا محض سب سے زیادہ فروخت ہونےوالی فیشن‌ایبل کتابوں کے مصنفوں کو موقع ملتا ہے کہ وہ نہایت ہی مالدار افراد بن جائیں۔ لیکن بہت سے ترقی‌پسند ادیب گذارہ بھی مشکل سے کر پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خالص کاروباری نظام ہمارے لئے قطعی ناقابل قبول ہے۔ پھر بھی ہمارے کاپی‌رائٹ میں کچھ نکتے ایسے ہیں جن پر غور کرنا لازمی ہے۔ یہ بات اگرچہ الٹی معلوم ہوگی مگر حقیقت ہے کہ جو کتابیں سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہیں — جس کا مطلب ہمارے لئے یہ ہے کہ جن میں نظریاتی اور فنی خوبیاں بدرجۂ‌اتم موجود ہوتی ہیں —

ساتھیو، میں آپ سے سچ سچ کہوں گا۔ میرے قریب قریب رزمیہ اور قدرے سنجیدہ تعارف کا اور میں نے اپنے مصنف بھائیوں کی سابقہ خدمات کا جو حوالہ دیا اس کا دراصل مقصد پچھلے پانچ برسوں میں ہم نے کیا حاصل کیا اور کیا غلطیاں کیں، ان کی تفصیل بنانے سے پہلے کسی بہانے سے آپ پر نیک‌دلی اور فیاضی کی کیفیت طاری کرنی تھی۔ کیونکہ مباحثوں میں بعض لوگوں نے جو کچھ کیا اس سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہم سے جنگ پر خاصے آمادہ ہیں۔

ادب اور فنون‌لطیفہ کی موجودہ صورت‌حال پر مرکزی کمیٹی کی رپورٹ نے نہایت تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ہم اس جائزے سے بلاشرط متفق ہیں۔

ہمارے ادبی کاروبار میں صورت‌حال کیا ہے؟ ہم ان مصنفوں کی بات نہیں کریں‌گے جو برسر عام مذمت کے لائق ہیں۔ جن سے نفرت ہو ان کی کوئی باتیں نہیں کیا کرتا۔ یہ خلاف شان بات ہوتی ہے۔ ہمیں ان مصنفوں کے بارے میں بات کرنی چاہیئے جو ہماری بخوبی توجہ کے مستحق ہیں، ہمیں اپنی کاروباری باتیں کرنی چاہئیں۔ ماسکو کی انجمن مصنفین کے سیکریٹری سرگیئی ناروفچاتوف نے شہر کی حالیہ پارٹی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم میں کمین‌گاہ سے گولیاں چلانےوالے تو بہت نہیں ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ایسے وورو‌شلوف نشانہ‌باز بھی تھوڑے ہیں جو کسی تنظیم کا مضبوط سہارا ہوا کرسکتے ہیں۔* ان کے نہایت موزوں، شاعرانہ موازنے کے قریب قریب یہی معنے تھے۔ لیکن ناروفچاتوف نے جو بات نہیں کہی وہ یہ ہے کہ نشانہ‌بازوں میں خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کی گولی عین نشانے پر لگنے کی بات تو الگ رہی ٹھیک سمت میں بھی نہیں جاتی۔

''گولی دودھ پینے گئی ہے،، ایسی صورت میں فوجی یہی کہا کرتے ہیں۔ اور واقعی ادبی چاندماری میں عجیب واقعات رونما ہوتے ہیں: جو گولی نشانے پر نہیں لگتی وہ بومرینگ کی طرح خراب نشانےباز کے پاس واپس آ جاتی ہے لیکن اس کے لگتی نہیں بلکہ درحقیقت اس کے ائے دودھ نہیں بھی لاتی تو اس کے بچوں کے دودھ کے لئے مصنف کے محنتانے کی شکل میں موٹی رقم ضرور لاتی ہے۔

اگر یہ خراب نشانچی گولیاں بار بار نہ چلاتے اور بھاگم بھاگ بندوقیں نہ داغتے تو شاید حالت اتنی بری نہ ہوتی۔ خاصے بہت سارے

یہ کس قسم کی محبت ہے؟ پیار محبت کے معاملات میں، جیسا کہ سب جانتے ہیں، میٹھی میٹھی باتیں ہوتی ہیں، اگر ایثار نہیں تو کچھ خرچ ہی کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں آپ سے، کانستنتین ایوانووچ گلدستوں کی یا پیاری پیاری مردانہ مسکراہٹ کی آس نہیں ہے۔ ہمیں تو کاغذ اور دیجیئے! کاغذ! منصوبے سے، جو ہماری خوش‌قسمتی سے آپ پورا کر رہے ہیں، فاضل کاغذ اور بہتر قسم کا کاغذ۔ ہمیں کاغذ دیجیئے اور پھر ہمیں یقین آئیگا کہ آپ واقعی ہم سے محبت کرتے ہیں۔ اور پھر ہم، نثرنگار جھولی پھیلا کر گھومیں‌گے اور آپ کو ایک شاندار گلدستہ اتنے ہی خوبصورت کاغذ میں لپیٹ کر پیش کریں‌گے اور ممکن ہے کوئی نوجوان شاعرہ — دنیا مظہرالعجائب ہے! — کوئی!] مثنوئ‌عشق لکھ کر آپ کی خدمت میں پیش کرے۔ سوچئے تو مثنوئ‌عشق! سحرانگیز بات ہے یہ تو۔ میں بھی اپنے اس بوڑھے منہ اس پر اعتراض نہیں کروں‌گا اور جہاں تک، پیارے کانستنتین ایوانووچ آپ کا تعلق ہے آپ کو تو اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

ساتھیو، دیکھا آپ نے، اس کاغذ کے لئے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں؟ میں نے محبت کا واسطہ دیا، دل پر ہاتھ رکھ کر ناممکن کو ممکن بنا دینے تک کے وعدے کئے... لیکن مذاق بر طرف، مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ جو کاغذ ہمارے پاس موجود بھی ہے اس کا استعمال معقول نہیں ہوتا۔ اس کے لئے نہ تو کامریڈ گالنشین قصوروار ہیں نہ ہم، مصنف۔ ہر چیز پر اور کسی بھی مقدار میں اس کو ضائع کر دیا جاتا ہے۔ کاغذ تو، جیسا کہ سب جانتے ہیں، اس کو محفوظ کرلیگا جو اس پر لکھا گیا ہو۔ ذرا غور فرمائیے — پچھلے سال ملک میں کل یونینی کتابیں شائع ہوئیں تو ان میں سے قریب نصف عنوانات اس کے تھے جو ''محکمہ‌جاتی ادب،، کہلاتا ہے۔ اس چلمن کے پیچھے کون چھپا بیٹھا ہے؟ سب کچھ۔ موٹی موٹی دفتری رپورٹیں، اسی حیرت انگیز ضخامت کی یادداشتیں، ہر قسم کی تحفہ‌جاتی تقویمیں — کسی نہ کسی کارخانے سے متعلق البم جو شائع ہونے کے فوراً بعد ہی چوھوں کی غذا بننے کے لئے الماریوں میں رکھ دئے جاتے ہیں۔ اور ہر ایک کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنی مخصوص کتاب کی جلد خوبصورت بندھوائے چمکدار، ہفت رنگ گردپوش ہو اور چھپنا تو اسے چکنے سفید کاغذ پر ہی چاہیئے۔ ڈیلی گیٹ ساتھیو، اس

ان کے مصنف کو ہر اگلے ایڈیشن پر کم سے کم‌تر معاوضہ ملتا ہے یہاں تک کہ اس کی کتاب اس کے مجموعہ‌تصانیف میں شامل کر لی جاتی ہے۔

متعدد اور بھی نکتے ہیں جن پر ہماری انجمن کو مصنفین کے کام کے سلسلے میں غور کرنا چاہیئے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مجھے آپ کا بہت زیادہ وقت نہیں لینا چاہیئے اور اس لئے اب میں ان کے متعلق زیادہ نہیں بولوں‌گا۔ جون میں مصنفوں کی ایک کل‌یونینی کانگرس منعقد ہونے‌والی ہے اور ہم اس میں شرکت کرنے کے لئے ادب میں جوش و خروش سے دلچسپی لینے‌والے تمام حضرات کو مدعو کریں‌گے۔ وہیں ہم اپنے تمام ادبی قالینوں کی اچھی طرح دھول جھاڑیں‌گے! اور خاکم‌خاک ہو جائیں‌گے۔

ہماری کتابیں حقیقی معنوں میں بے‌حد بڑی تعداد میں شائع ہوتی ہیں۔ پھر بھی طلب رسد سے زیادہ ہوتی ہے۔ پبلک لائبریریوں تک کو بھوکا رہنا پڑتا ہے۔ پانچ میں سے صرف ایک کو ایسی کتابوں کی ایک جلد مل جاتی ہے جو نسبتاً زیادہ مقبول ہوتی ہیں۔ اور پھر ہمیں کسی مزدور، اجتماعی کاشتکار یا دانشور کی اس جائز خواہش کو پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ وہ ان کتابوں کو خرید کر اپنے گھر میں رکھے جنہیں وہ کبھی دوبارہ بھی پڑھنا چاہے۔ ایسے ہی موقع پر شہر یا ضلع پارٹی کمیٹیوں کے ان ساتھیوں سے ہمدردی ہونے لگتی ہے جنہیں کتابوں کو اس طرح تقسیم کرنا پڑتا ہے جیسے کہ وہ انتہائی ضرورت کی جنس‌تجارت ہوں۔ اور یہ سب اس وجہ سے کہ ہمارے پاس ضرورت کا کافی کاغذ نہیں ہے!

مجھے یاد ہے کہ کانستنتین ایوانووچ گالنشین نے پچھلی کانگرس میں افسانوی ادب کی کس گرمجوشی سے حمایت کی تھی۔ ان دنوں وہ پیرم کی علاقائی کمیٹی کے اول سیکریٹری تھے اور انہوں نے ہم سے عشق کا گویا اعلان کر دیا تھا۔ اب وہ لگدی اور کاغذ کی صنعت کے وزیر ہیں اور انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا ہے۔

پیارے کانستنتین ایوانووچ، ہم نے آپ کے اعلان‌محبت پر یقین کر لیا تھا اور اب ہم آپ پر بیوفائی کا الزام لگا رہے ہیں۔ دیکھئے ذرا لفظ ''بیوفائی'' پر خواتین ڈیلی‌گیٹوں کے کان کیسے کھڑے ہو گئے! دنیا کی تمام عورتوں کی طرح اس لفظ سے ان کو پھریری آ جاتی ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میری باوفا ساتھی بنینگی۔ اور بہر حال

صورت‌حال میں بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ اس بات کا کافی ثبوت نہیں، ہمارے لئے کافی تسکین‌بخش ثبوت کہ ہماری، نہ صرف کام میں بلکہ دفاع میں بھی اب بھی ضرورت ہے!

آپ تو سمجھتے ہی ہوں‌گے کہ نئے پنجسالہ منصوبے کا ذکر کرتے ہوئے میں اعداد و شمار اور فی‌صد کی زبان استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ اگلے پانچ برسوں میں کتنی بڑی بڑی، منجھولی اور چھوٹی کتابوں کے شائع ہونے کی توقع ہے تو مجھے یہی جواب دینا پڑیگا کہ سوویت یونین کے مصنفوں کا پورا سیکریٹریٹ بھی اس کا جواب نہیں دے پائیگا۔

لیکن بہر حال جو چیز اہم ہوتی ہے وہ تعداد نہیں بلکہ خوبی ہوتی ہے۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ آئندہ پانچ برسوں میں ہم اہم ادبی تخلیقات شائع کریں‌گے جو قارئین کے اب مقرر کئے ہوئے اعلی فنی اور نظریاتی معیاروں پر پوری اتریں‌گی۔

ہمارے وعدے کی ضمانت پارٹی اور عوام کے نصب العین کے لئے ہمارے وقف ہونے سے اور اپنی پوری قوت اور صلاحیتوں سے کمیونزم کے عظیم تصورات کی خدمت کرنے کی ہماری پرخلوص خواہش سے ہوتی ہے۔

۱۹۷۱ء

معاملے کو تو درست کرنا ھی پڑیگا، یہ تو ھاتھوں سے بالکل ھی نکل گیا ھے۔ اگر درستی منظور ھے تو سخت رویہ اختیار کرنا ھی پڑیگا کیونکہ محکمہ‌جاتی ادب شائع کرنے کا رجحان بڑھ رھا ھے اور تشویش کا سارا سامان موجود ھے۔

اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے آئیے ھم وھیں چلیں جہاں سے آغاز کیا تھا۔ کامریڈ ناروفچاتوف نے درست کہا تھا کہ ادب کی تخلیق کے بوجھ کا بڑا حصہ انہیں لوگوں کو اٹھانا پڑتا ھے جنہیں انہوں نے وورشلوف نشانہ‌بازوں کا نام دیا تھا۔

ھماری جگہ لینے کے لئے خداداد صلاحیتوں والی نئی پود پروان چڑھ رھی ھے۔ بزرگ مصنفین اس کمک پر بڑی آس لگائے بیٹھے ھیں۔ بےخوف ھوکر کہا جا سکتا ھے کہ ادب میں نہایت عمدہ کمک پہنچ رھی ھے۔ ان نوجوان مصنفوں کی ھمارے سماج کو ضرورت ھے اور اپنے ادب کا مستقبل ان کو سونپتے ھوئے ھمیں مسرت ھے۔ یہ دلچسپ لوگ ھیں جن کا اندازفکر وطن دوستانہ ھے اور جن میں زندگی کی گہرائیوں تک پہنچ جانے کی تڑپ ھے۔ نوجوانوں میں بانکپن کا ھونا لازمی سی چیز ھے اور اپنی رائے کے اظہار میں وہ قدرے منہ‌پھٹ بھی ھوتے ھیں، مگر ان میں بےاعتنائی نام کو نہیں ھوتی اور ان کو متواتر تلاش کی دھن لگی ھوتی ھے۔ تجربے کی ان میں یقیناً کمی ھوتی ھے مگر وہ آتے آتے آ جائیگا۔ ھمارے ادب کا مستقبل ان نوجوان مصنفوں ھی کے ھاتھ ھے، وھی اس کی تعمیر کریں‌گے اور وھی اس کے لئے جواب‌دہ ھوں‌گے۔ آپ سمجھ ھی رھے ھوں‌گے کہ میں نوجوانوں کا اپنی کمک کا، سوویت ادب کی تازہ‌دم فوجوں کا بحیثیت مجموعی ذکر کر رھا ھوں اور میں ان کو ''پاک'' اور ''ناپاک'' میں تقسیم نہیں کر رھا۔

مگر میں آپ سے اس بات کو ذھن میں رکھنے کی بھی گذارش کرتا ھوں کہ ھم، پرانی نسل کے مصنف اب بھی کچھ نہ کچھ قدر تو رکھتے ھی ھیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ھے ھمارے عظیم سوویت یونین کے دوسرے باشندوں کی طرح مصنفین کے نام بھی فوجی خدمت کے رجسٹر میں درج ھیں اور چونکہ کامریڈ گریچکو اور کامریڈ یپی‌شیف ھمیں محفوظ فوج کے زمرے سے خارج نہیں کر رھے اس لئے مراد یہ ھے کہ وہ اب بھی ھمیں کارآمدوں میں شمار کرتے ھیں، ان بوڑھے فوجیوں میں جن پر کسی بھی آڑے وقت میں اور کسی بھی

تیسرا حصہ

نوجوان

میکسم گورکی کے متعلق تقریر

(اقتباس)

...گورکی ان لوگوں سے پرجوش محبت کرتے تھے جنھوں نے نوع انسانی کے تابناک مستقبل کے لئے جہاد کیا تھا اور اپنی آتش مزاجی کی پوری قوت کے ساتھ لوٹنے کھسوٹنےوالوں، دکانداروں اور صوبجاتی روس کے پرسکون دورافتادہ علاقوں میں اونگھتی ہوئی پیٹی بورژوازی سے نفرت کرتے تھے...

نہایت مختلف موضوعات پر معلومات کا گورکی کے پاس جو بےپناہ ذخیرہ تھا اس پر، ان کی انتھک محنت پر اور اپنے سے وہ جو سخت مطالبات کرتے تھے اس پر میں ہمیشہ حیران ہوا کرتا تھا۔

ان کی کتابوں نے روسی پرولتاریہ کو زارشاہی حکومت کے خلاف لڑنے کا سبق دیا۔ میں جب غیرممالک میں گیا تو خود دیکھا تھا کہ گورکی سے جن کی لافانی تخلیقات سے مغربی پرولتاریہ سرمایہ‌داری کے خلاف لڑنا سیکھ رہا ہے وہ کتنا واقف ہے اور ان کو کس قدر پسند کرتا ہے۔

گورکی کو، جو عزم محکم اور کمیاب خداداد صلاحیتوں کے مالک تھے، ادبی حلقے میں داخلہ حاصل کرنے کے لئے شدید جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ زارشاہی کے زمانے میں عوام الناس میں سے ابھر کر آنےوالے پیدائشی صلاحیتوں کے لوگوں کو پنپنے ہی نہیں دیا جاتا تھا کیونکہ علم کے سرچشموں تک لڑ بھڑکر پہنچنے کی ان میں سکت ہی نہیں ہوتی تھی۔ پرانا نظام حکومت عام لوگوں میں سے آنےوالوں کی صلاحیت و جوہر کے مظاہر کچل کر رکھدیا کرتا تھا۔ سوویت یونین میں نوجوانوں کے لئے تہذیب کی وہ بلندیاں حاصل کرلی گئی ہیں جن کی پہلے کہیں کوئی مثال نہیں ملتی...

۱۹۳۶ء

بڑے جشن کا موقع ہوگا، میری عمروں کے اور مجھ سے بھی بوڑھے دوسرے بھی ہوں‌گے۔ پرانے کومسومول میمبر ہوں‌گے — جو اب باریش اور بال بچوں‌والے ہو چکے ہوں‌گے — اور وہ اپنی نوجوانی میں خانہ‌جنگی کے زمانے کو یاد کریں‌گے جب انھوں نے اس نصب العین کے جس کی وہ حفاظت کر رہے تھے، حق بجانب ہونے سے جوش و خروش حاصل کر کے وائٹ جرنیلوں، کلکوں، ڈاکوؤں اور دوسرے بدمعاشوں کا صفایا کر دیا تھا۔ آج، اپنے شاندار دیس سے سب کے ساتھ فخر محسوس کرتے ہوئے وہ کہیں‌گے: ''ہم جس چیز کی تکمیل کر رہے ہیں وہ حیرت انگیز ہے۔''

پارٹی کی رہبری میں ہمارے نوجوانوں نے خانہ‌جنگی کے محاذوں پر دشمن کا صفایا کیا، اجتماعی فارم قائم کئے، اپنے ہاں صنعت تعمیر کی اور ملک گیر پیمانے پر سوشلسٹ مقابلہ بازی کی مہم شروع کر دی۔ ہمارے نوجوانوں کی صفوں ہی میں سے استخانوف اور وینوگرادووا جیسے مزدور آگے آئے اور اب وہ بوڑھے اور تجربہ‌کار لوگوں کو سکھا رہے ہیں کہ کام کیسے کیا جائے۔

بالشویزم کی تخم ریزی واقعی زرخیز زمین پر ہوئی ہے!

مستقبل تمہارا ہے اور ہم، عمررسیدہ لوگ، دل‌وجان سے تمہارے ساتھ ہیں!

۱۹۳۸ء

ویشنسکایا میں اجتماعی فارم کے کاسک نوجوانوں کے تھیٹر کی دوسری سالگرہ

ساتھیو،

آج ہم اجتماعی فارم کے کاسک نوجوانوں کے ویشنسکایا تھیٹر کی دوسری سالگرہ منا رہے ہیں۔ آپ سب کو یاد ہوگا کہ تہذیبی مرکزوں سے دور گاؤں اور نگلوں میں کیا حالت تھی۔ کبھی کبھار سفری منڈلیاں آتی تھیں جسے کوئی کاروباری ذہنیت رکھنےوالا مینیجر بعجلت جمع کر لیتا تھا جس کو غرض صرف اس بات سے ہوتی تھی کہ جتنا زیادہ ہو سکے روپیہ بٹور لیجائے۔ فن سے ان لوگوں کا قطعی کوئی تعلق نہیں تھا اور جو کچھ وہ کرتے تھے وہ آرٹ کی ایک افسوسناک نقل ہوتی تھی۔ یا اچانک ہمارے علاقوں میں کوئی ''جنگی اپاہج''

ویشنسکایا میں اجتماعی فارم کے کاسک نوجوانوں کے تھیٹر کی پہلی سالگرہ

اپنے وجود کے پہلے سال میں اجتماعی فارم کے کاسک نوجوانوں کے ویشنسکایا تھیٹر نے بہت کچھ حاصل کر لیا ھے۔ ان کی تازہ‌ترین پیشکشوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ھے کہ تربیت کا یہ ایک سال ضائع نہیں ھوا۔ پیشکشوں میں زیادہ تال میل ھے اور اداکاری نے نمایاں طور پر زیادہ پختگی حاصل کرلی ھے۔ پھر بھی اگر تھیٹر کے عملے کو یہ سوچتے ھوئے کہ اب آگے بڑھنے کی ضرورت نہیں، ناروا گھمنڈ نہ ھو جائے اور اپنے آپ سے مطمئن ھو جانے کی مہلک بیماری میں وہ مبتلا نہ ھو جائیں تو یہ تھیٹر جتنا کچھ حاصل کر سکتا ھے اس کی بہ نسبت یہ بہت تھوڑا ھے۔ اپنے ہنر کو جلا دینے کے لئے ان کو اور بھی محنت سے مطالعہ کرنا ھے اور فن کی حقیقی بلندیوں پر پہنچنے سے پہلے طویل اور دشوار چڑھائیاں چڑھنی ھیں۔ میری دعا ھے کہ اجتماعی فارم کے کاسک نوجوان، جن پر ھمیں بجا طور پر فخر ھے اس میں کامیاب ھوں۔

۱۹۳۷ء

ھم دل و جان سے تمہارے ساتھ ھیں

پیارے سوویت لڑکو اور لڑکیو!

کومسومول اپنی بیسویں سالگرہ منا رھی ھے اور یہ ایک ایسا موقع ھے جسے میں نہیں چھوڑ سکتا۔ خوشیاں مناتے ھوئے نوجوانوں کی ایک بھیڑ کے پاس سے گزرتے ھوئے کوئی بھی بوڑھا آدمی ایک لمحے کے لئے ضرور ٹھیر جائیگا اور اکارڈین کی دھن سنتے ھوئے اور خوش و خرم نوجوان چہروں کی طرف مسکرا کر دیکھتے ھوئے اپنی عمر کئی برس چھوٹی محسوس کرنے لگ جائیگا۔ میں بھی، پیارے قارئین، تمہارے بارے میں صرف سوچکر ھی خود کو نوجوان محسوس کرنے لگتا ھوں اور کچھ افسردہ بھی کیونکہ میں تینتیس کا ھو چکا ھوں اور تمہارے شاندار جشن میں تو خاصا بوڑھا نظر آؤں‌گا۔ میری تسلی صرف ایک اس بات سے ھی ھوتی ھے کہ تمہاری سالگرہ کی دعوت میں جو ھمارے حیرت انگیز جواں‌سال اور حسین دیس میں ھر جگہ ایک

مغربی کلاسیکی ڈرامے دیکھنا چاہتے ہیں۔ اوستروفسکی کے دو ڈرامے اب تک پیش ہو چکے ہیں اور دیکھئے وہ کتنے مقبول ہوئے!

اس مسئلے پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے کہ ہم اپنے کھیل انتہائی دورافتادہ اجتماعی فارموں تک کیسے لیجائیں۔ ہمارے تھیٹر کو ان کے پاس کنسرٹ، بےاحتیاطی کے ساتھ ادھرادھر سے جمع کی ہوئی کچھ پیشکشوں کو لےکر نہیں پہنچنا چاہیئے بلکہ مکمل اور اچھے ڈرامے لیجانے چاہیئیں۔ آپ کا نصب‌العین یہ ہے کہ عوام‌الناس میں عظیم اور حقیقی آرٹ کو مقبولیت دیں۔

فنون‌لطیفہ کی علاقائی انتظامیہ، معلوم ہوتا ہے کہ اس تھیٹر کی اہمیت کو اصلیت سے کم آنکتی ہے۔ آرٹ ڈائریکٹروں کی باربار تبدیلی کمپنی کے کام کی خوبی پر برا اثرڈالتی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ انتظامیہ ایک ایسے آرٹ ڈائریکٹر کا تقرر کرے جو یہاں کئی برس تک کام کرنے کو راضی ہو، ایسا شخص جو اپنے پورے علم اور تمام صلاحیتوں کو حقیقی معنوں میں پکے پورے تھیٹر کی تعمیر میں بخوشی صرف کر دے اور جو اس کمپنی سے محبت کرنے لگ جائے اور اس سے جدائی اس پر بار گزرے۔

مجھے یقین ہے کہ ہمارے ویشنسکایا میں آرٹ کا جو ننھا سا شعلہ روشن ہوا ہے وہ جلدی ہی ہمارے علاقے کے اضلاعی سرکزوں میں بھی پھیل جائیگا۔ اور آرٹ عوام‌الناس میں گہرائیوں تک سرائیت کر جائیگا۔

ویشنسکایا تھیٹر ہماری اسیدیں پوری کرےگا، سوشلسٹ حقیقت‌پسندی کا تھیٹر، اعلی درجے کی پیش‌کشوں کا تھیٹر بن جائیگا۔

آئیے، ہم دعاکریں کہ ہمارا تھیٹر اتنا اچھا کام کرے کہ لوگوں میں اس کی مقبولیت کو چارچاند لگ جائیں!

۱۹۳۹ء

تمہاری باوفا ساتھی

نوع‌انسانی کے سپوت، وہ لوگ جنہوں نے دنیا میں ہر جگہ محنت‌کش عوام کی مسرت کے لئے جدوجہد کی اور آجکل کر رہے ہیں بچپن ہی سے کتابوں کے بےحد شوقین رہے ہیں اور کتابوں کی مدد سے انہوں نے زندگی کے متعلق اپنے علم میں بےحد اضافہ کیا ہے۔

نمودار ہو جاتا۔ معذوروں کی کسی کارگاہ میں چمچے بناتے بناتے اکتا جانے کے بعد وہ فیصلہ کرتا تماشے دکھاکر لوگوں کا دل بہلایا کروں گا اور بس وہ گاؤں گاؤں، نگلے نگلے گھومتا پھرتا اور تاش کی کھیل اور دوسرے تماشے دکھایا کرتا۔ گانےوالوں کی سفری ٹولیاں بھی کبھی کبھی آتیں اور جو موسیقی وہ پیش کیا کرتیں وہ سماعت پر نہایت ھی گراں گزرتیں۔ جیسا کہ مقامی لوگ کہا کرتے تھے اس کو سنکر تو دم گھٹنے لگتا تھا۔ یہاں کے بہت سے باشندوں نے اپنی عمر میں کبھی کسی اداکار کو نہیں دیکھا تھا اور ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ تھیٹر کیا چیز ہوتی ھے۔ نہ صرف اجتماعی کاشتکار نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا بلکہ ھمارے لڑکے لڑکیوں نے بھی اسکول میں جاکر تعلیم حاصل کی، بڑے ہو گئے اور انہیں کبھی تھیٹر کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی۔

یہ تھیٹر ھماری پارٹی اور ھماری سوویت حکومت نے لوگوں کی تہذیبی نشوونما اور ترقی کی متواتر فکر کرتے ہوئے شروع کیا ھے۔

جشن سالگرہ کی تقریبات کا دستور ہوتا ھے کہ تعریفیں کی جائیں، آداب و تسلیمات قبول ہوں۔ یہ جشن نہایت ھی پرمسرت تقریب ھے۔ اس تھیٹر کی کمپنی نے اپنا کام بحسن و خوبی انجام دیا ھے۔ اور قدرتی بات ھے کہ ھم ان کو مبارکباد دیتے اور ان کی واہ واہ کرتے ھیں۔ لیکن اپنے تھیٹر کی مزید نشوونما اور ترقی کے لئے ھمیں سنجیدگی سے بات چیت کرنی ھے۔ اب بھی اس کی شیرخواری کا زمانہ ھے۔ لیکن ھر بچے کی طرح اس کو بھی نشوونما پانی ھے۔ ھمارے ملک میں اٹھارہ برس کی عمروالوں کو بالغ شمار کیا جاتا ھے۔ لیکن ھماری خواہش یہ قطعی نہیں ھے کہ اپنے تھیٹر کے بالغ ہونے کے لئے سولہ برس تک انتظار کریں۔ ھمیں یقین ھے کہ وہ اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کرے گا اور زیادہ عرصہ گزرنے سے قبل ھی سن بلوغیت حاصل کر لیگا۔

تو بھی تھیٹر کو کیا کرنا چاھیئے؟ صرف اچھے ڈراموں پرھی کام کرو — سب سے اھم بات یہی ھے۔ جدید ڈراموں کا بڑی احتیاط کے ساتھ انتخاب کرنا چاھیئے کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ھے کہ وقت کے اھم موضوع پر مبنی ہونے کے باعث برے ڈرامے اسٹیج تک پہنچنے کی راہ تلاش کر لیتے ھیں۔ ھر اھم موضوعاتی ڈرامہ اچھا ڈرامہ نہیں ہوا کرتا۔ ھمارے تماشائی گریبوئیدوف، گوگول، اوستروفسکی کے اور



فنکار نوجوانوں کے بلغاریائی سوویت کلب کے ایک اجلاس میں ۔

شولوخوف تقریر کر رہے ہیں ۔



علم کی روشنی جو پہلے تاریکی میں ایک شگاف کے اندر سے چمکتی ہوئی سی نظر آتی ہے، اس بچے کو حیران و ششدر کر دیتی ہے جو الگ الگ اور اتبک سحرانگیز حروف کو یکجا کرکے وہ الفاظ بنانے کی پہلی کوشش کر رہا ہو جو اس کی سمجھ میں آتے ہیں۔ پیارے لڑکو اور لڑکیو، تم اس منزل سے، جو چاہے بہت قریب کی ہے، گزر چکے ہو۔ اب جو تم اپنے سامنے دیکھ رہے ہو وہ شگاف میں سے چمکتی ہوئی روشنی نہیں ہے بلکہ جھمجھماتی ہوئی دنیا میں، اس زندگی میں کھلنےوالا ایک بڑا سا دروازہ ہے جس کے قوانین پر اب تمہیں عبور حاصل کرنا ہے اور جس کی اب تم، کمیونزم کے شاندار تصورات کی ہدایت میں تعمیر کروگے۔

یہ بات ہرگز فراموش نہ کرنا کہ روشنی اور علم کی اس دنیا کے دروازے بلا استثنا تم سب کے لئے کھولنے کی غرض سے اور یہ دروازے کھلے رکھنے کے لئے تمہارے بزرگوں، تمہارے باپ دادا اور بڑے بھائیوں کو بہادری کے ساتھ لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں جن میں بڑی قوت صرف ہوئی تھی اور ان کا بہت خون بہا تھا۔

تمہیں چاہیئے کہ روشنی کی طرف بہادری کے ساتھ قدم بڑھاؤ اور دل و جان سے کتابوں سے محبت کرو! کتاب تمہاری بہترین دوست ہی نہیں بلکہ ساری عمر کے لئے تمہاری باوفا ساتھی بھی ہوتی ہے۔

۱۹۵۲ء

•

قزاخستانی مصنفوں کی تیسری کانگرس میں تقریر سے اقتباس

....یہ کہنے کی تو چنداں ضرورت نہیں کہ بیس تیس برس پہلے ہم جو کچھ لکھا کرتے تھے اب اس سے بہتر لکھنا چاہیئے۔ ہمارے قارئین کی تہذیبی ضرورتیں جو بےحساب بڑھ گئی ہیں، ہم سے یہی مطالبہ کرتی ہیں۔ اور یہ بھی کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان حالات کے تحت دوستانہ تنقید انتہائی اہمیت رکھتی ہے۔ جمے جمائے اور نوجوان مصنفوں دونوں کی تنقید کرنی چاہیئے۔

لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں، تنقید میں فرق ہوا کرتا ہے۔ اپنی تقریر میں مختار عیوضوف نے بالکل درست کہا کہ تنقید آپ اسی کی کرتے ہیں جسکی پروا کرتے ہوں، جس کے لئے فکرمند ہوں۔

ایسی دوستانہ تنقید کی ایک مثال ان رپورٹوں میں ملیگی جو قزاخستان کے سربرآوردہ ادیبوں نے پیش کی ھیں۔ اگر ان کی تقریروں میں قدرے تیکھاپن ھے تو اس کی محرک اپنے ساتھیوں کے ادبی مستقبل کے بارے میں ان کی فکرمندی ھے۔

ثابت مکانوف کے بارے میں گیورگی سنبلیت کے مضمون کا جو ''لتیراتورنایا گزیتا،، میں چھپا تھا، معاملہ بالکل مختلف ھے۔ اس جیسی طنزآمیز تنقید کو اس بات کی خواہش کسی طرح تصور نہیں کیا جاسکتا کہ ایک ساتھی کو اپنی کتاب کی کوتاھیاں درست کرنے میں مدد دی جائے۔ اس مضمون کے پیش‌نظر مقصد مصنف کی مدد کرنا نہیں بلکہ اس کو ختم کرنا ھے۔

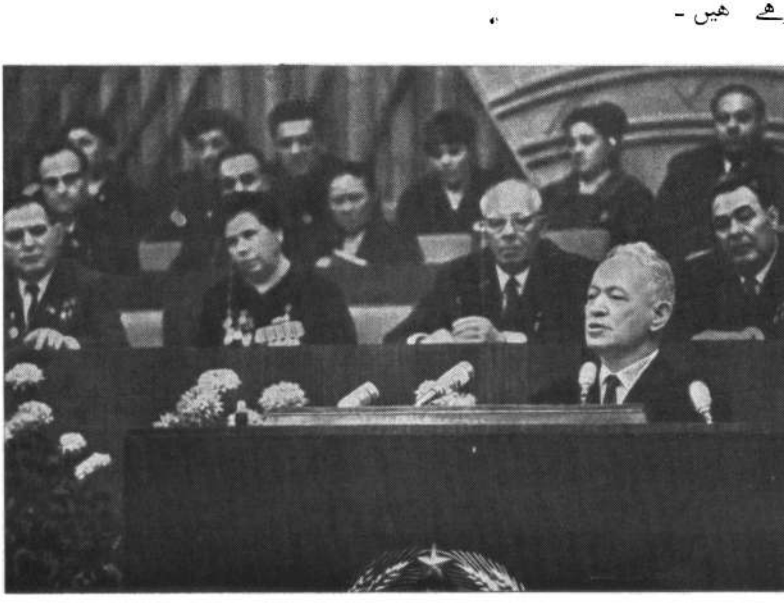
جب کوئی مصنف جان بوجھ کر نظریاتی اعتبار سے فاسدوناقص کتاب لکھتا ھے اور کسی نہ کسی بہانے ایسے نظریات کی تبلیغ کی کوشش کرتا ھے جو سیاسی اعتبار سے عوام اور پارٹی کے لئے ضرر رساں ھیں تو میں ایسی تنقید کے حق میں پوری طرح ھوں جس کا مقصد بیخ کنی ھو۔ اس صورت میں نرمی اور شائستگی سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اور قلم کو مہلک ھتھیار کی طرح استعمال کرنا قطعی جائز ھے۔ لیکن جب ھمارے مصنفوں میں سے کوئی ٹھوکر کھاکر گر پڑے، تو اس کی دوستانہ مدد کرنی چاھیئے، اس کو بتانا چاھیئے کہ اس سے غلطی کہاں سرزد ھوئی تاکہ آئندہ وہ اسی قسم کی غلطی پھر نہ کرے۔ اگر وہ اپنے متعدد ساتھیوں کی رائے پر کان دھرنا کسرشان سمجھے تو اس کو اجتماعی امداد منظور کرنی ھی پڑےگی اور اس کی کتاب پر وسیع پیمانے پر تخلیقی مباحثہ اس کو صحیح اور غلط کی پہچان کرنے میں مدد دینے کا بہترین طریقہ ھوگا۔ مغرورترین آدمی بھی، بشرطیکہ قدرت نے اسے عقل‌سلیم بخشنے میں کوتاھی نہ کی ھو تو سمجھ جائیگا کہ ایسا ھرگز نہیں ھو سکتا کہ صرف ''سارجنٹ قدم ملائے چل رھا ھو اور پوری کمپنی کے قدم گڑبڑ ھوں،،۔

ایک ایسی تنقید کی مثال کے طور پر جو زیادہ بااصول نہیں ھے ایلیا اھرن‌برگ کے ناول ''برف پگھلی،، پر کانستنتین سیمونوف کے مضمون کا نام لیا جا سکتا ھے۔ سیمونوف نے اس کتاب کی خامیوں کا صاف صاف اور تیکھے انداز میں ذکر کرنے کے بجائے ان کی لیپاپوتی کرنے کی کوشش کی ھے۔ جی نہیں، سیمونوف جب یہ مضمون لکھ رھے تھے تو ان کے پیش نظر ادب کی بھلائی نہیں تھی۔



اپنے گھر میں -

اجتماعی کاشتکاروں کی تیسری کمیونسٹی کانگرس میں شولوخوف تقریر کر رہے ہیں -



کہ تن کے کپڑے نہ بکیں۔ اور اس طرح وہ ادب کو خیرباد کہہ دیتا ھے، غالباً پھر کبھی اس کی طرف رخ نہ کرنے کے لئے۔

اور میں جو آپ سے عرض کرنا چاھتا ھوں وہ یہ ھے: بڑے مصنفوں میں سے کونسا ھے جس نے شاھکار تخلیقات سے آغاز کیا ھو؟ عموماً ان کی پہلی کوششیں ھمیشہ ھی اوسط درجے کی ھوتی ھیں۔

آپ چاھے کچھ کہیں مگر میں تو اس بات کے حق میں ھوں کہ واجب التعظیم مصنفوں کو، اور خصوصاً واجب التعظیم ڈرامہ نگاروں کو، نوجوانوں کے فائدے کے لئے حق محنت کے معاملے میں ذرا بھینچئیے۔

مستقبل کی ھماری امیدیں ان سے وابستہ ھیں اور وھی ادب کو بوڑھا نہ ھونے دیں گے...

۱۹۵۴ء

عوام کے لئے لکھنا ایک بڑا اعزاز ھے

(روستوف اور کامینسک علاقوں کے نوجوان مصنفوں کے سیمینار میں تقریر)

پیارے دوستو! ھم سب جو یہاں جمع ھوئے ھیں، وہ لوگ ھیں جو مختلف اصناف میں اور مختلف طرز تحریر میں تصنیف کرتے ھیں، ایک ھی سے نظریات کے حامل ھیں اور ایک ھی سی خواھش رکھتے ھیں کہ عوام سے حقیقت بیانی کریں۔ ھماری ذمہ داری بے پناہ ھے۔ کیونکہ عوام کے لئے لکھنا ایک بڑا اعزاز ھوتا ھے۔ میں کامریڈ میخائلوف کی، جو ایک نوجوان شاعر ھیں، نظمیں اور ان پر ان کے ساتھیوں کی سخت تنقید سن رھا تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ھے کہ ان کی شاعری میں پانی حد سے زیادہ ھے — فاضل پانی تو جب چاھیں نچوڑ کر نکال سکتے ھیں۔ جو چیز اھم ھے وہ یہ کہ یہ نوجوان شاعر، اپنے بزرگ ساتھیوں کی طرح، عوام سے سچ بات کہنا چاھتا ھے۔

عوام کے روبرو ایک مصنف کی ذمہ داری بڑی، بہت ھی بڑی ھوتی ھے۔ ھم سب کو مل کر اور فرداً فرداً ھم میں سے ھر ایک کو عوام کا ضمیر ھونا چاھیئے۔ اور مجھے، میرے نوجوان دوستو،

نوجوان مصنفوں کی تخلیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے نقادوں کو چاھیئے کہ ان کے ساتھ پدرانہ سختی اور احتیاط کا برتاؤ کریں ۔ ایک دفعہ مجھے کسی نے بتایا تھا کہ سنہری شاھین اپنے بچوں کو اڑنا کیسے سکھاتا ھے ۔ وہ ان کو پہلے تو اپنے پر مارکر اڑاتا ھے اور پھر نیچے اترنے نہیں دیتا بلکہ اوپر اور اوپر پرواز کرنے پر مجبور کرتا ھے اور اس وقت تک اڑاتا رھتا ھے جب تک کہ وہ تھک کر بےدم نہ ھو جائیں ۔ صرف اس طرح سے ھی سنہری شاھین کے بچے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرنا سیکھ پاتے ھیں... اپنے نوجوان مصنفوں کو سکھانے کا ھمیں یہی طریقہ اپنانا چاھیئے، انہیں بلند سے بلندتر پرواز کرنے پر مجبور کرنا چاھیئے تاکہ انجام کار وہ ادب کے حقیقی شاھین بن جائیں اور بھیگے کوے یا پالتو مرغیاں نہ بنیں ۔ لیکن سنہری شاھین پہلی کوشش میں مطلوبہ باندیوں تک پرواز نہ کر سکنے یا اس سے خوفزدہ ہونے پر اپنے بچوں کے پر توڑ نہیں ڈالتا ۔ نقادوں کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ ابھرتے ہوئے مصنفوں کے پر توڑ ڈالیں ۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے حادثات ھوتے رھتے ھیں ۔ کوئی حد سے زیادہ پرعزم نقاد کسی نوجوان مصنف کے سر پر موٹا سا ڈنڈا مار دیگا، اس کا رھا سہا اعتماد بھی ختم کر دیگا اور پتہ نہیں پھر یہ شاھین زادہ ھمت پرواز کر بھی سکے یا نہیں ۔

میں اس اندیشے سے متفق نہیں ھوں کہ نوجوان مصنفوں کو اچھا معاوضہ لازماً ان کے دماغ آسمان پر چڑھا دیگا اور ان کی تخلیقی قوت کمزور پڑ جائیگی ۔ صحتمند اخلاقی اصولوں‌والے کسی شخص کا چاھے وہ نوجوان ھو یا بوڑھا دماغ آسمان پر نہیں پہنچیگا خواہ وہ کتنی ھی شہرت اور ناموری کیوں نہ حاصل کر لے ۔ اور ایک ایسا شخص جس کی روح میں گھن لگا ھوا ھو وہ اپنے گہوارے ھی میں گھمنڈی ھو جائیگا....

زندگی میں صورت حال یوں بھی ھوتی ھے : کوئی نوجوان مصنف اوسطدرجے کی کتاب تصنیف کرتا ھے اور فرض کیجئے تین برس کی اس محنت کا پھل اس کو حقیر معاوضے کی صورت میں ملتا ھے ۔ یہ کتاب دوسرے ایڈیشن کے قابل تصور نہیں کی جاتی اور مصنف اپنی غلطیاں درست کرنے کے لئے پورا وقت صرف کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا اور نئی کتاب لکھنے کی تو اس کو مہلت ھی نہیں ملتی کیونکہ پچھلے تمام قرضے چکانے کے بعد اس کے پاس صرف اتنا بچتا ھے

نوجوان مصنفوں کی تیسری کل‌یونینی کانفرنس میں تقریر

هم مصنفوں کی قیادت میں میرے دوست یه اصرار کر کے میرے لئے بڑی الجھن پیدا کر دیتے هیں که نوجوان مصنفوں سے مجھے کوئی ''گہری،، عالمانه باتیں کرنی چاهیئیں۔

''دراصل، کیا؟،،

''بھئی، یہی که ان کو بتاؤ مصنف کا کام آسان نہیں هوتا، یه که بعض اوقات بڑا هی دشوار هوتا هے، یه که ادب ایک مقدس عمل هے وغیره وغیره۔ ،،

تو لیجئے میں حاضر هوں، اور هوتا کیا هے؟ میرے روبرو ۳۶۰ سب سے زیاده باصلاحیت اور سب سے زیاده قابل نوجوان مصنفین بیٹھے هیں۔ اور کیا ایسے لائق لوگوں کے سامنے مبادیات کے متعلق وعظ پڑھنے کے کوئی معنے هیں؟ چنانچه میں ان کے سامنے اسی طرح بولنےوالا هوں جیسے برابر کے لوگ اپنے برابر کے لوگوں سے بات‌چیت کرتے هیں۔

ادب کے اور اس موجوده کانفرنس کے متعلق مجھے یه کہنا هے که میں کامریڈ اژائیف سے جنہوں نے یہاں تقریر کی هے کچھ معاملوں پر متفق نہیں هوں۔

مثلاً میں ان کی تقریر کے اس حصے سے اتفاق نہیں کرتا جہاں انہوں نے کسی بھی کتاب کی تعریف کرتے هوئے اس کی عیب‌جوئی کرنا ضروری سمجھا هے۔ انہیں اسے سیمینار تک اٹھا رکھنا چاهیئے تھا جہاں کتاب کی تمام خوبیوں اور خامیوں، مصنف کے طرز تحریر اور تمام تخلیقی اجزأ پر تفصیلی بحث هوگی۔

کیا اس منبر سے تمام تفصیلات اور جزئیات کا ذکر کرنا ضروری تھا؟

میرا خیال تھا که کامریڈ اژائیف نے گورکی کا نہایت موزوں حواله دیا تھا که درختوں کی چھال کاٹنے کا طریقه آنا ایک بات هے اور اس چھال کو بنکر جوتے بنانا دوسری بات۔

میں آپ کا زیاده وقت نہیں لوں‌گا۔ اسی تشبیهه کو جاری رکھیں تو بہترین طریقه یه هے که جنگل کے کسی مانوس مقام پر درختوں کی چھال کاٹنا اور کام کو مکمل طریقے سے انجام دینا اس کی به‌نسبت

تم سے جو کہنا ہے وہ یہ ہے: نوجوان مصنف کو ہمیشہ ہی آسانیاں میسر نہیں ہوتیں۔ اکثر اس کو بہت سی مشکلیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن پھر بھی تمہارے ذہن میں جس چیز کی ابھی پوری طرح تشکیل نہیں ہوئی ہے اس کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں عجلت سے کام نہ لو۔ تم جو کتاب تخلیق کرو اسے دل پر اثر کرنا چاہیئے اور طویل زندگی پانی چاہیئے۔

ادب میں روزبروز نیا خون آرہا ہے اور روستوف کے مصنفوں کی انجمن کے میمبروں کی تعداد بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔

روستوف میں جنگ سے پہلے بھی مصنفوں کے ستاروں کا ایک روشن جمگھٹ تھا۔ شاعر گریگوری کاتس تھے اور قابل تعریف نثرنگار الکساندر بوسیگین تھے۔ وہ دونوں بےجگری سے مادروطن کی حفاظت کرتے ہوئے لڑائی میں کام آئے۔ نئے، نوجوان ادیب ان کی جگہ پر کرنے صفوں میں آ گئے اور تم بھی، انجام کار، اپنے بزرگ ساتھیوں کی جگہ لوگے۔ ہم سب مل کر سوویت مصنفوں کی ایک عظیم فوج ترتیب دیتے ہیں، گویا کہ ایک طاقتور ادبی فوجی دستے کے ''مکے،، کی تشکیل کرتے ہیں۔

اب تم یہاں ہماری تخلیقی کوششوں کے بارے میں بات چیت کرنے جمع ہوئے ہو۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ ان مسئلوں پر گرما گرمی اور جوش و خروش کے ساتھ بحث کرنی ہے۔ تمہیں اپنا کام جی جان سے کرنا چاہیئے، اور ہمارے دشوار پیشے کے لئے تمہیں تن من سے اپنے آپ کو وقف کر دینا چاہیئے۔

میں ایک بار پھر تمہیں خبردار کرنا چاہتا ہوں: شروع شروع میں تمہیں چاہے کیسی ہی مشکلوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے، سہل کامیابی کی جستجو ہرگز نہ کرنا۔ آخرکار تمہیں ہی ہماری جگہ لینی ہے، تم ہی ہماری امید کا مرکز ہو۔ تم ہی ہمارے مستقبل ہو۔ ابھی سے تم میں سے بہتوں کا حال بن چکا ہے، اور تم سب کا مستقبل ہے، ایک مصنف کا مستقبل۔ تم ایک شاندار قوم کے شاندار نمائندے ہو۔ میرے پیارے دوستو، میں تمہاری بھلائی کا خواہاں ہوں، میں تمہاری کامیابی اور عظیم‌الشان کارہائے نمایاں کا متمنی ہوں!

۱۹۵۵ء

ایک آدمی کے بس کی بات ھرگز نہیں ھے۔ لیکن تمام مصنفوں کی طرح میرا دل اس قدر پیار بھرا ھے کہ اگر آپ موجودہ تعداد سے دگنے بھی ھوتے تو پھر بھی خیالی طور پر میں سب کو گلے لگا لیتا!

افسوس کہ یہ ۱۹۵۷ء ھے ۱۹۲۷ء نہیں کیونکہ تیس برس پہلے میں اس اجتماع کا پورا اور برابر کا شریک ھوتا اور معمر مہمان نہ ھوتا۔ بات دراصل یہ ھے کہ میں وقت سے بہت پہلے پیدا ھو گیا اور اس بات کا قصوروار صرف میں ھی ھوں۔

مجھے امید ھے کہ آپ اس میلے سے محظوظ ھو رھے ھوں گے اور بڑا مزہ آرھا ھوگا۔ لیکن اس ھنگامی جشن میں آپ کو تمام براعظموں اور ملکوں کے نوجوانوں سے دوستی اور اتحادعمل کو کبھی نہ بھولنا چاھیئے، یاد رکھنا چاھیئے کہ یہ اتحادعمل نوع انسانی کو دنیا میں امن برقرار رکھنے میں مدد دےگا۔

۱۹۵۷ء

ڈان کے اپنے ھموطنوں کے نام

اب جبکہ میں پھر گھر واپس لوٹ آیا ھوں تو اپنے گاؤں والے ساتھیوں کو جلد از جلد مطلع کرنا چاھتا ھوں کہ روسی فیڈریشن کی مجلس وزراء کے فیصلے کے بموجب کارگینسکایا گاؤں میں اسکول کی نئی عمارت کی تعمیر امسال شروع ھو جائیگی۔ اپنا پورا لینن انعام میں نے نئے اسکول کی تعمیر کے لئے دیدیا ھے جو اس اسکول کی جگہ تعمیر ھوگا جس میں ایک زمانے میں میں نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔

کارگینسکایا کے تمام باشندوں کو میرا سلام محبت۔

۱۹۶۰ء

دلی شکریہ

(''جب زمین جاگی،، پر لینن انعام پیش کئے جانے کے موقع پر کریملن میں کی جانےوالی جوابی تقریر سے اقتباس)

اس یادگار موقع پر میں سب سے پہلے تو سوویت عوام کا شکریہ ادا کرنا چاھوں گا جنہوں نے مجھے ایک مصنف کا قلم دیا اور اپنے ناولوں کے لئے مجھے مواد کا ایک لازوال سرچشمہ فراھم کیا۔

بہتر ہوتا ہے کہ تھوڑا ایک جگہ کیا جائے اور تھوڑا دوسری جگہ۔ اپنی بات کی وضاحت کے لئے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ہمارے مصنفین، بزرگ اور نوجوان یکساں، ان علاقوں کی طرف دوڑ پڑے جہاں اجوت زمینوں کو زیرکاشت لاکر فروغ دیا جا رہا تھا تاکہ وہاں جاکر موضوعات اور پلاٹ تلاش کریں اور نتیجہ کچھ اچھا برآمد نہیں ہوا ہے، درحقیقت بہت سی صورتوں میں تو خاصا افسوسناک رہا۔ انہوں نے وہاں ایک یا دو مہینے قیام کیا یا غالباً چھہ مہینے بھی اور خاصے بہت سارے درختوں کی چھال اتار لی لیکن ان کو ابھی تک یہ نہیں آیا کہ اس چھال سے جوتے کیسے بنیں۔

آپ میں سے بیشتر وہ لوگ ہیں جو صوبجات سے آئے ہیں اور یہ بہت ہی اچھی بات ہے کیونکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ آپ زندگی سے قریبی تعلق رکھتے ہیں۔

میں جس چیز سے آپ کو خبردار کرنا چاہوں گا وہ معمر نوجوان ادیب، یوں کہنا چاہیئے ادب میں نوجوان خرانٹ بننا ہے۔ میری دعا ہے کہ آپ میں تخلیقی پختگی جلد آ جائے۔ اس کا صرف ہم مصنف ہی نہیں بلکہ قارئین بھی — ہمارے سخت گیر دلچسپی رکھنےوالے قارئین بھی خیرمقدم کریںگے جو غالباً دنیا میں سب سے زیادہ نکتہ سنج قارئین ہیں۔

اور اسی سلسلے میں ایک اور بات بھی ہے: برائے مہربانی بڑھاپے تک بچوں کا لباس زیب‌تن مت کئے رہیئے، کیونکہ ہم میں اب بھی کچھ مصنف ایسے ہیں جو، مجھے افسوس ہے کہ، ایسا کرتے ہیں۔

اپنی مختصر تقریر کے آخر میں دعاگو ہوں کہ محض اس سال ہی نہیں بلکہ آئندہ پوری زندگی میں آپ کو اپنے کام میں اور بھی جرأت آزما اور عظیم کامیابیاں حاصل ہوں۔

۱۹۵۶ء

دوستی کبھی نہ بھولو

اس جشن کے تمام شرکاء کو، اپنے پیارے نوجوانوں اور اپنے پیارے مہمانوں کو میں گرمجوشی سے گلے لگاتا ہوں۔ ''گلے لگانے'' کے نام سے آپ پریشان نہ ہوں: میں جانتا ہوں کہ یہاں، ماسکو میں آپ لوگ اتنی کثیر تعداد میں جمع ہیں کہ سب کو واقعی گلے لگانا

کہ ''جب زمین جاگی،، میں جہاں میں نے بہت ساری مختلف چیزوں کے بارے میں لکھا وہاں ادویاتی جڑی بوٹیاں جمع کرنے کے کاروبار کا کہیں تذکرہ نہیں کیا۔ یہ بھی ایک ایسا مطالبہ ھے جس پر عمل ناممکن ھے۔ اس قسم کی بہت ساری شکایتیں ھیں۔ لیکن میں ہر ایک کو تو خوش نہیں کر سکتا۔

میرے معاملے میں لینن انعام کا ملنا ایک گزری ہوئی منزل تصور کی جا سکتی ھے۔ میں چاھوں گا کہ اگلے سال کوئی نوجوان مصنف (اور اگر ایک سے زیادہ ھوں تو اور بھی اچھا ھے) میری جگہ کھڑا ھو۔

جب ھم نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تھا تو ھم، پرانی نسل کے مصنفوں کا ضرورت سے زیادہ توجہ دے کر لاڈ پیار نہیں کیا جاتا تھا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ھے کہ ادب کے میدان میں داخلہ پہلے سے زیادہ آسان کر دیا گیا ھے، لیکن جو کچھ ھو رہا ھے وہ بوڑھے کی جگہ نوجوان کو دینے کے منطقی عمل کے مطابق ھے۔ اور میں پوری طرح اس بات کے حق میں ھوں کہ اس منبر پر نوجوان چڑھے۔

میں قطعی طور پر یہ تسلیم کر لیتا ھوں کہ کوئی اور لینن انعام مجھے کبھی نہیں ملیگا لیکن اس بیان سے نتیجہ یہ اخذ نہیں ھوتا کہ ادب میں اپنا مقام میں بغیر کسی معرکے کے چھوڑ دوں گا!

یہاں مجھے اپنے رفقائے کار، پرانی نسل کے مصنفین نظر آ رہے ھیں اور زندگی اور ادب کے تجربے سے جس قدر لدے پھندے ھیں اس سے میرا خیال ھے کہ لوھا لئے بغیر ھم اپنے مورچے سے ھٹنے والے نہیں ھیں۔

میں پوری طرح اس بات کے حق میں ھوں کہ نوجوان ھماری جگہ لے لیں، مگر ھماری قطار میں آن کر کھڑے ھونے سے پہلے انہیں چاھیئے کہ کچھ خون پسینہ ایک کرلیں۔

میں دیکھ رہا ھوں کہ پچھلے برسوں کے لینن انعام یافتگان یہاں موجود ھیں، اور اس میں کچھ برائی نہیں کہ انعام دئے جانے کی تقریب میں ان کی موجودگی ایک روایت بن جائے۔ اگلے سال جب ھمارے نوجوان مصنفوں میں سے کسی کو اس کی محنت کے شایان شان یہ انعام دیا جا رہا ھوگا تو میں بھی ان کے درمیان بیٹھا ھوں گا۔ یہ بھی خیال برا نہیں کہ ادب اور فنون لطیفہ میں سوشلسٹ آرٹ کی ابدی مشعل علامتی طور پر دینے کو ایک روایت بنا لیا جائے۔

۱۹۶۰ء

میں ان بیشمار دوستوں کا — قارئین کا بھی شکریہ ادا کرنا چاھتا ھوں جنھوں نے لینن انعام کے لئے مجھے نامزد کیا۔

مرکزی کمیٹی اور سوویت حکومت کو میرا تہ‌دل سے شکریہ کہ میری تصنیف کو انھوں نے یہ بلند اعزاز بخشا۔ اور قدرتی طور پر میں لینن انعام کمیٹی کا شکریہ ادا کرتا ھوں اس بات کے لئے معافی کا خواستگار ھو کر کہ اس کا نام سب سے آخر میں لیا۔

مجھے معلوم ھے کہ جب کسی شخص کو انعام دیا جاتا ھے تو عام رواج کے مطابق وہ وعدہ کیا کرتا ھے کہ آئندہ اتنی ھی محنت سے کام کریگا۔ میری عمر کا اور میرے پیشے کی خصوصیات کا تقاضا ھے کہ اس لحاظ سے میں ذرا زیادہ محتاط رھوں۔

یقیناً مجھ سے ایک اچھے طالب‌علم کی طرح یہ وعدہ کرنے کی توقع تو کوئی نہ کرتا ھوگا کہ اگلے سال جو کچھ بھی میں لکھوں‌گا اس میں سب سے اچھے نمبر حاصل کروں‌گا۔ لیکن ایک انسان کے عزم کے ساتھ اور اپنی صلاحیت و قوت پر قطعی اعتماد کے ساتھ میں آپ سے اتنا ضرور عرض کر سکتا ھوں کہ اپنی پارٹی اور اپنے عوام کی اپنے قلم سے اتنی ھی مخلصانہ خدمت انجام دیتا رھوں‌گا۔

مجھے یہ عرض کرنا ھے کہ قارئین سے میرے تعلقات نہایت خوشگوار ھیں اور بحیثیت مجموعی وہ اچھے ھیں۔ قارئین سے متواتر تعلق اپنی طاقت میں مصنف کے اعتماد کو تقویت بخشتا ھے اور اسے اپنے کام میں مدد دیتا ھے۔ لیکن اپنے کچھ قارئین سے میرے معاملات بالکل خراب تو نہیں ھیں، مگر ان کو کیا کہوں — یوں کہہ لیجئے کہ ھمارے تعلقات قدرے سرد ھیں۔ اکثر جو مطالبات مصنف سے کئے جاتے ھیں وہ خاصے بےانداز ھوتے ھیں۔ ایک قاری نے مثلاً نہایت سنجیدگی سے شکایت کی کہ ”یوری میلوسلافسکی“ کے مصنف نے تو اپنے مرکزی کرداروں کو زندہ رکھا ھے لیکن شولوخوف نے ناگولنوف اور داویدوف دونوں کو مار ڈالا۔ اس نے سوال کیا: ”اس کا سوشلسٹ حقیقت‌پسندی سے بھلا کیا تعلق ھے؟“ یہ اس قسم کا مشورہ نہیں ھے جس پر کان دھرنے چاھئیں۔ اور آئندہ بھی میں اسی طرح لکھوں‌گا جس طرح میں سمجھوں‌گا کہ مناسب ھے۔

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔ مجھے لیستیخ‌سیرئے کے عملے کی جانب سے ایک غضبناک خط موصول ھوا جس پر کارخانے کے مینیجر اور تین لڑکیوں کے دستخط تھے۔ ان کو غصہ اس بات پر آیا تھا

کی عمودی چڑھائی چڑھیں ہیں۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ کبھی کبھی بڑا صبرآزما دور بھی آئیگا، ایسا کہ منہ خشک ہو جائیگا، ہونٹوں پر پپڑیاں جم جائیں گی۔ لیکن جب ہم چوٹی پر پہنچ جائیں گے تو وہ بےنظیر افق دعوت نظارہ دیں گے جنہیں کسی نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ اور اس بلندی پر چڑھ جانے کے بعد اگرچہ جسم تھک کر چور ہو چکا ہوگا مگر روح ہمیشہ کی طرح تروتازہ ہوگی تو وہیں ایک چشمۂ شفا اور آب حیات ہماری پیاس بجھا دیگا۔

اس چوٹی کا سر کر لینا اپنی عالمگیر اہمیت کے اعتبار سے ایک عظیم اور پرفخر کارنامہ ہوگا، اتنا ہی عظیم جتنا کہ وہ نصب‌العین جس کے حصول کے لئے ہم آگے بڑھ رہے ہیں۔ مگر پھر عظیم قوم کو عظیم شاہراہ ہی طے کرنی چاہیئے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ بڑے جہاز بڑے بڑے سمندروں میں ہی سفر کیا کرتے ہیں۔

اور کوئی بھی رکاوٹ یا مشکل ہمارے دلیر عوام کی، جن کی قیادت کمیونسٹوں کی نڈر اور دانشمند پارٹی کر رہی ہے، کمرہمت نہ توڑ سکیگی۔ دشمنوں کی سازشوں کے باوجود اور یقین نہ رکھنےوالے کم‌ہمتوں کی بڑبڑاہٹ کے برعکس ہم کمیونزم حاصل کر کے ہی رہیں گے۔ اسے ہم ضرور ہی حاصل کر لیں گے کیونکہ ہمارے عوام کا جو محنت کے کارہائے نمایاں اور مسلح کارہائے نمایاں دونوں شاندار طریقے سے انجام دیتے ہیں ایک کروڑ کمیونسٹوں کا ہراول مستقبل کی راہ روشن کر رہا ہے۔

مصری اہرام اور دوسری قدیم یادگاریں قوموں کی وہ قابل‌رحم کوششیں نہیں تو اور کیا ہیں کہ نوع انسانی کی تاریخ میں اپنی یاد کو دوام بخشدیں! زمانے کے ساتھ ساتھ یہ ساری یادگاریں غائب ہو جائینگی کیونکہ خاک ہونا اور پیوند زمین بن جانا ان کا مقدر ہے۔ کمیونزم مگر واقعی ایک ایسی لازوال یادگار ہوگی جو زمانے اور قدرت کی قوتوں سے بےنیاز ابد تک قائم رہیگی اسی طرح لافانی جس طرح مقدس نام لینن۔ کمیونسٹ سماج کے تمام معمار زندہ‌باد! زندہ‌باد ہمارے غیرملکی برادران، یاران و رفیقان، جو اپنے قول و فعل سے، بےدریغ‌وبلاپس وپیش ہماری، جو ہراول ہیں جو نگہبان ہیں، مدد کر رہے ہیں۔

جب میں پارٹی کے، پارٹی دوستوں اور رفیقوں کے متعلق سوچتا ہوں تو گوگول کے ناقابل فراموش الفاظ یاد آ جاتے ہیں۔ آپ کو ”تاراس بلبا“، میں وہ حصہ یاد ہے جہاں بوڑھا تاراس دوبنو کے مضافات

سوویت کمیونسٹ پارٹی کی بائیسویں کانگرس میں کی گئی ایک تقریر سے اقتباس

پیارے کامریڈ ڈیلی گیٹو!

مجھے یقین ہے کہ اگر میں کہوں کہ کانگرس کے ان اہم دنوں میں جبکہ ہم اپنی لیننی پارٹی کا نیا پروگرام منظور کر رہے ہیں، تو ہماری خود زندگی، کل سوویت عوام کی زندگی ایک نئے اور نہایت ہی خاص جذبے میں رچی ہوئی ہے، تو میں اس کا اظہار کر رہا ہوںگا جو ہر فرد بشر محسوس کر رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کہ تازہ اور فرحت بخش ہوا کا جھونکا آیا ہو جس نے دور کے مسحورکن افق ہماری آنکھوں کے سامنے عیاں کر دئے ہوں۔ ہمارا تنفس رواں اور گہرا ہو گیا ہے اور ہم اس من پسند مستقبل کے خدوخال واضح طور پر دیکھ سکتے ہوں جہاں آج سے بیس برس بعد ہم یقینی طور پر پہنچ جائیںگے۔

یہ پروگرام واقعی اتنا ہی پرشکوہ اور عظیم‌الشان اور اپنی تمام‌تر ماہیت اور ہیئت میں محنت‌کش نوع انسانی کی مسرت و شادمانی کا نقیب ہے!

تو کیا اس خواہش کا پیدا ہونا فطری نہیں کہ تہ‌دل سے ان کا شکریہ ادا کیا جائے جنہوں نے یہ پروگرام مرتب کیا، جنہوں نے حقیقی لیننی دوراندیشی کے ساتھ مستقبل قریب و بعید کو پیش‌نظر رکھتے ہوئے عوام کے خوابوں اور دیرینہ دلی آرزوؤں کو واضح طور پر متعین فرائض کا روپ دیا۔

جب بھی یہ سوچتے ہیں کہ ہماری طاقتور پارٹی نے کیسی کیسی مشکلوں پر عبور حاصل کیا، کیا کیا کچھ حاصل کر لیا اور کیا کیا کچھ اور حاصل کرنا ہے تو ایمان کی بات یہ ہے کہ رقت طاری ہو جاتی ہے کیونکہ سچ مچ یہ بڑا ہی قابل تعریف کارنامہ ہے! اور سچ پوچھئے تو بعض اوقات پارٹی اور سوویت عوام پر اس قدر فخر کرنے کو جی چاہتا ہے کہ دل ہی دل میں بے اختیار بے تکلفی کے ساتھ یوں تعریف کرتاہوں: ”واقعی تو خداداد صلاحیتوں‌والی قوم نہیں تو اور کیا ہے! تجھ میں جناتی طاقت نہیں تو اور کیا ہے! طاقتور بھی ہر جہت سے!“

ہم سب جانتے ہیں کہ تاریخ نے ہمیں تجویز کیا ہے کہ کمیونزم

ایک گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرتا ہے اور اس کی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔ صرف ایک گھوڑا جس کا نام بولیوار ہے باقی رہ جاتا ہے جو اتنا مضبوط ہے کہ دو آدمیوں کو بہ‌آسانی لیجا سکتا تھا۔ مگر اس کا مالک جو اسم باسمی شارک ڈاڈسن کے نام سے موسوم ہے کچھ اور ہی فیصلہ کرتا ہے۔ نہایت پرسکون لہجے میں وہ کہتا ہے کہ ''بولیوار دوسواریاں نہیں لیجا سکتا۔'' اور اسی سکون سے اپنے دوست کو گولی مار کر وہیں ٹھنڈا کر دیتا ہے۔

لوٹ کا مال جو ہاتھ آتا ہے اس سے شارک ڈاڈسن ایک خوشحال باعزت بورژوا بن جاتا ہے اور آڑھت کے کاروبار کے لئے اپنا دفتر کھول لیتا ہے۔ جب اس کے دوست ایک اور شخص کو جس نے سرمایہ لگایا ہوا تھا، دیوالیہ ہونے کا سامنا ہوتا ہے تو ڈاڈسن اسی سکون کے ساتھ اس کو دیوالیہ قرار دلوا دیتا ہے جس طرح اس نے اپنے دوسرے دوست کے سینے میں گولی پیوست کر دی تھی اور وہی فقرہ دھرایا : ''بولیوار دو سواریاں نہیں لے جا سکتا''...

اس کانگرس میں تقریر کرنے والوں نے فرقہ‌بندی کرنے والوں کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے، ان لوگوں کے بارے میں جنھوں نے پارٹی رفاقت کے مقدس رشتوں کا مذاق اڑایا ہے۔ یہاں کانگرس میں ہمیں ان کی مجرمانہ سرگرمیوں کے متعلق نئی تفصیلات کا علم ہوا۔ قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے : پارٹی کی صفوں میں ہمیں ان لوگوں کے شانہ بشانہ کب تک کھڑے رہنا ہوگا جنھوں نے پارٹی کو اس قدر ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔ کیا ہم ان لوگوں کے ساتھ حد سے زیادہ صبر و تحمل سے پیش نہیں آ رہے جن کا ضمیر پارٹی اور ملک کے ہزاروں وفاشعاروں کی موت اور یوں کام آنےوالوں کے لواحقین کی تباہ وبرباد زندگی کے بوجھ تلے دبا ہوا نہیں ہے؟

کانگرس پارٹی کا اعلیٰ‌ترین ادارہ ہوتی ہے۔ اسے چاہئے کہ فرقہ بندی کرنےوالوں اور بھگوڑوں کے متعلق سخت لیکن منصفانہ فیصلہ کرے۔

اور ناگوار لوگوں کے متعلق اس ناگوار گفتگو کو ختم کرنے کے لئے میں آخر میں آپ سے پھر اجازت چاہتا ہوں کہ تاراس بلباؑ کی تقریر کا ایک اور اقتباس پیش کروں جہاں وہ دوستی کا ذکر کرتا ہے۔

بوڑھے تاراس بلبا نے بھی اپنے زمانے میں فرقہ بندی کرنے والوں کے خلاف جدوجہد کی تھی، فرق یہ ہے کہ ان دنوں وہ منحرف کہلاتے

میں لڑائی شروع ہونے سے پہلے زاپوروژیئے کاسکوں کو خطاب کرتا ہے؟ وہ ان سے کہتا ہے: ''دوستی سے زیادہ مقدس رشتہ اور کوئی نہیں ہوتا! باپ اپنے بچے کو پیار کرتا ہے، ماں اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے، اور بچہ اپنے ماں باپ سے پیار کرتا ہے۔ مگر بھائیو، یہ تو الگ بات ہے کیونکہ اپنے بچوں سے پیار تو جانوروں کو بھی ہوتا ہے۔ صرف انسان ہی خون کا نہیں بلکہ روح کا رشتہ قائم کر سکتا ہے۔''

ایمان کی بات ہے کہ یہ بڑا ہی شاندار قول ہے۔ ہم، کمیونسٹ مارکس — اینگلس — لینن کے خیالات کے ذریعے، اس تصور کے ذریعے جس کے لئے کمیونسٹ پارٹی ایک فاتحانہ لڑائی لڑ رہی ہے، ایک دوسرے سے متعلق ہو گئے ہیں اور ہمارے لئے اپنی پارٹی رفاقت سے زیادہ مقدس اور کوئی رشتے نہیں ہیں۔ ہم بھی اپنے بچوں اور اپنی بیوی سے محبت کرتے ہیں مگر جیسے کہ تاراس بلبا کہتا ہے: ''مگر بھائیو، یہ الگ بات ہے۔'' اس سے ہمارے بچوں اور ہماری بیویوں کو ناراض ہونا نہیں چاہئے۔ مگر اس کا کوئی چارہ کار نہیں، انہیں اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑیگا اور بس۔ لیکن یہاں آ کرہی ہار ماننی پڑتی ہے... صاف ظاہر ہے کہ ہماری بیویاں اس تصور ہی سے برا مان جائینگی کہ پارٹی رفاقت کے ہمارے رشتے رشتہ ازدواج سے زیادہ مقدس ہیں۔ شاید میں نے بیویوں کا ذکر کرکے ہی اپنی ٹانگ پھنسالی ہے۔ تاراس بلبا نے درحقیقت ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ اور اب غالباً میں ہی پہلا شخص ہوں گا جسے گھر لوٹتے ہی گوگول کی لافانی تخلیق کے اس اقتباس کو ڈھونڈ نکالنے کا خمیازہ بھگتنا پڑےگا۔ لیکن میں خوفزدہ نہیں ہوں کیونکہ مجھے آپ کی پرخلوص ہمدردی پر اعتقاد ہے اور، اس کے سہارے، میں گھربار کی سخت‌ترین صعوبتوں کا بھی مقابلہ کرنے کے لئے ڈٹ جاؤں گا۔ مگر میری آپ سے صرف ایک التجا ہے، آج شب اپنی دعاؤں میں مجھے یاد رکھنا نہ بھولئے!

لیکن رفاقت کے جذبات کو ہم اور سرمایہ‌دار مختلف طریقوں سے سمجھتے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال او۔ہنری کا افسانہ ''ہماری راہیں'' پیش کرتا ہے۔ اس افسانے کا پلاٹ نہایت سادہ ہے: تین لٹیرے ایک امریکی ڈاک گاڑی پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ گاڑی کے سنتری کی گولی سے ایک ڈاکو مارا جاتا ہے۔ دوسرے دو مال غنیمت لیکر فرار ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے گھوڑوں پر سوار اڑے چلے جا رہے ہوتے ہیں کہ

توجہ گئی۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ بلیوں کا سینی‌ٹوریم ہے۔ ظاہر ہے ان دبلی پتلی، مریل بلیوں کےلئے نہیں جن سے شہر کی گندی بستیوں میں بھوکے، کمزور بچے کھیلا کرتے ہیں — بلکہ نرم نرم گدگدی بلیوں کے لئے جو اطالوی اور دوسرے کروڑپتی خواتین و حضرات شوقیہ پالتے ہیں۔

ان بلیوں کا علاج جو بیکاری اور موٹاپے سے بیمار ہو جاتی ہیں تجربےکار ڈاکٹر کرتے ہیں، تربیت‌یافتہ نرسیں انہیں نہلاتی دھلاتی ہیں، برش کرتی ہیں اور انہیں خوشبو میں بساتی ہیں، اور ان ملعون مریضوں کو طرح طرح کی لذیذ غذائیں دیتی ہیں، انہیں ہواخوری کو لے جاتی ہیں، غرض ہر طرح ان کی مدارات کرتی ہیں۔ اور وہاں سے تھوڑی ہی دور بھوکے بچے کوڑے کے ڈھیروں کو کھنگال رہے ہوتے ہیں، دھنسی ہوئی آنکھوں میں غیر طفلانہ نا اسیدی لئے آتے جاتوں کو گھور رہے ہوتے ہیں۔ کیا اس کو انسان دوستی کہتے ہیں؟ ہماری زبان میں اسے بددماغوں کی رذالت کہتے ہیں۔ سرمایہ‌داروں کو چاہئے کہ لفظ ''انسان دوستی،، کو اپنے لغت سے نکالدیں کیونکہ یہ انسان کے بھیس میں درندوں کے استعمال کےلئے نہیں ہے۔

پیشہ‌ور مصنف کی حیثیت سے مجھے ادب کے متعلق بات کرنی چاہئے لیکن آپ سب کی طرح میں سب سے پہلے کمیونسٹ ہوں اس لئے میں نے آغاز اسی سے کیا جس سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوں حالانکہ میں یہ ایک لمحے کےلئے بھی فراموش نہیں کر رہا کہ ادب بھی عام پارٹی نصب العین کا ایک جزو ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ میں اس طویل تعارف کےلئے آپ سے معافی کا خواستگار ہوں اور میں ادبی معاملات پر آتا ہوں...

بہت ساری ایسی کتابیں شائع ہوتی ہیں جو بہت جلدی ہی گویا دوبارہ پگھلانے کے لئے کوٹھالی میں ڈالدی جاتی ہیں۔ وجہ؟ وجہ ہم سب کو معلوم ہے۔ گھٹیا تخلیق اور بڑھیا تخلیق کے لئے قارئین کی مانگ کے درمیان عدم توازن۔ پھر بھی پہلی سرسری نظر میں صورت‌حال جتنی تباہ‌کن معلوم ہوتی ہے اتنی ہے نہیں۔ نہایت ہی خوش آئند عمل جاری ہے جو قارئین کو کم ہی محسوس ہوتا ہے: نوجوان اور حقیقی معنوں میں خداداد صلاحیت رکھنےوالے مصنفین کا پورا ایک گروہ ایسا ہے جن کے افسانے رسالوں میں شائع ہوچکے ہیں اور جو پختہ اور ہونہار باکمالوں میں تبدیل ہوتے جارہے

تھے۔ اور اس نے جو کہا تھا وہ یہ ہے: ''لیکن بدترین منحرف میں، چاہے وہ کتنا متعفن کیوں نہ ہو گیا ہو، چاہے وہ غلاظت میں لتھڑا ہوا ہو اور شیطان کی پرستش کر رہا ہو، اس میں بھی بھائیو روسی ہونے کا ذرہ برابر احساس ضرور ہوتا ہے۔ یہ احساس اس میں ایک نہ ایک دن ضرور بیدار ہوگا اور وہ بیچارہ بدحال سربسجود ہو جائیگا، اپنے سر کو ہاتھوں میں تھام لیگا اور پکار پکار کے اپنی بزدلانہ زندگی کو کوسیگا اور اپنی شرمناک حرکتوں کی کوئی بھی سزا بھگتنے کو تیار ہوگا۔''

لیکن ظاہر ہے زاپوروژیئے کاسکوں میں سے جن لوگوں نے غداری کی تھی یہ بات ان کے متعلق کہی گئی تھی اور یہ مسئلہ بحث‌طلب ہے کہ آیا آج کے بھگوڑوں میں اتنی جرأت ہوگی کہ وہ ''پکار پکار کے اپنی بزدلانہ زندگی کو کوسیں'' اور آیا وہ ''اپنی شرمناک حرکتوں کی کوئی بھی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔'' نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ وہ ایسا نہیں کریں‌گے۔ یہ اس خمیر کے نہیں ہیں۔ بھگوڑے تو وہ ضرور ہیں مگر مختلف چھاپ کے۔ بہرحال وقت سب کچھ بتا دیگا۔

بورژوا اخبارات جو غل مچائیں‌گے اس کا تصور کیا جا سکتا ہے: دیکھئے یہ کمیونسٹ مصنفین اصل میں کیسے ہیں۔ انسانی محبت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے جس کا تقاضا ان کا پیشہ کرتا ہے یہ لوگ بدلہ لینے کا مطالبہ کر رہے ہیں! تابعدار بورژوا تحریرفروشوں میں سے کوئی اس قسم کی بات ضرور لکھیگا۔ ان کے لئے میرے پاس جواب تیار ہے۔ ''کم ظرف حضرات، اپنے جامے میں رہئے، بدلہ کوئی نہیں لے رہا، فرقہ بندی کرنےوالوں کا سازشی زہریلا خون کسی کو نہیں چاہئے، لیکن عوام اور پارٹی کے خلاف جنھوں نے جرائم کا ارتکاب کیا ہے ان کو اس کا جواب دہ ضرور ہونا پڑیگا۔ یہ وہ قانون ہے جو ساری انسانیت پر یکساں عائد ہوتا ہے۔''

رفاقت کی طرح انسان دوستی بھی ایک ایسا تصور ہے جسے ہم اور سرمایہ‌دار یا ان کے عالمی نقطۂ نظر سے اتفاق رکھنےوالے لوگ مختلف طریقے سے سمجھتے ہیں۔ دندان سازوں کی طرح خراب دانت کو ہم نکال دیتے ہیں جو تندرست اور صحت مند اعضاء کو تکلیف پہنچاتا ہے اور یہ فعل انسان دوستانہ ہوتا ہے۔ موازنے کے لئے انسان دوستی کے مختلف تصور کی ایک اور مثال پیش کرتا ہوں۔ جب میں اٹلی گیا تھا تو روم کے نواحی علاقے میں ایک شاندار عمارت کی طرف

معیشت کے ماہر کی سطح کی معلومات حاصل ہونی چاہئیں - جو لوہے اور فولاد کے کارخانے کے متعلق، اس کے مزدوروں، انجینئروں اور مستریوں کے متعلق لکھتا ہے ان کو کم از کم ایک اعلی قابلیت رکھنےوالے مزدور کی طرح پیداوار کا اچھی طرح علم ہونا چاہئے - جو مصنف ہماری فوج پر قلم اٹھائے اس کو عسکری معاملات میں کوپرین اور لیو تالستائی سے کم مہارت کا مالک نہ ہونا چاہئے ورنہ اس کی باتیں بےسروپا ہوں‌گی اور اس کا نغمہ بےسرا - اکثر یہی ہوتا ہے - اب افسانۂ محبت ایک ایسی چیز رہ جاتی ہے جسے لکھنے کو ہر ایک آزاد ہوتا ہے — یہی ایک ایسا موضوع ہے جو کسی خاص علم کی مہارت کا طلبگار نہیں ہوتا...

نوجوان صوبائی شاعروں کو جو ''غیرفانی قدریں،، تخلیق کر رہے ہیں ماسکو یا دوسرے بڑے شہروں میں سے کہیں جانے کی ممانعت نہیں کی جاسکتی - وہ ہمارے فیشن‌ایبل خلوت نشین شعرا کے ماسکو کے ادبی اجتماعات میں شان و شوکت سے نمودار ہونے کا شہرہ اور اس کے لوازمات کی تفصیل سنا کرتے ہیں کہ کیسے سواروں کا دستہ مجمع کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے اور کس طرح ان کی مداح ادب و آرٹ کا دم بھرنےوالی لڑکیوں کے غول کے غول والہانہ مدح سرائی میں آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں - صوبجاتی نوجوان شعرا بھی چاہتے ہیں کہ بےانتہا تنگ موریوں کے پتلون اور بےوجہ لمبے چوڑے سویٹروں میں ملبوس یہ لڑکیاں انہیں اپنی دیوانگی کا مرکز بنالیں - وہ بھی چاہتے ہیں کہ ناموری کے میٹھے پھل کا مزہ چکھیں - چنانچہ وہ بھی اسی جوش عقیدت کے ساتھ ماسکو پر ٹوٹ پڑتے ہیں جس یقین کے ساتھ زائرین سفر مکہ پر روانہ ہوتے ہیں - اور اس سے انہیں باز رکھنے میں کوئی حجت، کوئی قرنطینہ باز نہیں رکھ سکتا - ان پر تو یہی دھن سوار ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح بس ماسکو پہنچ جائیں -

مثلاً بھلا فیدین، لیونوف، میکسم ریلسکی یا مجھے اس سے کیا کہ کوئی نوجوان عورت بازار میں جو بھی اس کے ساتھ ہو اس کو ہماری طرف اشارہ کرکے بتائے: ''دیکھو، وہ فلاں فلاں ہے!،، ہمارے لئے اس میں اب کوئی لطف نہیں رہ گیا ہے - جب کوئی اس‌قدر بےتکلفی سے نام لے تو جھرجھری سے آتی ہے - مگر یہی وہ چیز ہے جس سے کسی نوجوان مصنف کے دل میں لڈو پھوٹنے لگتے ہیں اور بعض نوجوان تو واقعی پھولے نہیں سماتے - مروت کرنے کی ضرورت نہیں مگر

هیں - یہ صرف روسی نہیں بلکہ سوویت یونین کے تمام قومی ادبوں کی بھی خصوصیت ہے - یہاں میں ان کے نام نہیں گنوا رہا کیونکہ قارئین ان کے ناموں سے بخوبی واقف ہیں اور میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ صرف یہی ہے: ان کی ہر طرح سے مدد کرنی چاہئے تاکہ انہیں دو تین سال تک کام کرنے کا موقع مل جائے اور انہیں مستقبل کی فکر نہ کرنی پڑے، اور جن بڑی تصانیف پر انہوں نے کام شروع کیا ہے اور جن کی تصویر عرصۂ دراز سے ان کے ذہن میں محفوظ تھی، اور جن کے لئے انہوں نے نہایت مہارت کے ساتھ مواد اکٹھا کیا ہے، اس سے ان کو الگ نہ ہٹنا پڑے -

اگر ہم یہ مدد صرف ان مصنفوں تک ہی محدود نہ رکھیں جو صدر مقاموں میں رہتے ہیں بلکہ ان صوبجاتی لوگوں تک بھی پہنچائیں جو ملک بھر میں بڑی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں تو ایسے مصنفوں کی تعداد میں قابل لحاظ اضافہ ہو جائے - یہ سب کے سب اپنے تجربے سے زندگی کو اچھی طرح جانتے ہیں، انہوں نے بہت سے سفر کر رکھے ہیں اور بہت کچھ دیکھ رکھا ہے، لیکن خاص بات یہ ہے کہ خداداد صلاحیت رکھنے والے یہ ایسے مصنفین ہیں جو بدقسمتی سے بڑے بڑے — صرف ضخامت ہی میں نہیں — ناول لکھنے کے کام پر اپنا پورا وقت صرف نہیں کرسکتے - یہ وہ لوگ ہیں جن پر ہمیں دانو لگانا چاہئے - بہرحال اکثریت ہمیں مایوس نہ کرےگی — اور یہ کچھ کم نہیں -

پچھلے دنوں کچھ اچھی کتابیں شائع ہوئی ہیں مگر ان کی تعداد تکلیف‌دہ حد تک کم ہے - ہم اور بھی زیادہ تخلیق کرسکتے تھے اور یہ خیال ڈیلی گیٹ ساتھیو اور قارئین، آپ سے کہیں زیادہ ہمارے لئے افسوسناک ہے -

میرا کہنا اب بھی یہی ہے کہ اس بات کی سب سے بڑی وجہ کہ ہمارا ادب کیوں زندگی کے ساتھ ساتھ نہیں بڑھ رہا اور کیوں معمولی قسم کی کتابیں نمودار ہو رہی ہیں، یہی ہے کہ ادیب حقیقی زندگی سے کٹ کر الگ ہو گئے ہیں - یہ ایک ایسا مظہر ہے جو مصنفوں کے ماحول میں قائم ہو کر رہ گیا ہے - اور ہماری تیزرفتار زندگی سے اور اس کے متواتر تبدیل ہوتے ہوئے خدوخال سے ان ادیبوں کی واقفیت محض سطحی ہے...

جو مصنف اجتماعی فارم یا ریاستی فارم کے لوگوں کے متعلق لکھتا ہے اس کو، میری رائے میں، زراعت کے متعلق کم از کم زرعی

مجھے احساس ہے کہ میری تقریر سے قدرے مایوسی ٹپکتی ہے مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ میں اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ پاتا: لالچ مجھے آن دبوچتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھی کتابیں بہت ساری ہوں اور وہ ہیں اتنی تھوڑی۔ مجھے اپنے آپ پر اور دوسروں پر غصہ آتا ہے مگر کیا فائدہ؟ ان مسئلوں پر اجتماعی طور پر اور غیرضروری عجلت کے بغیر فیصلہ کرنا چاہئے۔

اس قسم کے معاملے میں عجلت سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا اور یہاں ایک اور مصیبت ہے — اور مصیبت، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، اکیلی نہیں آتی۔ اپنی نہایت اچھی اور دلچسپ تقریر میں یوکرین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سیکریٹری کامریڈ پودگورنی نے ایک موقع جو میرے خیال میں بہت اچھا تھا، کھو دیا۔ انہوں نے اس بات کا ذکر کیوں نہیں کیا کہ جو یوکرینی مصنفین کانگرس کے ڈیلی گیٹ بن کر آئے ہیں وہ صرف کیئف ہی سے آئے ہیں؟ وہ کہہ سکتے تھے: اس امر کے پیش نظر کہ کامریڈ مصنفین آپ سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی اس کانگرس کے لئے یوکرین کے علاقائی مرکزوں سے منتخب ہوئے تھے، اپنا گھر آپ وہیں کیوں نہیں بنا لیتے؟ وہیں ہنسی خوشی کیوں نہیں رہتے اور ان مقامی محنت کشوں کے بارے میں نہیں لکھتے جنہوں نے آپ کو ووٹ دیا ہے؟ اگر آپ علاقہ پولتاوا سے منتخب ہوئے ہیں تو پولتاواوالوں کے متعلق لکھئے، اگر آپ علاقۂ چیرنی گوف سے منتخب ہوئے ہیں تو چیرنی گوف والوں کے بارے میں لکھئے۔ مگر نہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا۔ اور اب مصنفین پھر صدر مقام کیئف واپس چلے جائیں گے اور سب کچھ ویسا ہی ہو جائیگا جیسے کہ پہلے تھا۔ یہی شکایت ان دوسرے علاقوں کے سیکریٹریوں کے بارے میں کی جا سکتی ہے جو مصنفوں سے بھرے پڑے ہیں۔ سیکریٹریوں کو چاہئے تھا کہ مصنفوں کو مناتے اور ان کو اپنے صوبجاتی شہروں میں اور گاؤں میں آنے کی دعوت دی ہوتی جو اب کسی طرح بھی پرسکون نہیں رہ گئے ہیں تاکہ وہ جہادی اور وہ چاہے کچھ ہو مگر خوابیدہ نہیں ہے، زندگی بسر کریں جس سے ان کو زندگی کا گہرا علم حاصل ہو اور ان میں سچی تخلیقی کوشش کی امنگ پیدا ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس غلطی کی اب بھی اصلاح ہو سکتی ہے۔

ہمارا ادب صف اول کا ادب ہے اور اس کا سبب محض نظریاتی ساہیت ہی نہیں ہے۔ غیرممالک کے ناشرین سے ہمارے تعلقات بڑھ

پھر بھی نوجوانوں کے جذبات کی قدر کرنے کی کوشش کرنی چاھئے۔
آپ میں سے بہتوں نے غالباً دیکھا ھوگا کہ پرانے زمانے میں کسان بوائی سے پہلے بیجوں کو ایک بڑے سے چھلنے میں چھان لیا کرتے تھے جو چھینکے کی طرح ٹنگا ھوتا تھا۔ خاک اور بھوسہ ھوا سے اڑ جاتے اور پورے وزن کے بیج باقی رہ جاتے۔ یہی صورت ادب میں ھوگی۔ بھوسہ اڑجائیگا اور بیج رہ جائیں‌گے۔ وقت اس چھلنے کو جھلاتا ھے اور صفائی کا لازمی عمل یقیناً انجام پائیگا۔
یہ تو ھے نوجوانوں کی کیفیت۔ بزرگ مصنفوں کا بھی چنداں بہتر حال نہیں ھے۔ شہر میں رھنےوالے سے بھلا آپ کیسے کہہ سکتے ھیں کہ وہ بڑھاپے میں ھمت کرکے صوبائی علاقے میں نکل کھڑا ھو جو اسے نہایت خوفناک جگہ معلوم ھوتی ھے؟ اور پھر وھاں اس سے کسی کا کیا بھلا ھوگا۔ ذاتی طور پر میں تو مصنفوں کو ان لوگوں کے قریب جن کے متعلق وہ لکھتے ھیں، منتقل ھو جانے کی آس عرصہ ھوا چھوڑ چکا ھوں۔ اس امید کے پورے ھونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی...
یہاں کانگرس میں توقع ظاھر کی گئی ھے کہ مصنفین اور فنون لطیفہ میں حصہ لینےوالے لوگ عوام کے مشفق و دانا مشیر بنیں‌گے۔ مگر جو شخص زندگی سے واقف ھی نہ ھو وہ ایک اچھا مشیر مشکل ھی سے بن سکتا ھے۔ اپنے مشورے سے وہ جن گتھیوں میں پھنسادےگا ان سے نکلنا ھی مشکل ھو جائیگا... واقعی ایک مصنف — خالص شہری باشندہ جس نے تیس یا چالیس برس پہلے کبھی گاؤں دیکھا ھوگا اور جس کا اس سے تعلق قطعی ٹوٹ چکا ھو، اور بعض کا تو کبھی تعلق ھی نہ رہا ھوگا — کسی اجتماعی فارم کے صدر کو یا ریاستی فارم کے ڈائریکٹر کو جو تجربہ کار ھو اور اپنے کام کے اسرار و رموز سے آشنا ھو، پیداوار کے معاملات میں بھلا کیا مشورہ دے سکتا ھے؟ اخلاقی مسائل میں بھی فارم کے بظاھر سیدھے سادے نظرآنےوالے یہ لوگ بعض مصنفوں کو بہ‌آسانی پیچھے چھوڑ سکتے ھیں۔ بہتر یہی ھے کہ جو مصنف بہار اور سرما کی فصلوں میں تمیز نہ کر سکتا ھو، یا جو اور جوار کا فرق نہ جانتا ھو اسے ناخواندہ مشیر بن کر پہنچنے کی آرزو نہیں کرنی چاھئے اور اگر نادانی کی بنا پر اس کے سر میں سما جائے اور وہ کوئی مشورہ دے بیٹھے تو بہتر یہی ھے کہ بن پڑے تو جان چھڑا کر بھاگ نکلے۔

مصنف، بشرطیکہ وہ ''مردہ دل،، نہ ہو ان لوگوں کے متعلق جن سے وہ محبت کرتا ہو سرد مہری اور بےنیازی کے ساتھ کیسے لکھ سکتا ہے؟

کہتے ہیں کہ چیخوف کا قول تھا: ''لکھنے بیٹھو تو برف کی طرح ٹھنڈے ہوکر،،۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا۔ فنکار بوقت تخلیق سرد کیسے رہ سکتا ہے! اگر آپ کا خون مچھلی کے خون کی طرح ٹھنڈا ہو اور دل پر چربی کی اتنی تہیں جم چکی ہوں کہ اس میں تڑپ باقی نہ رہی ہو تو آپ کوئی ادبی تخلیق نہ کر سکیں گے، اور قارئین کے دلوں تک پہنچنے کا راستہ آپ کبھی بھی تلاش نہ کرپائیں گے۔

میں تو چاہتا ہوں کہ جب کوئی ادیب لکھ رہا ہو تو خون اس کی رگوں میں جوش کھا رہا ہو، میں چاہتا ہوں جب وہ دشمن کے بارے میں لکھ رہا ہو تو فرط نفرت سے اس کا چہرہ زرد پڑ جائے، میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنے کرداروں کے ساتھ جنہیں وہ تخلیق کرتا ہے، جن سے وہ محبت کرتا ہے جو اس کو عزیز ہوتے ہیں، ہنسے اور روئے۔ صرف اس طرح ہی حقیقی فن پارہ تخلیق ہوگا جعلی نہیں۔

اب تو میں اپنے پیشے سے مخصوص باتیں کرنے لگ گیا اور میرا خیال ہے کہ آپ کو ان سے دلچسپی نہیں ہوگی۔ اب میں مختصراً ان فرائض کا ذکر کروں گا جو سوویت ادب کو درپیش ہیں۔

بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے ہمیں جدوجہد کرنی پڑےگی۔ اور میرے خیال میں سب سے پہلے اپنے ہاں کے نوجوانوں پر اثرانداز ہونے کے لئے۔ ہمارے نوجوان قابل تعریف ہیں۔ ہمارا ملک بہت کچھ ان کے جوش و خروش اور ان کی محنت کے کارناموں کا مرہون منت ہے۔ لیکن ہمارے نوجوانوں کا نہایت ہی خفیف حصہ جذباتی طور پر بےچین ہے، روزمرہ کی باتوں میں مہم جوئی کا متلاشی ہے اور وہ اس کو ان میں نہیں مل رہی۔ اور مہم وہیں موجود ہے، ان کو بس کرنا یہ ہے کہ ہاتھ بڑھا کر اس کو لےلیں اور اپنے اطراف و جوانب کی زندگی کو قریب جاکر غور سے دیکھیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ان نوجوانوں کو اجنبی اثر سے نجات دلائیں اور کام اور جرأت آزما کوششوں کی جانب ان میں صحیح رویہ پیدا کریں۔

آج مصنف صرف اس مسئلے ہی سے دوچار نہیں ہیں اور آئندہ بھی صرف اسی سے ان کا سامنا نہیں ہوگا۔ ضرورت ہے کہ سوویت کنبے،

رہے ہیں۔ ہماری کتابیں ہر جگہ شائع ہوتی ہیں۔ ہیئت کی بہ نسبت موضوع قارئین کی دلچسپی کا خاص باعث ہوتے ہیں کیونکہ غیرملکوں میں ہماری زندگی سے، ہماری آج کی حقیقت سے گہری دلچسپی پائی جاتی ہے۔

لیکن ہم سوویت مصنفوں کو خود اپنے نقادوں کی بہ نسبت غیرممالک کے نقادوں سے زیادہ شکایت ہے۔ اگر ہمارے نقادوں میں سے اکثر و بیشتر کو زندگی کا کافی علم نہیں ہے تو غیرممالک کے نقادوں کو علم تو الگ رہا اس کا کوئی تصور تک نہیں ہے۔ ہمارے خلاف وہ جو شکایتیں کرتے ہیں بسا اوقات وہ نہایت غیر معقول ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی تحریروں میں جانبداری سے کام لیتے ہیں۔ اور انہیں ہم سے کیا توقع ہے؟

فرض کیجئے میں ایک سوویت فوجی کے متعلق لکھ رہا ہوں، اس شخص کے متعلق جو مجھے بے انتہا عزیز اور پیارا ہے۔ میں اس کی برائی کیسے کر سکتا ہوں؟ وہ میرا ہے، اپنی دوپلی ٹوپی سے لیکر اپنے پاؤں کی جرابوں تک اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کے چہرے پر چیچک کے داغوں کو، یا اس کی خصلتوں کی بعض خامیوں کو نظرانداز کر جاؤں۔ اور اگر میں ان چیزوں کو دیکھ بھی لیتا ہوں تو میں اس کے بارے میں کچھ اس انداز سے لکھتا ہوں کہ چیچک سے داغدار اس کے بھدے چہرے اور خصلت کی معمولی خامیوں سمیت قارئین اس کو چاہنے لگ جائیں۔

یہاں اپنے سامنے میں جن لوگوں کو دیکھ رہا ہوں ان میں سے بیشتر کے پاس زندگی کے اور دوسرے تجربوں کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ بعض اوقات کسی سادہ سی عورت کے چہرے کی جھائیاں آدمی کو ساری دنیا کے بےداغ، حسین چہروں سے زیادہ عزیز ہو جایا کرتی ہیں۔ اور جس عورت سے وہ پیار کرتا ہے اس کی تھکی ہوئی آنکھوں کے پاس کرنوں کی طرح پھیلی ہوئی جھریاں اس کو کسی نوجوان حسینہ کی الہڑ مسکراہٹ کی آب و تاب سے زیادہ حسین معلوم ہوتی ہیں۔ اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ایسی عورت کے عشق میں جس کی طرف آپ کبھی دوبارہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں کوئی ایسا خوبرو نوجوان مبتلا ہو جاتا ہے کہ آپ دم بخود رہ جاتے ہیں! زندگی میں طرح طرح کے حادثات ہوتے ہیں اور یہ آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں اور میں بھی۔ تو پھر کوئی

اور سویڈن میں جہاں کھیتی کے باڑے بناکر نگلوں میں رہنے کا نظام جاری ہے یہ خواہش میری سمجھ میں آتی ہے۔ بڑے بڑے گاؤں نہیں ہیں، لوگ بکھرے ہوئے رہتے ہیں، مکان ایک دوسرے سے کوئی چار چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں اور اس لئے اس کی وجہ سمجھائی اور سمجھی جاسکتی ہے۔ سینما دیکھنے جانا ہو تو اس کے معنے بارہ پندرہ کلومیٹر کا سفر کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور جہاں تک لوگوں کا کلب یا کسی اور جگہ اکٹھا ہونے کی بات ہے تو اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہمارے ہاں کے حالات میں اس خواہش کو حق‌بجانب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ہمارے ہاں اجتماعی اور ریاستی‌فارموں میں بڑا عملہ ہوتا ہے، ہمارے ہاں کلب اور سینما ہوتے ہیں۔ روستوف میں رہنےوالی لڑکیاں میرا خیال ہے کہ آپ سے زیادہ بار تھیٹر نہیں جاتیں۔ اس لئے وجہ یہ نہیں ہو سکتی۔ گاؤں کی زندگی میں ہیجان کی کیفیت یا نوع‌بنوع تاثرات کی کمی کو کام کی رفتار کی شدت اور اپنی عمر اور خیالات کے لوگوں سے خلط ملط سے پورا ہو جانا چاہیئے۔

زمین کو کام کرنےوالے نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ آجکل سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے مارچ کے مکمل اجلاس کی قراردادوں کی روشنی میں بڑے پیمانے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں، ریاستی فارم کے کارکنوں اور اجتماعی کاشتکاروں کے لئے اچھے امکانات پیدا ہو رہے ہیں، ان کی آمدنی بڑھیگی اور ظاہر ہے یہ ترغیب کا اچھا وسیلہ ہوگی۔ جو لوگ شہر میں خاصا اچھا رہائشی مکان حاصل نہیں کر سکے ہیں اور جتنی خوشحال زندگی وہ بسر کرنا چاہتے ہیں وہ حاصل نہیں کر سکے ہیں، گاؤں میں واپس آنا چاہیں‌گے۔ اس طرح کا الٹا عمل شروع ہو جانے کی مجھے قوی امید ہے۔

آپ کو سمجھنا چاہئے کہ حکومت اور پارٹی ان نوجوانوں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا نہیں کر سکتی جو صنعت میں کام کرنا چاہتے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا آپ کے اختیار میں ہے کہ تاگنروگ میں کام کرنے جائیں یا روستوف یا یہیں ویشنسکایا میں رہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ زمین پر کام کرتے رہنے کے قابل‌تعریف رجحان کے آثار پائے جاتے ہیں۔ تیرنتی سمیونووچ مالتسیف سے، جو یہاں ویشنسکایا آئے تھے، ماسکو کے مضافات میں واقع اربوزوف اسکول کے فارغ التحصیل طلباء نے بات چیت کی۔ آپس میں انہوں نے اتفاق رائے

نئے انسان کے اخلاق اور عوام کی بےپناہ محنت کی فنی پیکروں میں تجسیم ہو، افسانوی ادب کی بڑی، ہمہ گیر تخلیقات میں ان کا مفصل بیان ہو۔ ہم لوگ جو فنون لطیفہ سے تعلق رکھتے ھیں یہ سب باتیں اچھی طرح سمجھتے ھیں اور عوام کے اور پارٹی کے روبرو ھماری جو ذمہ‌داری ھے اس کی وسعت اور وقعت سے بخوبی واقف ھیں۔

آخر میں میں یہ عرض کرنا چاھتا ھوں۔ یہاں جو ڈیلی گیٹ موجود ھیں ان میں بہت سے ایسے ھیں جنہیں پیار سے ''مشعل راہ،، کہتے ھیں۔ یہ بہت اچھا اور مناسب لفظ ھے۔ میں ان سے کہنا چاھتا ھوں کہ وہ یہ بات فراموش نہ کریں کہ وہ صرف اپنے خاص میدان عمل کے لوگوں کی راھیں ھی روشن نہیں کر رھے۔ سائنس، ٹکنیکی علم، صنعت اور زراعت کی ''مشعلیں،، ھم مصنفوں کے لئے بھی روشن ھیں۔ اور ھم ان کی طرف قدرے رشک کے ساتھ دیکھا کرتے ھیں کیونکہ اپنی کوششوں میں ھم نے اب تک وہ حاصل نہیں کیا جسے انہوں نے حاصل کر لیا۔ مگر ان کی روشنی ھمیں بھی مل رھی ھے، ھمیں بھی حرارت پہنچ رھی ھے اور وہ صبح کے دھندلکے میں اندھیرے کو چیر کر چمکتی رھتی ھے۔

جو یہ روشنی پہنچا رھے ھیں ان کا میں تہ‌دل سے شکرگذار ھوں۔

اور ویسا ھی دلی شکریہ ان کا جو ان روشنی برداروں کو توانائی فراھم کرتے ھیں، ان کا بہت بہت شکریہ جو ھمارے لئے گہری فکرمندی کا اظہار کرتے ھیں، جس کے غالباً ھم پوری طرح مستحق نہیں لیکن مجھے یقین ھے کہ ھم آئندہ اس کے مستحق ضرور بن جائیں‌گے۔

۱۹٦۱ء

زمین کو کام کرنےوالے نوجوانوں کی ضرورت ھے

(نوجوانوں سے گفتگو سے اقتباس)

...دیہاتی نوجوانوں کو کسان کے کام سے محبت کرنے اور اس کا احترام کرنے کی تربیت دینی چاھئے کیونکہ یہاں اور دوسری جگہ لوگ بہت سے اسباب کی بنا پر کاشتکاری سے کنارہ کشی اختیار کر رھے ھیں۔ میں بہت سے بیرونی ممالک کا سفر کر چکا ھوں۔ ناروے، سویڈن، ڈینمارک میں بھی یہی کیفیت ھے۔ درحقیقت شہر میں منتقل ھو جانے کی خواھش ھر جگہ بڑھتی نظر آتی ھے۔ فن‌لینڈ

سینما۔ میری تصانیف میں سے فلم کے لئے سب سے زیادہ کامیاب منظرنامہ میرے خیال میں فلم ''مقدر انسان کا'' کے لئے تیار ہوا۔ یہ فلم مشہور و معروف اداکار اور ڈائریکٹر سرگئی بوندارچوک نے بنائی ہے۔ جہاں تک ''اور ڈان بہتا رہا...'' اور ''جب زمین جاگی'' کا تعلق ہے اس میں منظرنامہ لکھنےوالوں اور ڈائریکٹروں نے کچھ غلطیاں کی ہیں۔ مثلاً ''اور ڈان بہتا رہا...'' میں کچھ ایسے اہم واقعات تھے جنہیں شامل کرنا چاہئے تھا مگر چھوڑ دیا گیا۔ اور ایسے حصوں کو شامل کرلیا گیا جنہیں نظرانداز کیا جاسکتا تھا اور ان کی کمی کو فلم میں محسوس بھی نہ کیا جاتا۔ آپ جانتے ہی ہیں فلم کا منظر نامہ سرگئی گیراسیموف نے لکھا تھا۔ اور یہ خالص ان کا اپنا تخلیقی کام تھا۔ میرا خیال ہے کہ اداکاروں کا انتخاب بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔

آجکل مالی تھیٹر ''اور ڈان بہتا رہا...'' کو اسٹیج پر پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ جو تھیٹر ''وطن کے مجاھد'' کا منظرنامہ تھیٹر کے لئے لکھنے کی بات سوچ رہے ہیں وہ میرے خیال میں حد سے زیادہ عجلت سے کام لے رہے ہیں۔ کیونکہ جو ناول ابھی مکمل نہ ہوا ہو اس کی بنیاد پر تمثیلی اعتبار سے کوئی مربوط چیز پیش کرنا بہت ہی مشکل ہے۔

روستوف کا گورکی ڈرامہ تھیٹر میرے افسانے ''رجمنٹ آ رہی ہے'' پر مبنی ایک ڈرامہ کھیلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ بھلا کیسا ڈرامہ ہوا جس میں کوئی عورت ہی نہ ہو؟

ایک صورت حال ایسی پیدا ہو گئی ہے جو میرے ناول ''وطن کے مجاھد'' کی تکمیل میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ میں روستوف میں جرنیل لوکین سے ملا جو اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ ان کی زندگی کے حالات نہایت المناک ہیں۔ زخمی اور بیھوشی کی حالت میں جرمنوں نے ان کو قیدی بنا لیا تھا۔ وہ قابل‌اعتماد، بہادر آدمی اور سچے محب وطن ہیں۔ سابق جرنیل ولاسوف نے جس نے اپنے ملک سے غداری کی تھی، اپنے نازی اعلی افسروں کے حکم پر لوکین کو اپنا جیسا بنانے کی کوشش کی مگر لوکین ثابت قدم رہے۔ انہوں نے مجھے بہت ساری دلچسپ باتیں بتائی ہیں اور میں ان سے اپنے ناول میں استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔

نازی جرمنی پر سوویت عوام کی فتح کی بیسویں سالگرہ آنےوالی

سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ان میں سے جو بھی کوسوسول کے میمبر هیں وہ سب کام کرنے کے لئے اپنے اپنے گاؤں میں رهیں گے۔ انهوں نے بتایا کہ مرکزی کمیٹی کے مارچ کے مکمل اجلاس سے متاثر هوکر یہ فیصلہ کیا گیا۔

یہاں گاؤں میں تفریحی مشغلوں کی کوئی کمی نہیں هے۔ یہ صحیح هے کہ گاؤں میں وہ اتنے نہیں هیں جتنے شہر میں هوتے هیں۔ مگر همارے هاں اگر پوری تھیٹر کمپنیاں نہیں تو ان کی ٹولیاں تو اکثر آتی رهتی اور هماری مہمان کی حیثیت سے اپنے پروگرام پیش کرتی هیں۔ روستوف کی انجمن موسیقی بھی اچھا کام کررهی هے اور جیسا کہ آپ سب جانتے هیں اس کے موسیقار همارے هاں آتے رهتے هیں۔

یہی کیفیت همارے پڑوسی والگاگراد اور وورونیژ کے علاقوں کی هے۔ وورونیژ کے مغنیوں کا طائفہ علاقے کی خدمت بحسن وخوبی انجام دیتا هے۔ والگاگراد کے علاقے میں اوریوپنسک میں اپنا تھیٹر هے۔ یہ چلتا پھرتا تھیٹر هے اور یہ اپنے ضلع کے دورے کا آغاز سال کے شروع میں کرتا هے اور پورے علاقے کا سفر کرنے کے بعد دسمبر کے آس پاس اسے ختم کرتا هے۔

جیسا کہ آپ خود دیکھ سکتے هیں، حالات بدل رهے هیں۔

مثلاً مجھے اپنے بارے میں یہ محسوس نہیں هوتا کہ جیسے میں تہذیب سے دور کہیں الگ تھلگ زندگی بسر کر رها هوں۔ مجھے کم‌ازکم یہ احساس کبھی نہیں هوا۔ (ممکن هے اس کی وجہ میرے کام کی نوعیت هو)۔

مختصر یہ کہ باربار اسی بات پر زور دینا چاهئے: زراعتی مہارت بہت اهم هوتی هے اور اس مہارت کی همارے ملک کو سخت ضرورت هے اور میں سمجھتا هوں کہ یہ فیصلہ آپ خود کریں کہ آپ کو کیا کرنا هے۔

اور اب آئیے هم آرٹ کے مسئلے کو لیں۔

میرا اپنا منصوبہ یہ هے کہ اپنا ناول ''وطن کے مجاهد،، مکمل کرلوں اور اس کے بعد میں تمثیل‌نگاری کی کوشش کرنا چاهتا هوں۔ جب یہ موضوع چھڑ گیا هے تو میں یہ بتانا ضروری سمجھتا هوں کہ اس صنف میں صورت حال اچھی نہیں هے۔ اپنے همعصروں، نوجوان محنت‌کشوں کے متعلق همارے هاں اچھے ڈراموں کی بڑی کمی هے جو همارے نوجوانوں پر تعلیمی اثر ڈال سکتے تھے۔

اسیات الاکووا، ایک طالبہ: کیا ھماری آج کی زندگی میں کارنمایاں انجام دئے جا سکتے ھیں؟

م۔ ا۔ شولوخوف: زندگی بحسن وخوبی اور سماج کے لئے کارآمد طریقے سے بسر کرنا بھی ایک کارنمایاں ھے۔ کوسوسول کا اچھا ممبر ھونا بھی روزمرہ کا کارنمایاں ھے، اگرچہ مانی ھوئی بات ھے کہ چھوٹے پیمانے کا۔ پیارے بچو، سوویت یونین کی قوت صرف جنگ کے کارھائے نمایاں ھی پر مشتمل نہیں ھے۔ کھیتوں میں، اجتماعی فارموں میں، ریاستی فارموں میں، کارخانوں اور کوئلے کی کانوں میں ایماندارانہ کام کو کیا کہا جائیگا؟ ھمارے ملک کی عظمت، معاشی قوت اور نظریاتی طاقت روزمرہ کے لاکھوں، محنت کے ایسے کارھائے نمایاں سے مرتب ھوتی ھے جن میں نظارہ کرنے کے قابل کچھ نہیں ھوتا۔ مجاھدانہ شان‌وشوکت کے اعتبار سے وہ کارھائے نمایاں جو جنگ میں انجام دئے جاتے ھیں زیادہ رعب‌دار معلوم ھوتے ھیں۔ مگر تمہیں میں یہ بتا دینا چاھتا ھوں کہ جنگوں نے کبھی کچھ تخلیق نہیں کیا۔ جنگ وہ قوت ھوتی ھے جو تباہ کرتی ھے۔ اور کام تعمیری کارنامہ ھوتا ھے۔ اگر مزدوروں، کسانوں اور دانشوروں کی بہادرانہ کوششیں شامل حال نہ ھوتیں تو حب‌الوطنی کی جنگ‌عظیم کے چھوڑے ھوئے بہت سے کھنڈر اب بھی باقی ھوتے۔

اچھی طرح پڑھنا بھی ایک کارنمایاں ھے۔

بوڑھے لوگوں کو یہ کہنے کا بڑا شوق ھوا کرتا ھے کہ ان کے زمانے میں ھر چیز بہتر تھی۔ ان کی ھر بات پر ایمان لے آنا تو ٹھیک نہیں ھے مگر ان کی بعض باتوں سے اتفاق کئے بغیر نہیں رھا جا سکتا۔ میں سمجھتا ھوں کہ پرانی پیڑھی کے اپنے پیمانے اور اپنے معیار ھوا کرتے تھے۔ اب جہاں تک میرا تعلق ھے مجھے نئی وضع کے جھاڑجھنکاڑ بال رکھنے اور بال بنانے کے طرز پر کوئی اعتراض نہیں ھے جو ایسا لگتا ھے جیسے کہ پھوس کے چھوٹے چھوٹے ڈھیر ھوں۔ بنیادی طور پر ھمارے نوجوان اچھے لوگ ھیں۔ اسیات الاکووا نے ابھی مجھ سے کارھائے نمایاں کے متعلق سوال کیا ھے۔ یہ اھم بات ھے، بال بنانے کا طرز اھم نہیں ھے۔ میرے زمانے میں، خانہ‌جنگی کے دنوں میں ھمارے نوجوان بہادر ھوا کرتے تھے۔ اگر شدید آزمائش کا وقت آیا تو ھمارے نوجوان پھر بہادری کے ثبوت دیں‌گے۔ لیکن ھمارے نوجوانوں میں ایسے لوگ ھیں جو مغربی پروپیگنڈے کے اثر

ھے - اس موقع پر اخباروں میں جنگ کے متعلق بہت سے مضامین کہانیاں اور دوسری چیزیں شائع ہو رہی ہیں - ہمارے نوجوانوں کا فرض ھے کہ وہ حب‌الوطنی کی جنگ عظیم میں کام آنےوالوں کی یادگاروں اور قبروں کی اعزازی سرپرستی کی ذمہ‌داری قبول کر لیں -

نوجوانوں کی تعلیم سب سے اھم فریضہ ھے - کام کرنے کی عادت بچپن ھی سے ڈالنی چاھئے - جب میں جرمن جمہوری ری‌پبلک گیا تھا تو یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ وھاں لوگ کس طرح کام کرتے ھیں - میں نے ایک کنبے — ماں، دادی اور کوئی نو سال کے ایک لڑکے کو چقندر کے کھیت کی نلائی کرتے دیکھا تھا - سچ مچ وہ گھٹنوں کے بل چل رھے تھے تاکہ گھاس پھوس کے ایک ایک پودے کو اکھاڑ پھینکیں - ھمارے ھاں بعض اوقات نوجوانوں سے کام لینا بھی ایک کام بن جاتا ھے - کومسومول کو اپنی سرگرمیوں کا رخ اسی طرف موڑ دینا چاھئے - کنبے میں اور اسکول میں تعلیم کی کارگذاری بڑھانی چاھئے تاکہ آجکل کے مطالبات پورے کئے جا سکیں...

۱۹۶۵ء

محب وطن ھر آن رھو
(داغستانی طالبات سے گفتگو)

۱ - م - سردوزلیئوا، ایک اقامتی مدرسے کی صدر معلمہ: بہت سی داغستانی عورتیں عوامی تنظیموں میں کام کرتی ھیں - ان میں اسکول کی استانیاں، سائنسداں اور دوسری ماھرین شامل ھوتی ھیں - پھر بھی صدیوں پرانے تعصبات پر عبور پوری طرح حاصل نہیں کیا جا سکتا - وہ بہت ھی مشکل سے ختم ھوتے ھیں...

م - ا - شولوخوف: واقعی یہ اب بھی ایک دشوار مسئلہ ھے، حالانکہ ملک کا عام تہذیبی ارتقا تیز رفتاری سے ھو رھا ھے - مگر اس کا خاموش تماشائی نہیں بنا جا سکتا - یا اس سے بھی بدتر یہ کہ پسماندہ رجحانات کو سر اٹھانے کا موقع دیا جائے - آپ کو اس کے خلاف نفاست اور ھوشیاری کے ساتھ، مذھب کے خلاف تصورات کی تبلیغ کرکے، لوگوں کو یہ سمجھنے میں مدد دےکر کہ کیا غلط ھے کیا درست، جہاد کرنا چاھئے -

وفاداری کو عملی جامہ پہنائیگا اور اپنے اس غیرمتزلزل اعتقاد کو بھی کہ کمیونزم کے تصورات سے زیادہ دانشمندانہ، زیادہ انوکھا اور زیادہ انسان دوستانہ کچھ اور نہیں ہے۔

۱۹۶۵ء

سوویت مصنفوں کی چوتھی کانگرس میں تقریر

پیارے ڈیلی گیٹ ساتھیو! ہمارے معزز مہمانو!

اس کانگرس کے ابتدائی چند دنوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں چین ہی چین ہے: کوئی کڑی نکتہ‌چینی نہیں ہوئی، ہر جگہ اطمینان و سکون کا دور دورہ ہے، صلح صفائی کا پہرہ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ایک سکھ چین سے سانس لے رہا ہے اور عام فضا اس قدر پرسکون ہے کہ بعض حاضرین پر غنودگی کی کیفیت طاری ہو گئی ہے...

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انجمن مصنفین کے رہنماؤں نے اس کانگرس کی تیاری میں بڑی محنت سے کام کیا ہے جس کے لئے وہ قدرتی طور پر ہمارے شکرئے اور ہماری مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ پچھلی کانگرسوں میں حالات مختلف تھے: اپنی تقریروں میں قلم کے سپاہیوں نے تلواریں بےنیام کر لی تھیں، زرہ‌بکتر کی جھنکار تھی، اپنے جوش‌جہاد میں ہم نے ایک دوسرے کو ذرا بھی نہ بخشا تھا اور جب میدان کارزار سے نکلے تو گومڑوں کو سہلاتے اور زخموں سے تلملاتے آئے تھے، کیونکہ ”پرانے زمانے میں،، ہمارے ہاں ستائش کی قلت تھی اور نازبرداریوں میں کیک اور مٹھائی کھلانے میں کنجوسی برتی جاتی تھی — بہرحال اتنی فراخدلی سے باتیں نہیں ہوتی تھیں جو مارکوف اور دودین نے موجودہ کانگرس میں ہم کو عطا کی ہیں۔ ٹکریں ضرور ہم نے ایک دوسرے کو بڑے دھیان سے ماریں۔ اور بعض اوقات بجا طور پر۔

میں خود اکثر اکھاڑے میں کودا، مارا بھی اور پٹا بھی۔ لیکن میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ سوچنے لگ جائیں کہ مجھے افسوس ہے کہ وہ طوفانی کانگرسیں اب سوائے یاد کے اور کچھ نہیں رہ گئیں اور یہ کہ میں اب پھر میدان میں کود پڑنے کو بےچین ہوں۔ اس کے برعکس اس پرسکون فضا میں مجھے چین آتا ہے کیونکہ آپ سب کی طرح میں بھی امن

کا شکار ہو جاتے ھیں۔ غیرملکی نظریات‌داں چاھتے ھیں کہ تذبذب اور بےاعتنائی کے بیج بو دیں۔ لیکن آپ جانتے ھیں کہ ھمارے ملک کے مستقبل کے لئے اور پرانی نسلوں نے جو کچھ حاصل کیا ھے اس کے لئے جواب‌دہ تم ھی کو ھونا پڑےگا۔

ھم اچھی طرح جانتے ھیں کہ ''لاوارث،، نوجوان جیسی کوئی چیز نہیں ھے۔ اور ھمارا جی تو ھرگز نہیں چاھتا کہ تم جیسی اچھی لڑکیوں اور لڑکوں کو غیروں کے غلیظ ھاتھوں میں چلا جانے دیں۔ سرمایہ‌داری کے اثر کے خلاف ھم عملی جدوجہد کر رھے ھیں۔ خراب فلموں سے جو ھمارے ھاں کے فلمی پردوں تک پہنچ جاتی ھیں اور ضرررساں کتابوں سے جو کسی نامعلوم سبب سے ھمارے اشاعت گھر چھاپا کرتے ھیں بورژوا نظریات‌داں تمہیں بےراہ کرنے کی کوشش کر رھے ھیں۔ ھم سوویت مصنفین اپنے نوجوانوں کی، زندگی اور آرٹ کے اپنے نظریات اور اپنے کمیونسٹ خیالات کے مطابق تربیت دینے کی کوشش کر رھے ھیں۔

اسکول چاھے ماخچ کلا میں ھو، پسچانوو کپسکوئے میں، ویشنسکایا میں یا کہیں اور، طالب‌علموں کو ھمہ‌گیر تعلیم ملنی چاھئے: اس میں سینما، تھیٹر اور ادب جیسے اثرات شامل ھیں جو اخلاق و عادات کی تشکیل کرتے ھیں اور ظاھر ھے کہ جو چیز سب سے اھم ھے یعنی تعلیم، اس کے مضامین بھی ھوتے ھیں۔

ھماری وسیع و بسیط سرزمین کو ایسے لوگوں کی ضرورت ھے جو دانشمند، جفاکش اور کفایت‌شعار باکمال ھوں۔ ھمارے لاکھوں بہترین لوگ خانہ‌جنگی اور حب‌الوطنی کی جنگ‌عظیم میں کام آئے تاکہ امن اور سلامتی کی اس فضا میں تم زندگی بسر کر سکو جہاں تمہارے سروں پر بمبار ھوائی جہاز نہ گھڑگھڑا رھے ھوں تاکہ ھم زندگی اور معیشت کے اپنے مسئلے اور اپنے مستقبل کے بلکہ تمہارے مستقبل کے مسئلوں پر بحث کر سکیں۔ سوویت اقتدار کی نعمتیں بڑے مہنگے مول حاصل کی گئی ھیں۔ اور یہی وجہ ھے کہ ھمیں تم کو اس قسم کے لوگوں کے سانچے میں ڈھالنا ھے جو ھماری سرزمین کی بےحساب روحانی اور مادی دولت سمیت ملکیت کی ذمہ‌داری قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ھوں۔

لوگوں میں حب‌الوطنی بچپن ھی سے، کنڈرگارٹن کی عمر سے پیدا کرنی چاھئے۔ پھر وہ آدمی کی ذھنیت میں رچ جائیگی، وہ کسی بھی آزمائش کا بےخوف ھوکر مقابلہ کریگا اور اپنے ملک اور پارٹی سے اپنی

کی غیرموجودگی سے انتہائی پریشانی ہے۔ میں ڈھونڈتا ہوں، چاروں طرف تلاش کرتا پھرتا ہوں مگر ایلیا گریگوریئےوچ کہیں نظر نہیں آتے، وہ موجود ہی نہیں ہیں، اور اس سے مجھے ایک طرح کی بےچینی ہو جاتی ہے، جیسے کہ کوئی چیز ہونی چاہئے اور وہ نہ ہو، جیسے معدے میں کربناک درد ہو رہا ہو اور میری طبیعت اگرچہ ویسے بہت خوش تھی مگر اب افسردگی کا ایک تاریک سایہ اس پر پڑنے لگتا ہے۔ اھرن‌برگ کہاں ہیں؟ پتہ یہ چلتا ہے کہ کانگرس شروع ہونے سے کچھ ہی روز پہلے وہ ساحل اطالیہ کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔ بڑی عجیب بات ہے۔

کسی بھی کارخانے کے دستکاروں کو نہ صرف اپنا پیشہ‌ورانہ وقار کا، اپنے کارخانے کے وقار کا پاس ہوتا ہے بلکہ ان کو اپنے انسانی وقار کا بھی پاس ہوا کرتا ہے۔ ایلیا گریگوریئےوچ کو ہم سب کی توھین نہیں کرنی چاہئے تھی۔ جماعت کے اندر کسی کو اپنے آپ کو دوسروں پر سبقت نہیں دینی چاہئے اور چڑچڑی ساس کی طرح برتاؤ نہ کرنا چاہئے: ''میں گھر کی مالکہ ہوں، مجھے کوئی ناراض نہیں کر سکتا!،،

اس سب کے بارے میں ایک اور افسوسناک بات یہ ہے کہ بری روایت کی تقلید کی جا رہی ہے اور اھرن‌برگ نے پبلک زندگی کے معمولات کی جو خلاف‌ورزی کی ہے اس‌سے شہ پاکر ہمارے معمر نوجوانوں نے ایسی اچھل کود شروع کر دی ہے کہ جب وہ واقعی بڑے ہو جائیں‌گے تو اسے یاد کر کرکے شرمندہ ہوا کریں‌گے۔

اگر نوجوانوں کے بارے میں باتیں کریں تو اپنے ماضی کو یاد کرنے کے بعد آئیے ہم یہ دیکھیں کہ مستقبل کیا امیدیں دلاتا ہے۔

سنہ تیس کی دھائی کے شروع میں فادیئف نے وسطی روس کے ایک چھوٹے سے قصبے کے دورے سے لوٹ کر مجھے ایک واقعہ سنایا تھا جو آپ بھی سنئے۔ انہوں نے مجھے بتایا: ''وھاں ایک قدیم خانقاہ تھی جسے میں دیکھنا چاہتا تھا۔ خیر تو میں وھاں گیا اور سب کچھ اچھی طرح دیکھا۔ اس خانقاہ کے ایک بہت ہی پرانے، کھنڈر گرجے میں اب بھی عبادت باقاعدہ ہوتی تھی۔ شہر واپس لوٹتے ہوئے میں نے دیکھا کہ خانقاہ کا حصار بنانےوالی خندق کی ڈھلان پر بہت سارے بچے غل مچا مچاکر کھیل رہے ہیں اور کچھ دور ہی ایک بچہ بالکل اکیلا کھڑا حسرت سے انہیں دیکھ رہا ہے مگر ان کے قریب جانے کی جرأت نہیں کر رہا بلکہ مرجھائی ہوئی گھاس کھینچ کھینچ کر اکھاڑ کے اور اپنی ایڑی سے زمین پر نشان بنا بناکر اپنا جی بہلانے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں

کا اور پراسن بقائے باهم کا حامی هوں، سوویت انجمن مصنفین کے حدود کے اندر بھی اور اس کے باهر بھی۔

سوویت حکومت کے قیام کی پچاسویں سالگرہ کے سال میں منعقد هونےوالی کانگرس همارے لئے بھی نتائج اخذ کرنے کا ایک طرح کا موقع هے۔ اور قدرتی بات هے کہ بیشتر مقررین نے بلاارادہ سابقہ کامیابیوں کا ذکر کیا۔

لیکن همیں یہ مشرقی دانشمندانہ قول کبھی فراموش نہ کرنا چاهئے: ''جب راہ چلو تو بار بار پیچھے نہ مڑکر آگے دیکھو ورنہ ٹھوکر کھاؤگے،،۔ همیں مستقبل کے بارے میں سوچنا چاهئے تاکہ زیادہ ٹھوکریں نہ کھائیں۔

مجھے خوشی هے کہ اس کانگرس کی فضا پرسکون اور کاروباری وضع کی هے۔ لیکن ساتھ هی ساتھ مجھے قدرے پریشانی بھی هے کہ انجمن کے قائدین کھلےبندوں یہ کوشش کر رهے هیں کہ بہر قیمت پیچیدگیوں سے بچ سکیں۔ یہ کسی طرح جائز معلوم نہیں هوتا۔ کانگرس کا اختتام تو بخیروعافیت هو جائیگا لیکن همارا اجتماع بہرحال سات سال سے نہیں هوا تھا اور خالص ادبی مسائل اور فرائض کے علاوہ بھی بہت سی باتیں کرنی هیں۔

میں انجمن کے کھیونهاروں میں سے نہیں هوں اور چونکہ عام صفوں کا ایک مصنف هوں جسے یہ نہیں معلوم کہ هدایات کیسے جاری کی جائیں اس لئے میں بعض ایسے مسائل چھیڑنے کی آپ کی اجازت کا خواستگار هوں جن کے لئے میرا خیال هے کہ فکرمند میں اکیلا هی نہیں هوں۔

شروع میں چند الفاظ اس کانگرس کے بارے میں۔ هم سب کو بڑی خوشی هے کہ مہمانوں میں همارے عزیز دوست دکھائی دے رهے هیں جنھوں نے تشریف لاکر اور کارروائی میں دلچسپی لےکر اس کانگرس کو اعزاز بخشا هے۔ یاروسلاف ایواشکیویچ، آننا سیگھرس، گیورگی جگاروف اور سوشلسٹ ملکوں کے دوسرے ادیب بھائیوں اور بہنوں سے ملکر اور پابلو نیرودا، چارلس اسنو، پامیلا جانسن، آرتھر لندکوسٹ اور ماریا وائن جیسے بڑے بڑے مصنفوں، اپنے اچھے پڑوسیوں اور دوستوں سارتی لارنی اور وائنے لند، ماریا تیریسہ لیئون اور تمام محترم غیرملکی دوستوں کی قربت کے احساس سے اطمینان هوتا هے۔

مجھے معلوم نہیں کہ دوسرے ڈیلیگیٹوں کو کیسا لگ رها هے لیکن خود مجھے اپنے پیارے اور پرانے دوست ایلیا گریگوریئےوچ اهرنبرگ

مجھے کہنا پڑتا ہے کہ یہ نوجوان بھی قصوروار ہیں، مثلاً فرانڈے جیسا رویہ اختیار کرنا اور رکھ‌رکھاؤ کے مسلمہ معمولات کو تسلیم کرنے سے انکار کرنا۔ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جو ان کے ضمیر پر بوجھ بنی ہوئی ہیں۔ مگر ہمیں چاہئے کہ یہ ان کی نوجوانی پر محمول کریں اور اب ان کو سزاوار نہ ٹھیرائیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم ان سے زیادہ سخت مطالبے کرنے لگیں‌گے۔

بحیثیت مجموئی نوجوان ادیبوں کا ذکر کریں تو وہ ہماری جگہ بحسن‌و خوبی لے سکتے ہیں اور یہ بات مجھے زیرلب کہنے کی ضرورت نہیں۔ سب سے زیادہ مسرت‌بخش حقیقت بہت بڑی تعداد میں ان بہت ہی نوجوان لوگوں کا ابھرکر سامنے آنا ہے جن میں خداداد صلاحیتیں موجود ہیں۔ یہ ان لڑکوں کی طرح ہیں جن کی آواز ابھی پختہ ہونی شروع ہوئی ہو۔ چنانچہ عین ممکن ہے کہ کبھی کبھار نوخیز مرغے کی طرح آواز بےسری نکلے۔ یہ لڑکے ہماری اصل دولت ہیں اور جوش‌وخروش اور جائز فخر کئے بغیر ان کا ذکر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ قابل‌تعریف بات ہے، واقعی قابل تعریف ہے کہ ہماری زرخیز سرزمین اتنے بہت سارے ارباب‌ہنر پیدا کر رہی ہے!

لیکن یہ غور و فکر کا مقام بھی ہے اور مستقبل میں جھانک‌کر دیکھ لینا بھی سودمند ہوگا۔ میں کچھ اعدادوشمار پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے سخت فکر لاحق ہوتی ہے۔

مصنفوں کی پہلی کانگرس میں ۷۱ فیصدی ڈیلی گیٹ چالیس برس سے کم عمر کے تھے۔ دوسری میں فی‌صد تناسب گھٹ‌کر ۲۰.۶ رہ گیا، تیسری میں ۹.۳۱ اور موجودہ کانگرس میں یہ ۱۲.۲ ہے۔ میرے مصنف بھائیو، ہم بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ وقت اب آن پہنچا ہے کہ کانگرسوں اور انجمن مصنفین کا انتظام سنبھالنےوالے اداروں اور حلقوں کی سرگرمیوں میں جرأت کے ساتھ نوجوان کو کھینچ کر لائیں۔ اب جو کیفیت ہے وہ فوج کے انتظام جیسی ہے جہاں ترقیوں کی رفتار اتنی سست ہوتی ہے کہ جرنیل کے عہدے تک پہنچتے پہنچتے آدمی کی شکل ایسی ہو جاتی ہے کہ وہ بری طرح کرم‌خوردہ سا نظر آنے لگتا ہے۔ سفید بال قابل احترام یقیناً ہوتے ہیں لیکن قیادت کا حقدار بنانے کی ایک یہی چیز تو نہیں ہو سکتی یا ہو سکتی ہے؟ اس کانگرس میں ڈیلی گیٹوں کی اوسط عمر قریب قریب ساٹھ ہے۔ کیا یہ افسوسناک صورت حال نہیں ہے؟ یہ کیفیت ہماری آج کی ہے لیکن ایک اچھا صاحب‌خانہ آنےوالے کل کی فکر

سوچنے لگا کہ بیچارے کو کسی وجہ سے کھیل سے سب نے نکال دیا ہے۔ میں اس کے پاس گیا اور پوچھا: 'تم یہاں اکیلے کیوں کھڑے ہو؟ اوروں کے ساتھ ملکر کیوں نہیں کھیلتے؟ کیا کیا ہے تم نے؟'، اس نے نگاہ اٹھاکر میری طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں مجھے بڑوں کا سا کرب نظر آیا۔ اس نے مجھے بتایا: 'میرے ابا پادری ہیں۔ یہیں کے گرجے میں وہ پادری ہیں۔ اسی لئے لڑکے مجھے اپنے ساتھ کھیل میں شامل نہیں ہونے دیتے اور مجھکو اکیلے ہی کھیلنا پڑتا ہے۔'،،
مجھے یاد ہے کہ فادیئف ایکدم خاموش ہو گئے تھے اور پھر انھوں نے عجیب سے تیز لہجے میں کہا تھا: ''اور تمہیں معلوم ہے، میں رو دیا تھا، میں نے منہ پھیر لیا تھا اور آنسو جاری ہو گئے تھے۔ کتنی خوفناک بات ہے کسی کے بچپن کا ایسا ہونا!،، قصے کا اختتام انھوں نے اسی طرح کیا تھا جیسے کہ ان سے توقع کرنی چاہئے تھی: ''مگر، بھائی میرے، تم تو جانتے ہو سارے پاجی قدرے جذباتی ہوا کرتے ہیں۔،،

ہمارے ''ٹیڑھے،، نوجوان مصنفین مجھے پادری کے خورد سال لڑکے کے متعلق سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں: وہ اکیلے ہی کھیلتے رہتے ہیں، ان میں رفاقت کا جذبہ ہی نہیں ہے، اور ہم بوڑھے ''جذباتی پاجیوں،، کو ترس تک نہیں آتا، رونا نہیں آتا اور ہم ان سے حقیقی تعلق قائم کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ ہمارا برتاؤ تو ان سے وہی ہوتا ہے جو بوڑھے سارجنٹ کا اپنے رنگروٹوں سے ہوا کرتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب ہمیں اس وتیرے کو ترک کر دینا چاہئے، کسی کو صدقے کا بکرا بنانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔ ہمیں ایمانداری سے تسلیم کر لینا چاہئے کہ نوجوان ادیبوں کے ایک صدقے سے اپنے موجودہ خلاف‌معمول تعلقات کا الزام ہم پر عائد ہوتا ہے — کومسومول اور انجمن مصنفین کی قیادت اور ہم معمر ادیب اس کے ذمہ‌دار ہیں۔ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ اس الزام سے خود کو میں سبکدوش نہیں کر سکتا، نہیں کرنا چاہتا۔ چنانچہ اگر ہم صاف صاف مان لیں تو اصلیت یہی ہے۔ نوجوان مغرور اور زود رنج ہوا کرتے ہیں۔ تو پھر اگر ہم ایک حد تک خود کو قصوروار تسلیم کرتے ہیں تو مصالحت کی جانب پہلا قدم ہمیں اٹھانا چاہئے۔ ہماری کوئی ہیٹی نہیں ہوگی اور میرا خیال ہے کہ یہی سب سے زیادہ دانشمندانہ بلکہ سب سے دوراندیشانہ اقدام ہوگا۔

هیں، اور اس نے جس چیز کے حق میں جہاد کیا ہے اور جو کچھ حاصل کیا ہے وہ ہمارے لئے بےانتہا بیش‌بہا ہے۔

میں آخر میں چند الفاظ مستقبل کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں۔ کانستنتین فیدین نے ناول کے بارے میں جو کہا ہے کہ نثر کی یہ واحد صنف ہے جس میں ہمارے سماج میں رونما ہونےوالی تمام سماجی تبدیلیوں کا احاطہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے، تو میں اس سے پوری طرح متفق ہوں۔ ناول مصنف کو موقع دیتا ہے کہ وہ ایک بڑا پردہ کھولے اور عوام کی ذہنیت اور نقطۂنظر میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں ان کا عکس پیش کرے اور اپنے بنیادی کرداروں کی زندگی کے برسوں کے واقعات کی تفصیل پیش کرے۔

وقت آ گیا ہے کہ ہمارے مشہور و ماہر افسانہ نگار بڑے بڑے پردوں پر تصویرکشی کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ افسانوی ادب کی بڑی بڑی تخلیقات کی ان میں صلاحیت و جوہر بدرجہ اتم موجود ہے جو ہمارے ادب کو اور بھی مالامال کر دیں‌گے۔

گورکی کی پیشقدمی پر ہم مختلف کارخانوں اور فیکٹریوں کی تاریخ شائع کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اجتماعی فارموں اور ریاستی فارموں کی تاریخوں کی تصنیف میں مصنفین مصروف ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ کتابیں ناولوں کا بدل نہیں ہیں۔ لیکن ان کو ایک رزمیہ ناول کی بنیاد ضرور بنایا جا سکتا ہے۔ اور ماخذ کی حیثیت سے وہ کسی بھی مصنف کو بےحساب مدد دے سکتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ ہمارے ارادوں اور ہماری صلاحیتوں کے درمیان کوئی عدم‌توازن نہیں ہے۔ اور جشن سالگرہ کا زمانہ ختم ہو جانے کے بعد بھی ہمیں اتنی ہی محنت سے کام کرنا ہوگا۔ مجھے پکا یقین ہے کہ سوویت ادب اپنے ملک کو اور دنیا کو بہت سے نئے دلچسپ اور دلنشین ناول پیش کرےگا۔ اس کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لئے ہمارے پاس تمام امکانات اور صلاحیتیں موجود ہیں۔

میں دل کی گہرائیوں سے دعا کرتا ہوں کہ جستجو اور تلاش میں آپ سب کے حوصلے بلند رہیں اور تخلیقی کاوشوں میں کامیابی آپ کے قدم چومے۔

۱۹٦۷ء

کیا کرتا ہے اور ہمیں اپنے آپ کو ایک اچھا صاحب‌خانہ تصور کرنے کا حق پہنچتا ہے اور ہم ایسے نہیں ہیں کہ اپنے گھر کو خاک ہوتے دیکھیں۔

چنانچہ، جیسا کہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں، نوجوانوں کو ترقی دینا فوری مسئلہ بن چکا ہے جسے ملتوی نہیں کیا جا سکتا اور جس کے متعلق فیصلہ فوراً کرنا چاہئے۔

کچھ عرصے سے مغرب میں شورغوغا بلند ہو رہا ہے کہ ہم سوویت مصنفوں کو تخلیقی ''آزادی،، ملنی چاہیئے۔

۱۹۲۱ء میں میاسنیکوف کو جواب دیتے ہوئے جن کی تجویز یہ تھی کہ سب کو جن میں شاہی‌پسندوں سے لیکر نراجیوں تک شامل ہوں، آزادئی تحریر دی جائے، لینن نے لکھا تھا:

''بہت اچھا! لیکن ذرا ٹھہریئے: ہر مارکسی اور ہر مزدور ہمارے انقلاب کے چار سال کے تجربے پر غور و خوض کرنے کے بعد کہیگا: 'آئیے اس کے بارے میں تحقیق تو کر لیں — کس قسم کی آزادئی تحریر؟ کس غرض سے؟ کس طبقے کے لئے؟'،،

مارکسی اور مزدور، انقلاب کے پچاس برس کا تجربہ حاصل کرنے کے بعد ان لوگوں کے اصرار پر جو قطعی ''آزادئی،، تحریر کے خواب دیکھ رہے ہیں، اب کیا کہیں‌گے؟

دنیا تشویش اور خطرے میں مبتلا ہے۔ اور یہاں کوئی مطالبہ کرتا ہے کہ سب کو — شاہی‌پسندوں سے لیکر نراجیوں تک کو — آزادیٔ‌تحریر حاصل ہو۔ یہ کیا ہے — خالص بھولپن یا نری ڈھٹائی؟

یہ ''آزادی،، باز ہمارے نوجوانوں کو بےراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ حضرات، آپ فضول کوشش کر رہے ہیں! آپ کے ساتھ نہ ''ٹیڑھے،، نوجوان مصنف آئیں‌گے اور نہ ''سیدھے،،۔ ہماری مادر وطن کی خوشیوں اور غم میں وہ شریک ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں‌گے۔ اور ہم ایک کو بھی آپ کے حوالے نہیں کریں‌گے۔

حب‌الوطنی کی جنگ‌عظیم میں مصنفوں کے کام کی یہاں تعریفیں کی گئی ہیں۔ کوئی بات تو ہے جس کی وجہ سے سوویت فوج کا سیاسی انتظامی محکمہ ہمیں اولین محفوظ دستوں میں شامل کئے ہوئے ہے۔ اگر ہمارے ملک کو خطرہ لاحق ہوا تو ہم پھر سے اپنی وردیاں پہن لیں‌گے اور بوڑھے اور نوجوان، ''ٹیڑھے،، اور ''سیدھے،، سب خود اپنی سوویت فوج کی صفوں میں شامل ہو جائیں‌گے۔ وجہ یہ کہ ہم اپنے عوام کا گوشت‌وپوست

آجکل ہم سب پر کامریڈ بریژنیف کی تقریر کا اثر چھایا ہوا ہے۔ اس میں دل ہلا دینےوالے جو حقائق، اعدادوشمار اور نتائج پیش کئے گئے ہیں وہ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ مثلاً فی کس زیرکاشت زمین کے عدد ہی کو لیجئے۔ اپنی سادہ‌لوحی میں ہم میں سے اکثر و بیشتر کا خیال تھا کہ زمین کے اعتبار سے ہم بےانتہا مالدار ہیں اور درحقیقت پتہ یہ چلا کہ ہم کچھ زیادہ خوش‌حال نہیں...

یہ ان مسئلوں میں سے ایک ہے جنہیں سب پر سبقت دینی چاہئے کیونکہ اس کا تعلق صرف اجتماعی کاشتکاروں سے نہیں بلکہ ہم سب سے، سوویت یونین کے باشندوں سے، موجودہ اور آئندہ نسلوں سے ہے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ زمین اسی طرح ناقابل تقسیم ہے جس طرح کہ دنیا اور جہاں ہم اپنی مزروعہ زمین کو، اس زمین کو جو ہمیں غذا فراہم کرتی ہے پیار اور احتیاط سے برتتے ہیں وہاں ہم سب پر یہ بھی لازم ہے کہ باقی زمین کو بھی جس پر ہم رہتے اور کام کرتے ہیں، خوشیاں مناتے اور صدمے اٹھاتے ہیں اور انسان کی بھلائی کے لئے اس پر جو کچھ موجود ہے اس کو بھی اسی محبت اور احتیاط سے برتیں۔ میری مراد جنگلوں اور دریاؤں اور ان کے باسیوں سے ہے۔ ان مسائل کی جانب اپنے رویے پر ہمیں بار بار پھر سے غور کرنا چاہئے اور فوری فیصلے کرنے چاہئیں اور جہاں ضرورت ہو وہاں سخت اقدامات کرنے چاہئیں تاکہ قدرت نے ہماری فلاح‌وبہبود کا جو سامان فراہم کیا ہے اس کو محفوظ رکھ سکیں۔ لیونِد ایلیچ بریژنیف کی تقریر میں ہم نے جو مدھم مدھم سخت تنبیہ سنی ہے وہ نہایت بروقت ہے۔ اور اس تنبیہ پر آپ جیسے کفایت‌شعار صاحب‌خانہ کے لئے کان دھرنا بھی مفید ہوگا۔

ڈیلی گیٹوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ان میں سے بہت سے اپنی فوری اہمیت کے اعتبار سے ولولہ انگیز ہیں۔ اور ہونا بھی یہی چاہئے کیونکہ ڈیلی گیٹ کفایت شعار آقائے زمین ہیں اور وہ ہمارے عظیم‌الشان سماج کے آئندہ ارتقاء کے امکانات کا خاکہ تیار کر رہے ہیں۔

اجتماعی فارم کی تحریک کے پرانے تجربہ‌کار لوگوں کے بارے میں اس منبر پر سے بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اسے میری گستاخی پر محمول نہ کیجئے مگر میں اپنے آپ کو بھی ان پرانے تجربہ‌کار لوگوں میں شامل کرتا ہوں کیونکہ اجتماعی فارم کے نظام کی پیدائش اور استحکام کا شاہد بھی تھا۔ اور آج جب کئی نسلوں کی نمائندگی کرنےوالے سوویت کسانوں کے جوہر کو میں یہاں اس ہال میں یکجا پاتا ہوں تو میں فخر

ایسے شاندار لوگوں کے ساتھ زندگی بسر کرنا کتنی خوش‌نصیبی ہے !

(اجتماعی کاشتکاروں کی تیسری کل یونینی کانگرس میں تقریر)

ساتھیو !

مجھے خوشی اور فخر ہے کہ آپ کی کانگرس کے اس زبردست اہمیت کے موقع پر جو صرف اجتماعی کاشتکاروں کے لئے ہی نہیں بلکہ ہم سب کے لئے، پورے ملک کے لئے اہم ہے آپ کو تسلیمات عرض کروں۔

پچھلے چالیس سال میں بڑے بڑے واقعات رونما ہو چکے ہیں، اجتماعی فارم کے گاؤں کی زندگی کی ظاہری شکل و صورت بہت بدل گئی ہے، اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ خود اجتماعی کاشتکاروں کی ذہنیت میں تبدیلی آ گئی ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا عام طور پر سب کو علم ہے اور آج میں تقریر اس کے بارے میں نہیں کروں گا۔

برسوں پہلے آغاز کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہوئے بار بار یہی خیال آنے لگتا ہے : کتنی حیرت‌انگیز دوراندیش ہوگی وہ ہستی جس کا جشن صدسالہ ہم عنقریب منانےوالے ہیں اور جس نے ہمارے ملک کے ارتقا کی راہیں متعین کی تھیں، اور جو نقشہ بنایا گیا تھا اس کی تکمیل کے لئے ہماری پارٹی میں کتنی حیرت‌انگیز قوت ارادی اور طاقت رہی ہوگی اور ملک کو صنعتی اعتبار سے ترقی دینے کے ساتھ ساتھ اجتماعی فارم کا نظام قائم کرنے میں کتنی جرأت کا مظاہرہ کرنا پڑا ہوگا!

دور افق میں ایک بڑی جنگ کی بجلیاں چمکنی شروع ہو گئی تھیں اور جب جنگ واقعی شروع ہو گئی تو اجتماعی فارم فوج کے لئے، مزدور طبقے کے لئے اور بحیثیت مجموعی پورے ملک کے لئے رسد فراہم کرنے کے قابل ہو چکے تھے۔ ست نچوڑ لینےوالی جنگ کے چار برسوں نے ہمیں پیٹ پر پتھر باندھ لینے کو مجبور کیا، مگر ہم ڈٹے رہے اور جیت کر ہی دم لیا اور سمندر پار کے چچا کے سامنے روٹی کے لئے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

اس کی یاددہانی ہم بہت کیا کرتے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اجتماعی کاشتکاروں کا ایک بار زیادہ شکریہ ادا کرنا چاہئے ہی چاہئے، اور ان کے سامنے ایک بار زیادہ جھک جانے سے کسی کی کمر ٹوٹ نہیں جائیگی۔

کتنا خوش قسمت ہوں کہ زندگی میں ایسے جلیل القدر لوگوں کا ہم‌سفر ہوں!

ایسے قوی ہیکل لوگوں، ایسی طاقتور پارٹی کا ساتھ ہو تو پورے کے پورے پہاڑ کھسکائے جا سکتے ہیں! اور جب ضرورت ہوتی ہے تو واقعی ہم پہاڑوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔

پہاڑوں کا کھسکانا تو کیا، ہم خود شیطان کے سینگ مروڑ ڈالتے ہیں۔ اور ۱۹۴۵ء میں ہم نے اس کے سینگ توڑ ہی ڈالے۔ اگر نئے سینگ نکل آئے تو ہم ان کو پھر توڑ دیں گے۔ یہ نیک کام انجام دینے کی ہم میں قوت بھی ہے اور صلاحیت بھی۔

جلد ہی یہ کانگرس ختم ہو جائے گی۔ وقت رخصت میری دعا ہے کہ عظیم، کثیر قومی سوویت دیس کی شان دوبالا کرنے کے لئے آپ بڑی بڑی کامیابیاں حاصل کریں۔

لینن کی مادر وطن کی جس پر اس کے ہم جاں‌نثار بیٹوں اور بیٹیوں کا تو ذکر ہی کیا کل محنت‌کش نوع انسانی کو، دنیا کے تمام ترقی پسند خیالات کے لوگوں کو بجا طور پر فخر ہے، شان دوبالا کرنے میں آپ کی کامیابی کا دعا گو ہوں۔

۱۹۶۹ء

کے ساتھ اس شاندار تواریخی مسافت کے متعلق سوچنے لگتا ہوں جو ہمارے سوویت گاؤں نے گذشتہ چالیس سال کے عرصے میں کی ہے اور مجھے احساس ہو جاتا ہے کہ ادب اور آرٹ میں اس مسافت کو جرأت کے ساتھ، اس کے شایاں‌شان انداز میں پیش کرنا کتنا ضروری ہے۔

میرا پیشہ‌ورانہ فرض مجبور کرتا ہے کہ ادب کے بارے میں چند الفاظ عرض کروں۔ بات یہ ہے کہ کاشتکاری کی طرح ادب میں بھی اچھی فصل کے سال بھی ہوتے ہیں اور خراب فصل کے بھی، سوکھا بھی پڑتا ہے، آندھیاں بھی آتی ہیں۔ اپنے ہاں کے ضرررساں کیڑوں مکوڑوں کے خلاف آپ کامیابی کے ساتھ جدوجہد کر رہے ہیں مگر ہمارے ہاں، مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب بھی کچھ کولوریڈو مکوڑے موجود ہیں۔ اس قسم کے جو کھاتے تو سوویت روٹی ہیں مگر پھر بھی خدمت اپنے مغربی بورژوا آقاؤں کی انجام دیتے اور اپنی تحریریں چوری چھپے انہیں بھیج دیتے ہیں۔ لیکن آپ کے کھیتوں کی طرح اپنے ادبی چمن کو ہم بھی ہر طرح کے کیڑوں مکوڑوں اور خس و خاشاک سے پاک کرنا چاہتے ہیں اور ضرور کرلیں گے۔

پیداوار کے معاملے میں ہمارے مقاصد ویسے ہی ہیں جیسے آپ کے یعنی اچھی قسم کی چیزیں کافی مقدار میں پیدا کی جائیں۔ ہمیشہ ہی ہمیں کامیابی نصیب نہیں ہوتی لیکن آپ کو بھی تو نہیں ہوتی۔

علاوہ ازیں ہمیں ایسی چیزیں تیار کرنی ہوتی ہیں جو قدروقیمت میں دیرپا ہوں لیکن بدقسمتی سے تمام کتابیں ہی ایسی نہیں ہوتیں جو وقت کی آزمائش پر پوری اتریں۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ گاؤں کی زندگی کے متعلق ہمارے ہاں کچھ اچھی کتابیں تخلیق ہو چکی ہیں اور چونکہ میں کٹر رجائیت‌پسند ہوں اس لئے مجھے پورا یقین ہے کہ ہم‌عصروں کے متعلق نئے بڑے بڑے ناول بھی ضرور لکھے جائیں‌گے۔

ایک چیز اور ہم میں مشترک ہے — وہ پرمسرت فخر جو ہمیں اپنے نوجوانوں پر ہوتا ہے اور وہ امیدیں جو ہم ان سے وابستہ کرتے ہیں۔ نوجوان مصنفوں میں بہت سے ایسے ہیں جن میں حقیقی صلاحیتیں موجود ہیں اور قدرتی بات ہے کہ اہم اور پوری قدر و قیمت کی تصانیف کی ہمیں سب سے پہلے انہیں سے توقع ہے۔

اور آخر میں سچ پوچھئے تو ساتھیو، میرے ہم‌وطنو، اس کانگرس کے ڈیلی گیٹوں میں آپ کو یہاں دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ میں